منزلیں دار کی
ندرت الطاف

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

ندرت الطاف نے اب سے بہت دن پہلے طالب علمی کے دنوں ہی میں علمی، سیاسی اور ادبی حلقوں میں کافی نام پیدا کر لیا تھا۔ زبان بھی بے تکان چلتی تھی قلم بھی۔ اس کے بعد ہفت روزہ لیل و نہار اور شاید بعض اور معتبر جریدوں میں بھی ان کی کچھ نسبتاً زیادہ سنجیدہ اور بالغ تحریریں افسانوں کی صورت میں نظر آئیں تو پڑھنے والے ان سے بہت سی امیدیں باندھنے لگے۔ لیکن پھر یکایک آپ مزید تعلیم کے لئے انگلستان تشریف لے گئیں اور وہاں سے ایسا قرطِ نگاہ کر بیٹھیں کہ صدائے برنخاست۔ آخر کار اب وہ منزلیں دار کی صورت میں پھر برآمد ہوئی ہیں اور ہماری رائے ہے کہ اس کتاب سے ان کی طویل غیر حاضری کی کچھ حقہ تلافی ہو جانی چاہیے۔

اس مجموعے میں ندرت نے میر صاحب کی زبان میں اپنے اور اپنے ہمعصر نوجوانوں کے درد و غم کو جمع کر کے جو دیوان مرتب کیا وہ ہمارے افسانوی ادب میں ایک بالکل نئی ایجاد ہے وہ یوں کہ روایتی افسانوں کا جو ڈھانچہ چلا آ رہا ہے وہ ان کہانیوں سے بالکل میل نہیں کھاتا۔ ان میں کہانی کی کوئی ابتدا ہے نہ وسط نہ آخر، نہ خارجی واقعات کو چاٹ میں پرو دیا گیا ہے۔ نہ کسی کردار کو پورا تاک نقشہ بیان ہوا ہے لیکن اس کے باوجود ایک افسانے کے سبھی ترکیبی عناصر ان میں موجود ہیں لیکن اپنے اپنے آزاد، خود رو اور فطری طریقے سے۔ غالباً ندرت نے انگریزی ادب کے STREAM OF CONSCIOUSNESS اور DRAMATIC MONOLOGUE کو ملا کر اپنا یہ نمونہ ترتیب دیا ہے جس میں بکھری ہوئی ہیئت یا پلاٹ کے جھگڑے سے بے نیاز دار کی مختلف منزلوں کی جانب جو تشنگی، اداسی، نا آسودگی اور شکستِ دل سے عبارت ہیں، مختلف پگڈنڈیوں پر رواں نظر آتے ہیں۔ ان سب کو ملا کر دیکھئے تو گزشتہ بیس تیس برس میں ہماری نوجوان نسل کے ایک طبقے پر کیا گزری اس رنگین اور پُر پیچ KALEIDOSCOPE میں اس کی بہت موثر جھلکیاں نظر آئیں گی۔ اور جو لوگ ابھی منزلوں سے گزر رہے ہیں ان کو غالباً یہی چاہیے گا کہ زورِ طبیعت کو آواز دینا اور جس ظلم، استحصال، دکھ، درد اور افلاس و محرومی کے خلاف ان کے احساس کی کوئی چنگاری موجود تھی، بھڑک اٹھے۔

منزلیں دار کی ایک طرح کی آپ بیتی بھی ہے اور سفرنامہ بھی۔ اس سفرنامے کا جو حصہ انگلستان اور یورپ سے متعلق ہے مجھے اس سے صرف اتنا اختلاف ہے کہ جن لوگوں نے دیارِ فرنگ میں کچھ وقت نہیں گزارا ان کے لئے اس ماحول، اس کی لغت اور اس کے تجربات سے رابطہ پیدا کرنا ذرا مشکل ہے۔ اگرچہ اس حصے میں ایک آدھ ستوان اور درد انگیز کہانی بھی شامل ہے "کوئی پہلو سے اٹھا آخر شب"۔

مختصراً اس کتاب سے ندرت الطاف نے ماضی کا قرض ادا کیا ہے۔ اب حال اور آنے والے دنوں کی منزلیں اپنی تحریر کے لئے ان کے درد مند قلم کا انتظار کریں گی۔

—— فیض احمد فیض

ندرتِ الطاف کا محبوب موضوع وہ ناسٹیلجیا ہے جو زندگی کو بامعنی اور اس سے وابستہ کرداروں کو خوبصورت بناتا ہے۔ ناسٹیلجیا ہمیشہ فرار کا مترادف نہیں ہوتا، بعض صورتوں میں یہ مقدس قدروں اور معتبر روایتوں کا اثبات بھی کرتا ہے اور ندرت کا ناسٹیلجیا بیشتر مثبت ہے۔ اس میں ان دوستوں کی یادیں بھی ہیں جو بچھڑ گئے اور ان منظروں کی بازیافتیں بھی ہیں جو چھن گئے مگر ان دوستوں اور ان منظروں میں جو تشنگیاں ہیں اور جو طلسمی نوعیت کی مقناطیسیت ہے، اس سے ندرت الطاف کی کہانیاں جگمگا بھی رہی ہیں اور مہک بھی رہی ہیں۔

—— احمد ندیم قاسمی

سرورق

TERESA HAYTER

منزلیں دار کی

ندرت الطاف

نام کتاب ——— منزلیں دار کی

بار اوّل ——— ۱۹۸۳ء

تعداد ——— ۱۰۰۰

ناشر ——— روما پبلی کیشنز۔ ۱۴۵۴ طفیل روڈ لاہور چھاؤنی

مطبع ——— شرکت پریس۔ لاہور

طابع ——— منہاج الدین اصلاحی

خوشنویس ——— محمد اسحاق قریشی

قیمت ——— تیس ۳۰ روپے

ملنے کا پتہ ——— فیروز سنز لمیٹڈ لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی

سرورق ——— TERESA HAYTER

امی اور ابا کے نام

مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

میرؔ

فہرست

برہنہ صبح

برآمدے کی سیڑھیوں کے قریب کھڑے سب لوگ آخری مہمان کو رخصت کر رہے تھے۔ بہت اطمینان سے وہ سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

"ہمیں ذرا دیر ہوگئی۔"

"خوب ــــ وقت کی حس بہت تیز ہے جناب کی" ــــ اور اس کی بہن نے بہت غصے سے اُسے گھورا۔

"اور کچھ نہ ہو سکے تو کم سے کم معافی ہی مانگ لینی چاہیئے۔"

تو گویا ابھی معافی مانگنا باقی ہی تھا۔ اس نے تو اپنے خیال میں معافی ہی مانگی تھی۔ لیکن یہ ان لوگوں کو لطف آتا ہے مجھ میں زبردستی کا مجرمانہ احساس پیدا کرتے ہوئے۔

"خدا کے لئے یہ بھیگے ہوئے کپڑے تو اتار دو جا کر۔"

اوہ! تو وہ بارش میں بھیگ بھی گئی ہے۔

گیلری میں سے گزر وہ کھانے کے کمرے میں آگئی۔

محفل کی برہمی کے بعد والی پژمردگی سارے ماحول پر طاری تھی۔ ملازم کھانے کے برتن سمیٹ رہا تھا۔

برتنوں کے ٹکرانے کی آواز — نیپکن کی سرسراہٹ۔ کلاک کی ٹک ٹک — اس شور و غل سے کہیں نجات نہیں۔

دنیا میں ذرا جو سکون ہو۔

اور پھر جب کبھی اس کی امی اور بہن کو زبردستی اس کی جگہ میزبان بننا پڑے۔ ان کا موڈ خراب ہو جاتا ہے۔ اس کی بہن مستقل بڑ بڑائے چلی جا رہی تھی۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔

"خوب — آپ اپنے دوستوں کو بلا کر گھر سے غائب ہو جاتی ہیں اور پھر ذرا جو ندامت ہو۔ میں تو آج تک یہ ہی نہیں سمجھ سکی کہ لوگ تم سے ملتے ہی کیوں ہیں؟"

"عادی ہو گئے ہیں۔"

کتنا خوبصورت دن تھا، کتنی خوبصورت صبح طلوع ہوئی تھی۔ وہ صبح ہی صبح کیسی خوش تھی زندگی اپنی جگہ کیسی مکمل — کیسی بھرپور نظر آئی تھی۔ کیوں نہیں یہ الوژن قائم رہتے۔ کیوں دنیا میں اتنا ہنگامہ برپا ہے۔ کیوں اپنے اندر اتنا خلفشار ہے۔

"میں کہاں جاؤں گی — کیا کروں گی —" اس نے خود سے پوچھا۔

اس نے ڈائننگ روم کے مینٹل کی طرف دیکھا اور اپنے خط اُٹھا لیے کیا میں ان خطوں کو پڑھوں۔ لیکن ان میں کیا ہوگا۔ وہی بے کار باتیں — باتیں — باتیں — مستقل باتیں میں تھک گئی ہوں۔ بے تماشا تھک گئی ہوں، میں باتیں کرتے کرتے تھک گئی ہوں۔ اور باتیں سنتے سنتے تھک گئی ہوں۔

اس لمحے میرے پاس نہ خوشی ہے نہ غم — اور وہ صنم جو میرے دل نے تراشے تھے، فنا ہو گئے ہیں، اور میں جو بہت شدت سے جینے کی قائل ہوں۔ اور جس کے وجود نے زندگی کی تمام خوشیوں کو اور تمام غموں کو اپنے اندر جذب کر لینا چاہا ہے اس لمحے چپ چاپ بیٹھی یہ سوچ رہی ہوں کہ جینا کس قدر دشوار کام ہے — اور یہ کہ — ہماری بہت ہی دیوالیہ روحیں ہیں۔ یہ کس بلا کا دیوالیہ پن ہے کہ اپنے اندر کے کھوکھلے پن سے خوف آتا ہے۔ میں نے اپنی آنکھیں

بند کر لی ہیں ۔ میں اپنے اندر قطعی جھانکنا نہیں چاہتی ۔

یہ کیسی ویرانی ہے ۔ ایک بیکراں سناٹے کا ساخلا ـــــ نہ غم فردا ہے نہ فکر امروز ـــــ

اور وہ کرب جسے میری روح نے ازلی و ابدی سمجھا تھا ۔ وہ بھی میرا ساتھ چھوڑ گیا ہے ۔

ایک لمحہ آیا اور اس نے مجھ سے کہا تم تو ہو ہی نہیں ـــــ تمہارا کبھی کوئی وجود نہیں تھا ۔ قطعی بیکار ۔

اور ابھی صبح ہی اس نے سوچا تھا ۔ کہ ہر چیز اپنی جگہ ٹھیک ہے ۔

اور اتنی حسین صبح طلوع ہوئی تھی ۔

آفتاب کی کرنیں چپکے چپکے دریچے کی راہ سے کمرے میں آ گئی تھیں ۔ اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اپنی آنکھیں ملیں تھیں ۔ اور ٹیبل لیمپ کو بجھا دیا ـــــ اس کی بہت ہی پیاری بہن بہت ہی غصے سے اس کے اینکل شوز اتار رہی تھی ـــــ اچھا تو وہ رات بھر سٹڈی میں سوئی رہی ہے ۔

” رات بھر تم جوتوں سمیت بغیر لباس تبدیل کئے سو گئیں ۔“

اور کیوں نہیں تم آرام سے اپنے بیڈ روم میں جا کر سوتیں ؟“ امی کی پیار بھری ـــــ آواز سنائی دی اور ساتھ ہی انہوں نے ہیٹر اس کے قریب کر دیا ۔ اور اس کا کوٹ اتارنے کی کوشش کی ۔

” ذرا سیٹی کا حشر دیکھو ۔“

اس نے ایک نظر سیٹی کو دیکھا ، اور ایک نظر اپنے گرد بھرے جوتوں کو ـــــ اور ہنس دی دنیا بے تحاشا حسین تھی ۔

” کوئی بہت ہی اچھی بات ہے ـــــ ہے نا ـــــ جس پر آپ اس قدر خوش ہو رہی ہیں“

اس کی بہن بہت ہی پیاری چیز تھی ۔ سوائے اس کے کہ کچھ ڈسپلن وغیرہ کا زیادہ جھگڑا تھا ۔

” لیلی تمہیں کب تمیز آئے گی “ ـــــ مما کی آواز میں اکتاہٹ تھی ۔

اس خیال سے اُسے بڑی مسرت ہوئی ۔ کہ سب لوگ اس کے مستقبل سے مایوس ہیں ۔

” نہ جانے یہ جانور ہمارے ہاں کہاں سے آ گیا ہے ۔“

” خیر اس کی فکر آپ بعد میں فرما لیجئے گا ۔ فی الحال ذرا جا کر جگنو سے کہیے ۔ ایک پیالی کافی کی ادھر آئے ۔

اس نے کافی کی پیالی کو چھوا جگنو کبھی کا کافی رکھ گیا تھا۔ اور وہ حسب معمول کبھی کی سرد ہو چکی تھی۔

میری بہن سچ ہی تو کہتی ہے۔ میں بالکل جانور ہوں ـــــ لیکن بہت ہی پیاری صبح ہے اور آج اتوار ہے۔ میں بہت اطمینان سے اخبار پڑھوں گی۔ جب تک جی چاہے گا سوؤں گی ـــــ اور باہر کی دنیا سے قطعی کوئی واسطہ نہیں رکھوں گی۔ کوئی ملنے کے لئے آئے گا تو اپنے دریچے سے سر نکال کر جھانکوں گی۔ اور بہت اطمینان سے کہوں گی ـــــ "آج کے دن ملاقات نہیں ہو سکتی۔ آج ہم گھر پہ نہیں ہیں۔"

ـــــ کوئی ٹیلیفون پہ بات کرنا چاہے گا۔ تو اپنی سوئی سوئی آواز میں کہوں گی ـــــ "دیکھئے میں آج گھر پہ نہیں ہوں"

"اپنے درزی کا بل دے دیا تم نے ؟"

اُفوہ امی جان ـــــ صبح ہی صبح قرض خواہوں کا تذکرہ ـــــ کمبخت بجٹ کسی طرح ٹھیک نہیں ہوتا تھا۔ بس اگر ایک دفعہ متوازن ہو جائے۔ تو میں ایسے سلیقے سے چلاؤں کہ آپ سب انگشت بدنداں رہ جائیں۔

ـــــ میں ایک اور پراڈیگل سن (PRODIGAL SON) ہوں۔ اس نے دلی مسرت سے سوچا۔ اور اب امی ان پیسوں کے بارے میں پوچھیں گی۔ جو میں نے خاص طور سے یہ کہہ کر لئے تھے کہ درزی کا بل دینا ہے۔ ظاہر ہے کہ میری نیت یہی تھی لیکن کیا کیا جائے۔

"آپ لوگ نیت دیکھا کیجئے۔"

"نیت دیکھ کر کیا کریں۔ جب کہ مستقل تمہارے قرض خواہوں کے بل چلے آتے ہیں۔ تمہارے ابا نے وہ بل ادا کر دیا ہے۔"

"ابا گریٹ آدمی ہیں" ـــــ اس نے کہا۔

"جی ـــــ لیکن وہ کہہ رہے تھے۔ آج وہ ناشتے پر تمہیں ضرور ڈانٹیں گے۔ کہہ رہے تھے تم بہت غیر ذمہ دار ہو" ـــــ اس کی بہن اس پر ڈانٹ پڑنے کے خیال سے بہت محظوظ ہوتی تھی۔

"آج اتوار ہے۔ ہم ناشتہ بستر میں کریں گے۔ کھانے کے کمرے میں جائیں گے ہی نہیں"۔
میں ان سے کہوں گی کہ وہ تمہارے کمرے میں آن کر تمہیں ڈانٹیں"—— "خیر دیکھا جائے گا"۔
ابا واقعی کچھ دیر بعد آ گئے۔ بڑے اہتمام سے اس نے براسو اٹھا کر ایک کپ چمکانا شروع کر دیا۔

"کیا کر رہی ہو؟"
"کچھ نہیں ابا۔ یہ کپ ذرا میلے ہو گئے تھے۔ پالش کر رہی ہوں"
"تم سے ایک بات کرنا چاہتا تھا۔"
"تشریف رکھئے——" اور وہ اسی انہماک سے کپ کو بقول اپنے چمکاتی رہی۔
ابا کچھ دیر تک ایک کتاب کے ورق اُلٹتے رہے۔ اور پھر چپ چاپ اپنے بیڈ روم کی طرف واپس چلے گئے۔

خوب تو میرا حساب ٹھیک تھا —— ارے میں ابا کی ڈانٹنے کی صلاحیت سے واقف ہوں۔
ابا ڈانٹ پٹ کر سکتے تو آج کو بھلے دن نہ ہوتے ——

وہ دلی اطمینان سے ہنسی ——

سویٹ گریٹ آدمی —— ایک دم سویٹ ——
اس نے دریچے میں سے جھانکا۔ سب لوگ لان میں بیٹھے تھے۔ امی حسب عادت مالیوں کو ہدایات دے رہی تھیں، اور ساتھ ہی خود بھی کام کر رہی تھیں،
مما کبھی قرار سے نہیں بیٹھ سکتیں —— وہ مسکرائی تھی۔
اور اس کا بھائی صلو وشکا کو کچھ کھلا رہا تھا (وشکا ان کا پالتو ہرن تھا) صلو سب سے بہت زیادہ پیار کرنے کا عادی تھا یہاں تک کہ جانوروں سے بھی——
اسے بہت بچپن کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ جب وہ ایک بار مری گئے تھے۔ اور ہاتو مزدوری لینے کے بعد بھی مانگے چلے جا رہے تھے۔ تو اس نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا تھا کہ ان کو اور پیسے دیے جائیں ——

صلو بھی گریٹ آدمی ہے ـــــ اس نے سوچا ـــــ

لیکن واقعہ شاید یہ ہے کہ آج میرا خیر سگالی کا جذبہ بہت زوروں پر ہے۔

ابھی صبح ہی اس نے سوچا تھا کہ یہ دنیا اپنی جگہ اتنی مکمل ـــــ اتنی خوبصورت تھی ـــــ اور اس نے اطمینان سے اخبار پڑھنا چاہا تھا۔ اور پڑھتے پڑھتے ایک خبر پر آن کر وہ رک گئی تھی۔

:::::::::

اور وہ جو حال کے زنداں میں تیار تھی۔ اس کے لئے یہ ساری دنیا پس منظر میں چلی گئی تھی۔ ماضی اور حال کے درمیان جو اتنا طویل وقفہ تھا۔ وہاں آناً فاناً ایک پل تعمیر ہو گیا تھا۔

وہ جیتے جاگتے دن ذہن میں سانس لینے لگے تھے ـــــ

دن بھر وہ واہی تباہی گھومتی رہی تھی۔

کھانے کے کمرے کا کلاک برابر دھڑکے چلا جا رہا تھا۔

وہ سب لوگ ان دنوں کس قدر خوش رہتے تھے۔ کیسی یگانگت تھی اور کیسی رفاقت ـــــ اور کتنے اچھے اچھے لوگ تھے۔ لوگ جو آپس میں پیار کرتے تھے جنکے پیار ایک کے سوا اور کوئی شرط نہیں منواتے تھے۔ لوگ جو خوشیوں کی مساوی تقسیم چاہتے تھے۔

الیکشن قریب تھا۔ اور کارکن گاؤں گاؤں قریہ قریہ گھومتے تھے اور جب وہ سب ہمت ہار دیتے تھے۔ جب وہ تھک جاتے تھے۔ اور تھک کر آپس میں لڑنا شروع کر دیتے تھے۔

پنوں خاں بڑے اعتماد سے کھڑا ہو جاتا اور بولنا شروع کر دیتا تھا۔

پنوں خاں جس نے نہ فلسفہ پڑھا تھا۔ اور نہ سیاسیات ـــــ جو کبھی تفریحاً بھی کسی یونیورسٹی میں نہیں گیا تھا۔ اس نے تو مکتب تک کی شکل نہیں دیکھی تھی۔

"کھانا کھایئے گا چھوٹی بی بی؟" ـــــ جگنو اس کے قریب آن کر پوچھ رہا تھا۔

"نہیں"

"تو کافی لاؤں؟" "نہیں"

"چھوٹی بی بی ـــــ بیگم صاحب سے مجھے دس روز کی چھٹی لے دیجئے۔" جگنو گھر کا ملازم تھا۔ لیکن اپنے آپ کو صرف اس کا ملازم سمجھتا تھا۔ اور اپنی سب شکائتیں اس سے کرنے کا عادی تھا۔ کس نے اُسے بیکار ڈانٹا ـــــ اور کون اس کے ساتھ زیادتی کرتا ہے ـــــ اور کب اُسے چھٹی چاہیئے۔

"صرف تساں دی وجاں نال میں ایتھے رہنا آں چھوٹی بی بی ـــــ تساں بڑے چنگے او۔ کدیں نئی ڈانٹتے او"

"اچھا ـــــ صبح ـــــ ناشتے کے بعد یاد دلانا۔ اور اب تم بھاگ جاؤ ـــــ"

وہ کوئی نیا دکھڑا شروع کرنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ جو اتنے پیار سے زندگی کے بارے میں سب کی شکائتیں سننے کی عادی تھی۔ امّی سے لے کر جگنو تک ـــ اس وقت اس موڈ میں نہیں تھی۔ اس نے خیالات کا سلسلہ پھر جوڑنا چاہا۔

پنوں خاں۔ جس کا عزم اور ولولہ کبھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتا تھا۔ بہت دفعہ ایسا ہوتا۔ کہ کسی گاؤں میں نمبردار کے خریدے ہوئے آدمی انھیں گالیاں دیتے تو پنوں خاں بلند آواز سے پنجابی کا کوئی گیت شروع کر دیتا۔ اور لوگ جمع ہو جاتے۔ جانے وہ کہاں سے آجاتے ـــــ وہ حیرت سے آنکھیں ملتی۔ نیکی کے فرشتے تو آج کل آسمانوں سے مدد کے لئے نہیں اترتے ـــــ اور ان کا جلسہ کامیاب ہو جاتا۔

ٹیلیفون کی گھنٹی برابر بجے چلی جا رہی تھی۔ نہیں۔ وہ کوئی ٹیلیفون نہیں سنے گی۔ کسی سے بات نہیں کرے گی ـــــ وہ پنوں خاں کے بارے میں سوچنا چاہتی ہے ـــــ پنوں خاں جو اتنا غلیظ تھا کہ مہینہ مہینہ بھر نہیں نہاتا تھا لیکن جس کا دل موتی کی آب رکھتا تھا۔

ٹک ـــــ ٹک ـــــ ٹک ـــــ۔

باہر اس کے دروازے پر دستک ہوئی۔

ایک لمحہ کو وہ چونکی۔

ٹک ـــــ ٹک ـــــ ٹک

باہر رم جھم رم جھم بارش ہو رہی تھی۔

اس نے اپنی سٹڈی کا دروازہ کھولا۔ ایک لمحہ کو وہ ٹھٹک گئی۔ اس کے پاس نہ اوور کوٹ تھا اور نہ رین کوٹ —— اور اس کے سوٹ پہ بارش کے قطرے چمک رہے تھے۔

"یہ شریفانہ وقت تو نہیں ہے۔ لیکن خیر —— اب تم آ گئے ہو تو آ جاؤ۔"

وہ چپ چاپ ایک لفظ کہے بغیر اندر چلا آیا۔

"تم کہاں تھیں اتنی دیر سے ؟"

"کھانے کے کمرے میں۔"

"نہ جانے کب سے دستک دے رہا ہوں۔"

"گھنٹی کیوں نہ بجا دی ؟"

وہ سیٹی پہ بیٹھ گیا۔ اور اس نے ہیٹر کا سوئچ آن کر دیا۔

"کافی پلائیں تمہیں ؟"

وہ اتنا پیارا —— اتنا اچھا آدمی —— اتنی دور سے چل کر آیا تھا —— جبکہ باہر طوفان برپا تھا —— اور وہ بالکل بھیگ چکا تھا۔

"میں گھر سے بھاگ آیا ہوں۔"

ہوں —— گویا یہ کوئی بہت ہی نارمل سی خبر تھی۔

"میں نے کہا —— میں گھر سے بھاگ آیا ہوں" —— اس نے خفگی سے کہا۔

"سن لیا میں نے۔" اس نے ملائمت سے کہا۔

"لیکن بھاگنے کے لئے ذرا موزوں وقت چنا ہوتا۔ یہ تو تم جانتے ہو۔ کچھ ایسا مناسب وقت نہیں۔ خواہ مخواہ کی زحمت —— صبح کو بھی بھاگا جا سکتا تھا۔ اور یہ اس پردے نے کیا خطا کی ہے؟" —— وہ مستقل آتشیں رنگ کے پردے کو بل دیے چلا جا رہا تھا۔

اس نے (DANCING DOLL) کو اٹھا کر چابی بھر کر زمین پہ چھوڑ دیا۔

"یہ تو نیا ایڈیشن معلوم ہوتا ہے ؟"

"ہاں ــــ ابا نے کچھ دن ہوئے خرید کر دی ہے ۔"

"ذرا یہ ہیٹر کا پلگ لگا کر کیتلی رکھ دو ۔"

سب دوست بے تحاشا نفیس آدمی تھے کہ کام وام کرنے میں کوئی عار نہ سمجھتے تھے ۔

"اور اب ذرا پیالیوں میں کافی ڈال کر پانی انڈیل دو ۔"

وہ بڑے اہتمام سے کیتلی کی ٹونٹی میں سے نکلتی ہوئی بھاپ کو دیکھ رہا تھا ۔

"تم نے پوچھا نہیں ۔ میں گھر سے کیوں بھاگا ؟"

"کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی ۔"

"ارے تم بہت مکار ہو ۔ میں خوب سمجھتا ہوں تمہیں ــــ"

وہ اداس ہو گیا تھا ۔

"چلو ــــ اب بتا دو ۔"

وہ کمرے میں ٹہل رہا تھا ۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ شیلف کے قریب آن کر رکا ۔ (وہ ڈر رہی کہ اب یہ کوئی کتاب اٹھا کر نہ لے جائے ۔ لوگ کتابیں لے جاتے ۔ اور لوٹانے کی کوئی ضرورت محسوس نہ کرتے تھے ۔)

"آج میری منگنی ہو رہی تھی" ــــ وہ بہت سیدھے سبھاؤ بات کر رہا تھا ۔

"خوب"

"اور میں صفا بھاگ نکلا ــــ اس کے چہرے پر فاتحانہ مسرت تھی ۔ لیکن میں کیا کروں گا کیا کروں گا ــــ ؟" ایک لمحہ پہلے کی فاتحانہ چمک اس کے چہرے سے غائب ہو گئی تھی ۔

"کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ۔"

"تمہیں نہیں معلوم ــــ کسی کو نہیں معلوم ــــ کتنی مجبوریاں ہیں ، میں ــــ میں ــــ مجھ پہ کتنی مصیبتیں ہیں ۔ میں کیسے انکار کر دوں ؟"

" تو پھر کر لو۔"

وہ ایک دم بہت اداس ہو گیا۔ اور چپ سیٹی پر اس کے قریب بیٹھ گیا۔

" تم کبھی نہیں سمجھو گی۔ کبھی نہیں سمجھ سکو گی۔ تم نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی۔ تم کر ہی نہیں سکتیں۔ محبت کرنا۔ فنا ہو جانا تمہاری فطرت میں نہیں ہے۔ خداوندا میں کیا کروں گا۔ وہ اس کے شانے پر سر رکھ کر رونے لگا اس نے بڑے ہی پیار سے اس کے آنسو پونچھے۔

" چپ ہو جاؤ۔ ایسی باتیں نہ کہو۔"

" میں سچ کہتا ہوں۔ میں تمہیں خوب سمجھتا ہوں۔ جو شخص اتنے لوگوں سے محبت کرے۔ وہ کسی سے محبت نہیں کرتا۔"

بیکار باتیں ہیں۔ اصل بات صرف اتنی ہے کہ یہ MONOPALIZATI ON کا زمانہ نہیں ہے۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی گوتم بدھ کے مجسمے کے قریب آگئی " میں تمہارے قریب آئی ہوں گوتما بدھا۔ اور تم سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں۔ کہ تم لوگوں سے اتنا پیار کرتے تھے۔ تو کیا اس سے سارا پیار بٹ جاتا تھا۔ کیا کسی سمے تمہیں یہ بھی محسوس ہوا تھا۔ کہ تمہارے من میں پیار کا جو سوتا ہے وہ خشک پڑ گیا ہے۔ اگر ایسا نہیں تھا گوتما بدھا۔ اور مجھے یقین ہے کہ ایسا نہیں تھا۔ تو پھر آج کے دن لوگ کیوں نہیں اس بات کو مانتے۔"

وہ اس پیارے انسان کے قریب آن کر بیٹھ گئی۔ جس سے وہ اتنا ڈھیروں پیار کرتی تھی۔

" سنو عارف حسن۔ ہماری بہت سی باتیں یکساں ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہم دو مختلف دنیاؤں کے نمائندے ہیں۔ تم شاید میری زبان نہ سمجھ سکو۔ کیونکہ تم نے اس نئی دنیا کی جھلک تک نہیں دیکھی جس کے خاکے میں ہم بہروں بیٹھے رنگ بھرتے رہے ہیں۔ اور تم ان باتوں کو نہیں مانتے جن پر ہمارا ایمان ہے۔"

" تو میں ان پر ایمان لے آتا ہوں۔"

وہ پردے کی چنٹیں ٹھیک کرتے کرتے بہت زور سے ہنسی۔ گویا یہ ایسی آسان بات ہے جیسے کوئی بیاہ کے وقت مذہب تبدیل کرے۔

"نہیں۔ میری جان۔ یوں پل بھر میں ایمان نہیں لایا جاتا۔ اک عمر عزیز چاہیئے۔"

"تو چلو نہ سہی۔ کیا فرق پڑتا ہے۔"

"پھر بنیادی مسائل تک کے بارے میں اختلاف رہتا ہے۔"

"نہیں۔ میں تمہاری رائے کو درست سمجھوں گا۔ جو تم کہوگی۔ کہوں گا۔ ٹھیک ہے۔—"

وہ ایسی سنجیدگی۔ ایسی معصومیت سے یہ سب باتیں کہہ رہا تھا۔

"ہے نا—" اور اس نے اپنے مضبوط ہاتھ میں اس کا ننا سا ہاتھ تھام لیا۔

"عارف حسن۔ زندگی میں اس مسئلہ کا ایسا سیدھا سادا حل نہیں ہے۔ اور ویسے تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ میں جذبے کی شدت سے واقف نہیں۔ ہم سب اس سے آشنا ہوتے ہیں۔ دل ہم سب کا دھڑکتا ہے۔ لیکن فرق صرف ایک ہے۔ کچھ لوگ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ دل کی دھڑکن کو قطعی یہ حق نہیں پہونچتا۔ کہ وہ فرائض میں مخل ہو۔ محبت وجبت کا چکر بس اسی حد تک ٹھیک ہے جب تک وہ زندگی کے توازن اور تربیت کو درہم برہم نہ کرے"— کافی سرد پڑ گئی تھی۔ لیکن وہ آہستہ آہستہ بولے چلی جا رہی تھی۔ "دیکھو نا— عشق کو صرف سائڈ بزنس ہونا چاہیئے۔ ورنہ کوئی فرد اس قابل نہیں ہوتا۔ کہ اس کے لئے زندگی درہم برہم کر دی جائے۔ زندگی سی قیمتی چیز صرف انسانیت کا حق ہے۔ کسی کا حق غصب کرنا ہمیں زیب نہیں دیتا۔"

"میں اسوقت۔ فلسفے کی زبان میں گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔"

"یہ تو عین حقیقت کی زبان ہے۔ ہمیں بھی بہت سی چیزوں سے پیار ہوتا ہے۔ اتنا ہی پیار جتنا دوسروں کو— شاید زیادہ ہی ہوتا ہو۔ کیوں کہ ہم زیادہ حساس لوگ ہوتے ہیں۔ لیکن ہم زندگی کی ان ساری خوشیوں کو تیاگ دیتے ہیں۔ یہ نہ سمجھنا کہ ہم رہبانیت کو مانتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے پرسکون گھروں میں زندگی بتا دینا ہمیں بھی بہت پسند ہے۔ لیکن ہم صرف اپنے اپنے گھروں کیلئے

جدوجہد کرنے کو تیار نہیں۔ اس لئے کہ اس سے بھی اہم جدوجہد سامنے ہے۔ یہ بھی نہ سمجھنا کہ یہ ایثار وغیرہ کا چکر ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کرنا تو ہر انسان کا فرض ہے۔ یہ کسی پر احسان نہیں۔"

وہ چُپ چاپ بیٹھا اس کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ اچانک خاموش ہو گئی۔

یہ شخص اس قدر اُداس ہو کر میلوں اُدھر سے میرے پاس آیا ہے۔ اور میں اِسے کیا بور کر رہی ہوں۔ یہ ہر سمت سے مایوس ہو کر آیا ہے اگر میں اسے ذرا سی بھی خوشی دے سکوں۔ لیکن کہاں سے دوں۔ آج تو میں خود اس قدر اُداس ہوں۔

اُس نے کشن پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ وہ کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگی۔ اس کے پیر کی ٹھوکر سے پیالی دری پر اوندھ گئی۔ اُس نے برتن سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیے۔

"تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں نا ـــــ" وہ بہت غمگین تھا۔

"بہت کرتی ہوں۔"

"کہہ دو نہیں کرتیں۔ مجھے قرار آجائے گا۔"

میں اس شخص کو کیسے یقین دلاؤں کہ میرے دل میں اس کے لئے کتنی محبت ہے۔ کتنا پیار ہے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"کل زریں ملی تھی۔" ـــــ وہ اچانک بولا۔

"اچھا ـــــ پھر کیا باتیں ہوئیں ـــــ؟"

"کہہ رہی تھی ـــــ" وہ ایک دم بھڑک اُٹھا۔ "تم ـــــ تم تو کسی سے جلتی تک نہیں۔ میں تمہیں سڑک پر جاتے دیکھوں اور یونہی کوئی راہگیر تمہارے قریب چلنے لگے۔ تو جل کر خاک ہو جاتا ہوں اور میں کسی سے ملوں۔ کتنی ہی باتیں کر دوں۔ تم پہ اثر تک نہیں ہوتا۔ خدا کے لئے تمہارے پاس دل ہے یا پتھر!"

"جلنا ولنا تو بہت غلط بات ہے۔ کوئی ضرورت نہیں ہوتی جلنے کی۔"

" تمہارا کیا ہے۔ تمہارے خیال میں تو آدمی ایک لڑکی سے عشق کر سکتا ہے۔ دوسری سے دوستی رکھ سکتا ہے اور تیسری سے فلرٹ کر سکتا ہے۔ ہے نا؟" —— وہ بہت غصے میں تھا۔

" میں ضرور پاگل ہو جاؤں گا۔ میں مر بھی نہیں جاتا۔"

" ہشت زندگی بہت پیاری چیز ہے۔"

" اپنے سارے دکھوں سمیت بھی۔"

" اپنے سارے دکھوں سمیت ہی!"

" چلو خودکشی کر لیں" —— وہ بہت سنجیدگی سے مشورہ دے رہا تھا۔

" پارٹنر! میرا تو ابھی مرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔"

" نہیں تمہیں میرے ساتھ ہی مرنا ہوگا۔ ریل گاڑی کے نیچے آن کر —— چلو اٹھو۔ اسٹیشن چلیں"

وہ سر کھجاتی ہوئی جوتے پہننے چلی گئی اور بہت اطمینان سے پندرہ بیس منٹ میں اینکل شوز پہن کر آئی اور سگریٹ کا ڈبہ بڑھایا۔

" لو پارٹنر! تم سگریٹ پیو" اور اس نے بڑے اسٹائل سے اس کا سگریٹ سلگایا۔" کیا یاد کرو گے کسی رئیس سے پالا پڑا تھا"

یہ شخص خوشی کی تلاش میں اتنی دور سے چل کر میرے پاس آیا تھا۔ اور میں اس سے بے تکی گفتگو کر رہی ہوں۔

لیکن یہ سوچنے کے باوجود وہ بولے بغیر نہ رہ سکی۔

" ہمارا ایک ساتھی تھا۔ پنوں خاں —— جب اس کے پاس پیسے ختم ہو جاتے۔ تو ہم سے سوا چار آنے اُدھار لیا کرتا تھا۔ بگلے کے پیکٹ کیلئے —— اور ان اُدھار کے پیسوں سے خریدے ہوئے سگریٹوں کے بارے میں بھی بہت فیاضی برتتا تھا۔ اس کے برعکس ایسے لوگ بھی تھے۔ جو بلیک اینڈ وائٹ پاکر وں اُسے پیتے تھے کہ کوئی کیسی ہی خوشامد کرے۔ ایک سگریٹ اُدھا تک نہ دیتے تھے۔ بہانہ یہ تھا کہ کوئی اور برانڈ وہ پیتے نہیں۔"

جدوجہد کرنے کو تیار نہیں۔ اس لئے کہ اس سے بھی اہم جدوجہد سامنے ہے۔ یہ بھی نہ سمجھنا کہ یہ ایثار وغیرہ کا چکر ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کرنا تو ہر انسان کا فرض ہے۔ یہ کسی پر احسان نہیں۔"

وہ چُپ چاپ بیٹھا اس کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ اچانک خاموش ہو گئی۔

یہ شخص اس قدر اُداس ہو کہ میلوں اُدھر سے میرے پاس آیا ہے۔ اور میں اسے کیا بور کر رہی ہوں۔ یہ ہر سمت سے مایوس ہو کہ آیا ہے اگر میں اسے ذرا سی بھی خوشی دے سکوں۔ لیکن کہاں سے دوں۔ آج تو میں خود اس قدر اُداس ہوں۔

اُس نے کشن پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ وہ کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگی۔ اس کے پیر کی ٹھوکر سے پیالی دری پر اوندھ گئی۔ اُس نے برتن سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیے۔

"تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں نا ——" وہ بہت غمگین تھا۔

"بہت کرتی ہوں۔"

"کہہ دو نہیں کرتیں۔ مجھے قرار آجائے گا۔"

میں اس شخص کو کیسے یقین دلاؤں کہ میرے دل میں اس کے لئے کتنی محبت ہے۔ کتنا پیار ہے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"کل زریں ملی تھی۔" —— وہ اچانک بولا۔

"اچھا —— پھر کیا باتیں ہوئیں ——؟"

"کہہ رہی تھی ——" وہ ایک دم بھڑک اُٹھا۔ "تم —— تم تو کسی سے جلتی تک نہیں۔ میں تمہیں سڑک پر جاتے دیکھوں اور یونہی کوئی راہگیر تمہارے قریب چلنے لگے۔ تو جل کر خاک ہو جاتا ہوں اور میں کسی سے ملوں۔ کتنی ہی باتیں کروں۔ تم پر اثر تک نہیں ہوتا۔ خدا کے لئے تمہارے پاس دل ہے یا پتھر!"

"جلنا ولنا تو بہت غلط بات ہے۔ کوئی ضرورت نہیں ہوتی جلنے کی۔"

"تمہارا کیا ہے۔ تمہارے خیال میں تو آدمی ایک لڑکی سے عشق کر سکتا ہے۔ دوسری سے دوستی رکھ سکتا ہے اور تیسری سے فلرٹ کر سکتا ہے۔ ہے نا؟" —— وہ بہت غصے میں تھا۔

"میں ضرور پاگل ہو جاؤں گا۔ میں مر بھی نہیں جاتا۔"

"ہشت زندگی بہت پیاری چیز ہے۔"

"اپنے سارے دکھوں سمیت بھی۔"

"اپنے سارے دکھوں سمیت ہی!"

"چلو خودکشی کر لیں۔" —— وہ بہت سنجیدگی سے مشورہ دے رہا تھا۔

"پارٹنر! میرا تو ابھی مرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔"

"نہیں تمہیں میرے ساتھ ہی مرنا ہو گا۔ ریل گاڑی کے نیچے آن کر —— چلو اٹھو، اسٹیشن چلیں"

وہ سر کھجاتی ہوئی جوتے پہننے چلی گئی اور بہت اطمینان سے پندرہ بیس منٹ میں اینکل شوز پہن کر آئی اور سگریٹ کا ڈبہ بڑھایا۔

"لو پارٹنر! تم سگریٹ پیو۔" اور اس نے بڑے اسٹائل سے اس کا سگریٹ سلگایا۔ "کیا یاد کرو گے کس رئیس سے پالا پڑا تھا۔"

یہ شخص خوشی کی تلاش میں اتنی دور سے چل کر میرے پاس آیا تھا۔ اور میں اس سے بے ہنگم گفتگو کر رہی ہوں۔

لیکن یہ سوچنے کے باوجود وہ بولے بغیر نہ رہ سکی۔

"ہمارا ایک ساتھی تھا۔ پنوں خان —— جب اس کے پاس پیسے ختم ہو جاتے۔ تو ہم سے سوا چار آنے اُدھار لیا کرتا تھا۔ بگلے کے پیکٹ کیلئے —— اور اُن اُدھار کے پیسوں سے خریدے ہوئے سگریٹوں کے بارے میں بھی بے نیازی برتتا تھا۔ اس کے برعکس ایسے لوگ بھی تھے۔ جو بلیک اینڈ وائٹ پا کر یوں اُسے پیتے تھے کہ کوئی کیسی ہی خوشامد کرے۔ ایک سگریٹ اُدھا تک نہ دیتے تھے۔ بہانہ یہ تھا کہ کوئی اور برانڈ وہ پیتے نہیں۔"

وہ ہنسنے لگا: "اچھا تو تمہارا دوست تھا پنوں خاں۔ کیسا تھا؟"

اس نے کشن میں منہ چھپا لیا۔

عارف حسن تمہیں اس سے جلنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ ڈریم بوائے نہیں تھا اور نہ ہی اس میں کوئی گلیمر تھا۔ وہ تو سیدھا سادھا کسان تھا ـــــ اور اپنی دو ایکڑ زمین پر اتنی محنت کرتا تھا کہ ڈھائی تین ہزار سالانہ کی آمدن ہوتی اس کی۔ جب وہ ہمارے ساتھ آیا تو اپنی محنت ساتھ لایا۔ اس نے ایسی ہی محنت کی۔ جیسی وہ اپنی زمین پر کرتا تھا۔ اُسے معلوم تھا۔ وہ کبھی لیڈر نہیں بنے گا عمر بھر ورکر ہی رہے گا۔ لیکن وہ محنت کش تھا۔

اور وہ ایسا مخلص ـــ ایسا فیاض تھا۔ کہ جیسے اشرف المخلوقات کی اصطلاح اسی کے لئے ہو اور ہم صرف حشرات الارض ہوں۔

ہمارا طبقہ کیسا ذلیل ہے۔ ہم میں ملکیت کا کتنا جذبہ ہے اپنی چیزوں پر ـــ اپنے کمروں پر ـــ اور اپنے دلوں تک پر قفل ڈالے رہتے ہیں۔ وہ ہر ایک سے پیار کرتا تھا۔ ہر ایک کی مدد کرنے کو تیار رہتا تھا۔ ایک بار کسی کو روپے کی ضرورت پڑ گئی۔ پنوں خاں کے پاس صرف دو ایکڑ زمین تھی اور اس زمین سے اُسے بڑا پیار تھا۔ لیکن اس نے وہ زمین بیچ کر اسے روپیہ دے دیا۔

اور اس روپے کا کبھی تقاضا نہ کیا۔ اس کے بعد وہ کسی مہاجر الاٹی سے زمین بٹائی پر لے کر کاشت کرتا رہا۔

"مجھے پنوں خاں کے بارے میں کچھ بتاؤ۔" ـــــ وہ اس کی طرف جھک کر بولا۔

میں شاید اس سے انصاف نہ کر سکوں۔ وہ ہمارے متوسط طبقے کا آدمی نہ تھا۔ وہ بہت اونچا آدمی تھا۔ پنوں خاں ـــــ ہمارا ساتھی ـــــ ہمارا رفیق۔

یہ وہ شخص تھا۔ جو اس وقت بھی چپکے چپکے کام کرتا رہا۔ جب وطن عزیز میں تشدد عروج پر تھا، جب ذرا سے شبہ پر انسانوں کو جیلوں میں ٹھونس دیا جاتا تھا اور نہ داد تھی نہ فریاد ـــــ ہم میں سے لوگ تھے، جنہوں نے زندگی سے سمجھوتے کر لئے ـــــ اپنی لگن کو دفن کر دیا ـــــ

کسی کا خیال تھا۔ کچھ عرصہ تک روزگار لگا رہے۔ تو چار جوڑے کپڑے بنوالوں۔ گھر میں بجلی کا پنکھا وغیرہ لگ جائے چند ایک نے سوچا۔ بیوی بچوں کے ساتھ اب تک بہت زیادتی کی ہے۔ محنت کر کے کچھ کمالوں۔ ان کے حوالے کردں۔ اور دو تین برس بعد کچھ کام کروں گا۔

وہ چپ چاپ بیٹھی یہ سب کچھ سوچتی رہی۔ اور پھر اُس نے دیکھا۔ وہ اونگھ رہا تھا۔

"میرا خیال ہے۔ اب تم اچھے بچوں کی طرح گھر چلے جاؤ۔ اور جاکر سو جاؤ۔"

"نہیں ـــ میں ابھی نہیں جاؤں گا ـــ" اس نے ضد کی ـــ "مجھے پنوں خاں کے بارے میں بتاؤ۔"

"پنوں خاں ـــ پنوں خاں ـــ گریٹ آدمی تھا۔"

"تم پوچھوگے مجھے وہ یاد کیسے آیا ـــ" وہ زہریلی ہنسی ہنس دی۔

"آج میں اخبار پڑھ رہی تھی۔ تو آخری صفحہ پہ ایک مختصر سی نظر نہ آسکنے والی خبر اچانک نظر آگئی۔ معلوم ہے وہ کیا خبر تھی۔؟

ـــ پنوں خاں خطرناک غنڈہ قرار دے دیا گیا ـــ یہ میری اور تمہاری حکومت نے انصاف کیا ہے ـــ اور میں سوچ رہی ہوں۔" ـــ اُس نے سر کو جھٹکا ـــ "معلوم نہیں کیا سوچ رہی ہوں۔ شاید یہ ـــ کہ کیوں کر لمحے برسوں کے فاصلے پر پل تعمیر کر دیتے ہیں۔"

وہ اور بھی اداس ہو کر اُسے تکتا رہا۔ "تو اسی لئے آج تم اداس ہو۔ اچھا اب ہنس دو۔"

وہ زبردستی مسکرایا ـــ "تاکہ میں اطمینان سے جاسکوں۔" دوسرے لمحے وہ چلا گیا۔

اس نے دریچے میں سے جھانکا۔ دُور تک شب کی سیاہی تھی۔ لیکن ہر شب کی سحر ہے اور پھر سوچیٹی ـــ کسی دن کوئی نیا گورکی جب کوئی نئی کتاب لکھے گا، تو پنوں خاں کو اپنا ہیرو بنائے گا ـــ گو آج کے اخبار میں اسے کوئی سرخی نصیب نہ ہوئی۔

لیکن اس برہن صبح میرا دل دھڑک دھڑک کر ایک بات پوچھنا چاہ رہا ہے۔ وہ جو کمتر مجنوں کی پکار پر دامن جھٹک کر اپنی عظمتوں کے مقتل میں چلے گئے تھے۔ کیا کبھی لوٹیں گے؟؟؟

شفق کی راکھ

میرے سامنے میری اپنی نئی نئی زندگی ہے اور نئی دنیا کے دلآویز خاکے ہیں۔ اور غیر معین مستقبل ہے۔ اور غیر متعین راستے ہیں اور پہنائی کون و مکاں ہے۔

ابھی چند دن گزرے میں نے ہائی کورٹ کی پُرشکوہ عمارت کے بارے میں سوچا تھا۔ وہاں کتنا امن تھا۔ اور کتنا سکون ——— مطمئن چہروں والے وکیل سیاہ لبادے پہنے سبک روی سے گیلریوں میں آتے جاتے اور میزانِ عدل ہاتھ میں لئے چند شخصیتیں ڈائس پر بیٹھی رہتیں ——— یہاں عظمتیں تھیں ——— وقار تھا ——— اور گمبھیرتا تھی۔

اور میں نے سوچا تھا۔ سیاہ لبادہ پہن کر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی میں ان گیلریوں کو عبور کرکے اس ایوان عدالت میں پہنچوں گی۔ اور اپنے چہرے پر بلا کی سنجیدگی طاری کرکے کہوں گی۔ "می لارڈ" ——— اور جب کوئی ہاتھ میزانِ عدل کو ہاتھ میں لئے سوچ میں پڑ جائے گا۔ میرا چھوٹا سا ہاتھ آگے بڑھ کر راہ سجھائے گا۔ اور میں اپنی مسکراہٹوں سمیت لوٹ آؤں گی۔

اور آج یہاں بیٹھی میں یہ سوچ رہی ہوں کہ جب میں نے یہ سب کچھ سوچا تھا۔ تو میری حالت اس بچی سے چنداں بہتر نہ تھی۔ جس نے آج سے برسہا برس پہلے دنیا کی چند بڑی شخصیتوں کے

نام کے آگے قانون کی ڈگری دیکھ کر فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ضرور قانون پڑھے گی۔

اور اب یہاں نہ میں ہوں۔ نہ کوئی اور ہے۔ یہاں ازلی و ابدی غم ہیں ـــــ ازلی و ابدی حسرتیں ہیں۔ اور ازلی و ابدی کمینگی ہے۔

تو میں جو امن اور آشتی کی تلاش میں نکلی تھی۔ کہاں جاؤں گی؟

ہم غم و الم کی آتشیں آندھیوں سے گزرے۔ اور بالآخر ہنس دیے ـــــ نہ بہے جا سکنے والے غدار طوفان راہ میں آئے۔ اور ہم سہہ گزرے۔

لیکن یہ کیا مقام ہے۔ کہ ہم ساکت و صامت کھڑے ہیں۔ چاروں اور اندھیارا ہے۔ اور وحشتِ دل ہے اور رُوح کی پکار ہے۔ اور کوئی حشر تک برپا نہیں۔

میرے دل نے لہرا کر جاتی ہوئی کرن کو اپنے قریب کر لینا چاہا۔

کیا میں اسی دن کے انتظار میں زندہ تھی۔

اور کالج کے کامن روم میں بیٹھے ہوئے طالب علموں کے گروہ بہت طویل بحث کرتے تھے۔ اور ایثار کا۔ اور قربانی کا ـــــ اور جنے کس کس چیز کا تذکرہ کرتے تھے۔ اور کبھی کبھار غل غپاڑہ سن کر کوئی غیر جانبدار قسم کا طالب علم چق اٹھا کر جھانکتا۔

"دماغ خراب ہو گیا ہے تم لوگوں کا کمبختو ـــــ امتحان میں صرف دس دن رہ گئے ہیں۔ کچھ پڑھ ڈالو۔ ورنہ آتشی شیشے لے لے کر اخبار میں رول نمبر ڈھونڈو گے۔ اور نہ ملے گا۔"

یا جب بحث بہت شدت اختیار کر لیتی تو کوئی امن پسند طالب علم آجاتا۔ "کیا شور مچا رکھا ہے یار پڑھنے بھی نہیں دیتے۔"

اور امتیاز اپنی آواز دھیمی کر کے کہتا۔ "زندگی میں مجھے صرف دو مصنفوں نے متاثر کیا ہے۔ ایک نے مجھے قربانی اور ایثار کا جذبہ سکھایا۔ اور دوسرے نے مجھے زندہ رہنے کا فلسفہ بتایا۔"

اور اتنی دیر میں شرافت غل مچاتا چلا آتا۔ "مار ڈالا تمہارے فلسفے نے مجھے ـــ میں کھانا کھانے جا رہا ہوں۔"

میں بہت اطمینان سے امتیاز کے نوٹس جو اس نے نہ جانے کہاں کہاں سے مانگ تانگ کر جمع کئے تھے۔ اٹھا کر چل دیتی۔ امتیاز شرافت سے کہتا "نوٹس تو اس نے لے لئے۔ تم پوپولر سیریز کی کتاب مجھے دے دو۔"

شرافت ناک چڑھا کر کہتا "وہ تو میں پڑھ رہا ہوں۔"

امتیاز کی کوئی چیز اپنی نہ تھی۔ وہ سب ساتھیوں میں بٹ جاتی تھی۔ اس کی کتابیں اور اس کے نوٹس بھی اپنے نہ تھے۔ وہ ہم سب کی ملکیت تھے۔ ہوسٹل میں اس کا کمرہ تک اس کا اپنا نہ تھا۔ شرافت تو خیر مستقل اس میں رہتا ہی تھا۔ اور بھی جس کا جب جی چاہتا۔ اس میں جا کر اُسے اپنا گھر سمجھنا شروع کر دیتا۔ صرف ایک چیز تھی۔ جس کو امتیاز اپنی ملکیت سمجھتا تھا۔ اور وہ اس کی ڈائری تھی، جسے وہ بہت چھپا کر کبھی آتش دان میں، کبھی کسی روشن دان میں، اور کبھی دری کے نیچے لکھتا تھا۔ لیکن یار لوگ اس کی ڈائری کو بھی اس کی تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے تھے۔ اور جب جی چاہتا تھا۔ ڈھونڈ ڈھانڈھ کر پڑھ لیتے تھے۔ تنگ آکر اس نے ڈائری لکھنا ہی چھوڑ دیا۔

عشق وہ بہت سوچ سمجھ کر ایسی جگہ کرنے کا عادی تھا جہاں کامیابی کی کوئی اُمید نہ ہو۔ دراصل اُسے کامیابی سے ڈر لگتا تھا۔ ہمارے گروپ نے یہی تجزیہ کیا تھا۔ وہ بہت تلاش کے بعد کسی ایسی لڑکی سے عشق کرتا۔ جس کے بارے میں اُسے سو فی صدی یقین ہوتا کہ وہ اُس سے عشق نہیں کرے گی۔

"تمہارا نروس سسٹم بالکل تباہ ہے —— ہم لوگ یہ خیال بھی ظاہر کرتے تھے۔ اس پر وہ بات ہاتھ نچا کر کہتا "تم لوگوں کی سوچ بالکل غلط ہے۔"

سب اُسے بُری طرح ستاتے تھے۔ اور میں اس سے بہت لڑتی تھی۔ لیکن دل میں دراصل ہم سب اُس سے مرعوب تھے۔ بھلا بتایئے ہم میں سے کون یہ کر سکتا تھا کہ عین امتحان کی رات اپنے نوٹس اُٹھا کر کسی اور کو دے دے —— میں نے بھی یہ سب کچھ سوچا تھا۔

لیکن اب یہاں عدالت عالیہ کی سیڑھیوں پر بیٹھی میں یہ سوچ رہی ہوں کہ امتیاز نے بھی

زندگی سے سمجھوتہ کر لیا۔ امتیاز۔ جس نے ایک ساتھی کے ایک خط کے ایک جملہ پر زندگی کا بہت اہم فیصلہ کر ڈالا تھا۔ صرف ایک خط اور طلاق نامہ اپنی منکوحہ کے نام چھوڑ کر چپکے سے لاہور چلا آیا تھا یہ سب اس وقت ہوا جب رخصتی کا جھگڑا پڑا۔ اس کے چچا نے ناک چڑھا کر کہا۔

" بھلا اس کے لچھن تو دیکھو۔ نہ بھائی میں رخصتی نہیں کرتا میری بیٹی کیا بھوکوں مرے گی۔ اس سے کہو کوئی کام کرے۔ چھوڑے جلسے جلوسوں کے چکر۔"

اور جب وہ اپنے ذہن میں ایک گھر کے آرام اور جلسے جلوسوں کے ہنگام کا موازنہ کر رہا تھا اُسے ایک خط ملا۔

" ہمیں تمہاری اور تمہاری بہترین صلاحیتوں کی ضرورت ہے۔"

اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔ اور پلٹ کر نہیں دیکھا۔

میں نے بھی یہ سب کچھ سوچا تھا۔ اور اب میرے سامنے عدالت عالیہ کی پُرشکوہ عمارت ہے۔ یہ اتنے بلند و بالا بام و در۔ اور یہ نفاست سے ترشی ہوئی باڑ۔ جب یوم جمہوریہ پر یہاں قمقموں کی روشنی سے میزان عدل بنی تھی۔ تو ابا اور میں اس پہ فدا ہو گئے تھے۔ اور اس کو اوّل نمبر قرار دیا تھا۔ گو میری بہن کہہ رہی تھی کہ واہ صاحب کارپوریشن بہت خوبصورت سجا ہے اور ابا نے کہا تھا۔" اس سجاوٹ میں ذرا اکھڑ دراپن ہے۔ یہاں کلچر ہے"۔ تب میری بہن نے کہا تھا۔" جی آپ لوگ وکیل کے ناطے متعصب ہیں" اس پر سب ہنس دیے تھے۔

میں سیڑھیوں پر سے اُتر کر برآمدے میں لگی خس کی ٹٹی کے قریب آگئی، قطرہ قطرہ پانی ٹپک رہا تھا۔ میں نے خس کے ایک تنکے کو چھو کر دیکھا، کس قدر سرد۔ کیا مجھے کہیں پناہ ملے گی۔ اس زندگی کے ماتم سے کیا ہو گا۔ جس کی ابتدا ہم نے بڑی امنگوں اور بڑی آرزوؤں سے کی تھی۔ ہم نے یہی چاہا تھا کہ ہم دیانت سے اور خلوص سے زندہ رہ سکیں۔ تو آج میں کس کس چیز کا ماتم کروں گی اور زندگی کی اس کہانی کی ابتدا کہاں سے کروں گی، اتنا الجھا ہوا تو کوئی آغاز نہ تھا۔ اور اپنی الجھن میں سے جھانک کر میں نے دیکھا۔ لوگ ہیں جو بہت مطمئن ہیں اور بڑے

سکون سے کتابوں کی اور فلسفہ کی باتیں کرتے ہیں۔ ابھی اس روز میرے دفتر میں بیٹھے ہوئے انصار نے کہا تھا:" پارٹنر اس کتاب کا ترجمہ میں نے مکمل کر لیا۔"

میں نے آفس ٹیبل پر کاغذ تراشنے کے چاقو سے لکیریں کھینچنا بند کر دیں۔ اور پوچھا۔ "کون سی ہے؟"

" وہی۔ چپس آر ڈاؤن (CHIPS ARE DOWN)

" نام کا ترجمہ کیا کیا ہے ؟"

"برزخ "

" اچھا ہے۔" میں نے بے دھیانی سے کہا

" لیکن ساری کی ساری ترقی پسند پبلک خفا ہے۔ کہ ہٹاؤ یہاں پہلے ہی مارے قنوطیت کے بُرا حال ہے۔ تم اور وجودیت کے فلسفہ کو اپناتے پھرو۔ ہاں یاد آیا۔ تم نے وہ پبلک لائبریری کی کتابیں واپس کر دیں۔ ؟"

" نہیں۔"

" کیوں ؟"

" ابھی پڑھی نہیں"

" تو تم کیا پڑھتی رہتی ہو ؟"

" جاسوسی کتابیں"

اُس نے آنکھیں پھاڑ کر میری طرف دیکھا، تب میں نے آہستہ سے کہا:" میں نے زندگی سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔"

" خوب"۔ اس نے اپنے خاص انداز میں حلق سے آواز نکالی۔

" کیوں بھئی۔ کیا خیال ہے۔ اگر کوئی شخص بغیر ایڈم سمتھ اور مارشل پڑھے کینز کو پڑھ ڈالے۔ تو کیا حشر ہوگا اس کا؟" اور انصار جعفری نے پیپر ویٹ کو ایک جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھ دیا۔

"حشر۔ حشر ظاہر ہے کہ خراب ہوگا۔"

"اور ذرا اندازہ کرو کہ وہ شخص اسّی فیصدی مارکس لینے کی سوچ رہا ہے۔"

ضرور اظہر ہوگا۔ وہی ایسی بادی حرکتیں کرتا ہے۔ میں نے سوچا۔ لیکن میں اس وقت معاشیات یا اظہر کے مستقبل پر بحث کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ میں یہ سوچ رہی تھی کہ انصار بل کھا کھا کر کیوں چلتا ہے، عجیب حال ہے بھئی۔ کمر میں ذرا سا نہیں بلکہ بہت سا خم۔ اور ایک ٹانگ گھسیٹ کر۔ اور مجھے یقین ہے کہ اس کی ٹانگ کبھی نہیں ٹوٹی۔ جو لوگ سپیڈ لمٹ تھرٹی پر چلتے ہوں۔ ان کی ٹانگ بھلا کیا ٹوٹے گی۔

"کون صاحب ہیں؟"۔ قیوم دخل دینے سے باز نہ آیا۔

"بھئی تم چپ رہو۔ اور آرام سے کافی تیار کرو۔ تین چار پیالیاں دوسرے کمرے میں رکھی ہیں۔ اٹھا لاؤ۔ اور انھیں کھنگال لو۔ ذرا دل لگا کر کام کرو ـــــ ابھی ابھی انصار نے کہا تھا کہ تم اچھے آدمی ہو" علمی آدمی ہے نا۔ آؤٹ سائڈر (OUT DIDE) نہیں ہوگا" ـــــ انصار نے قیوم کے کردار کے علمی پہلو کو زبردستی رومانوی رنگ پہنایا۔ اور جب میں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔ تو اس نے ذرا معذرت کے سے انداز میں کہا تھا" میرا مطلب ہے۔ غریبِ شہر نہیں ہوگا۔"

"اچھا کہا ہے۔ غریبِ شہر۔ خوب۔" میں نے داد دی۔

"خوشیاں بس اتنی ہی رہ گئی ہیں کہ کوئی اچھا فقرہ ہو گیا۔ تو ہنس لیئے۔ کوئی اچھا جملہ لکھ لیا۔ تو ذرا خوش ہو لیئے" ـــــ انصار کو خوشیوں کی کمی کی مستقل شکایت تھی۔

"یہ بھی کیا کم ہے حضّت ـــــ غنیمت سمجھیئے۔ جو ہم دو چار ذرا ڈھنگ کے لوگ یہاں پڑے ہیں۔ ورنہ ـــــ"

اور پھر انصار نے بتایا کہ آج اس نے موہنجو دارو پہ ایک جملہ خوب لکھا ہے: "تہذیب یہاں صدیوں سے میٹھی نیند سو رہی تھی۔"

"ارے بھائی۔ میں نے بھی ایک جملہ قیامت کا لکھ ڈالا ہے۔ کیا بتاؤں ابھی تک اس کی داد نہیں ملی۔

اور اس میں کتنے دکھ ہیں۔ اور اس کے باوجود کتنی رنگینی ہے۔ نت نئے تجربات۔ اور نت نئے چہرے۔ ایسے چہرے جن پہ صدیوں کا دکھ اور صدیوں کی مظلومی کھنڈی ہے۔ اور یہ بے رنگ، بے رونق چہرے بہت سے چہروں کو شفق رنگ بخشتے ہیں۔

ہاتھ جو صدیوں کی محنت سے کھردرے ہو گئے ہیں اور کھردرا پن اپنی اولاد کو وراثت میں بخشتے ہیں۔ اور یہ کھردرے ہاتھ بہت سے چمپئی ہاتھوں کو دستانے مہیا کرتے ہیں کہ جب وہ پھول کو شاخ سے جدا کریں تو ان پہ خراش نہ پڑ جائے۔ کہیں ان ہاتھوں کی ملائمت کھردرے پن سے نہ بدل جائے

جب کبھی ابا جان ہمارے بل ادا کرتے تھے یا ہمیں جیب خرچ دیتے تھے۔ یا امی کی فرمائش پوری کرتے تھے (جن میں کبھی کبھار خاصا بچپنا ہوتا ہے) — تو میں نے کبھی اس روپیے اور اس انسان میں رشتہ قائم کرنے کی کوشش نہ کی تھی۔ جہاں سے یہ روپیہ آتا ہے۔

لیکن اب جب وہ میرے بہن بھائیوں کے ہوسٹل کے بل ادا کرنے کے لئے چیک کاٹتے ہیں۔ یا مجھے میری کسی بے ہنگم ضرورت کے لئے روپے دیتے ہیں۔ تو میرے سامنے ایک سیدھا سادا دیہاتی آجاتا ہے۔ جس نے گاڑھے کے کپڑے پہن رکھے ہیں اور اپنے ماتھے پر سے پسینہ پونچھتے ہوئے وہ اپنی اندر کی جیب میں ہاتھ ڈال کر روپیہ نکالتا ہے — زندگی میں پہلی بار میرے ذہن میں انسان اور روپیہ میں ایک رشتہ قائم ہوا ہے۔

ایک انسان جو بڑی محنت سے۔ بہت مدت میں روپیہ کماتا ہے۔

دوسرا انسان جو بڑی آسانی سے چند لمحوں میں وہ خرچ کر ڈالتا ہے مجھے بہت سی چیزوں سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔

اور پھر خود وکالت شروع کر کے میں نے دیکھا۔ اچھے بھلے آدمی اس پیشہ میں آتے ہیں اور پھر طبیعت میں کمینہ پن آجاتا ہے۔

ایک پھٹے پرانے کپڑوں والا انسان عدالت میں کھڑا آنکھوں میں آنسو بھرے کہہ رہا تھا۔ "حضور تاریخ نہ دیجئے۔ بڑی مشکل سے گواہ لایا ہوں۔"

ایک بوسیدہ سیاہ کوٹ پہنے ایک اور انسان عدالت سے کہہ رہا تھا۔

"حضور تاریخ دے دیجئے۔ اس نے میری فیس نہیں دی۔ کیوں آپ میرا پیٹ کاٹنا چاہتے ہیں! مقدمہ ختم ہوگیا تو یہ فیس کہاں دے گا!"

مسئلہ دونوں کا ایک ہی تھا۔ دونوں سمت روٹی کا مرحلہ درپیش تھا۔

عمر بھر ہم کچھ چیزوں کو چاہا کئے اور کچھ چیزوں کے بارے میں سوچا کئے۔ ہم نے معاشیات پڑھی، اور قانون پڑھا۔ اور فلسفہ کو پڑھنے کی کوشش کی۔ ہم جذباتی لوگوں پہ ہنستے رہے اور خود کو بہت منطقی اور سرد مہر سمجھا کئے ___ اور بالآخر معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ غلط تھا۔ اور اب یہاں لوگوں کے اس پر شور ہجوم میں کھڑے ہم سوچ رہے ہیں کہ یہ سب کس قدر بیکار تھا۔ معاذ اللہ۔

یہ کیسی قابل رحم بات ہے۔ کہ میں جس نے اتنا بہت کچھ سمجھنے کی کوشش کی۔ اب تک ایک ذرا سی بات بھی نہیں سمجھ سکی۔

جب ٹکراؤ خیر اور شر کے درمیان ہو تو کسی ایک چیز کو چن لینا کس قدر آسان ہوتا ہے لیکن خیر و شر کے رنگ تو آپس میں اس قدر اُلجھے ہوئے ہیں۔ اگر یہ دو شفاف رنگوں کی طرح الگ الگ ہوتے۔ یہاں تو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ سپیدہ کہاں ختم ہوا اور سیاہی کہاں سے شروع ہوئی اور اگر ٹکراؤ صرف خیر اور شر کے درمیان ہوتا۔ جب بھی تھا۔ یہاں تو دو خیر ٹکراتے ہیں۔

اور معلوم ہوا کہ ہم جو خود کو بہت منطقی اور بقراط سمجھتے تھے۔ دراصل بہت ہی جذباتی تھے ہماری ذہنی ساخت تو بالکل بچوں کی سی تھی۔ اور بالکل بچوں کے سے خلوص سے ہم ماحول کے وجود کو چاہتے تھے اور زندگی پر بہت ہی سادہ سا تیقن تھا۔

ابا کیا کرتے ہوں گے۔ میں نے سوچا۔

میں کیا کرتی ہوں۔ میں نے یہ نہیں سوچا

اخلاق کی۔ اور اصول کی باتیں کرنا بہت آسان ہے۔ اس وقت جب کوئی فوری ضرورت درپیش نہ ہو۔

میں کیا کروں گی۔ میں نے یہ بھی نہیں سوچا——یہ دور کی بات ہے۔

فی الحال میرا معاملہ دوسرا ہے۔ میرے لئے کوئی روٹی کا مسئلہ نہیں ہے لیکن ابا کیا کرتے ہونگے ابا جو ابھی تک مجھے بھی جیب خرچ دیتے ہیں۔

اس شام میں نے بڑے غور سے اپنے باپ کو دیکھا بچوں کی طرح وہ کسی بات پر خوش تھے۔ اور امی کو اپنے پرانے منشی فضل کریم کا قصہ سنا رہے تھے۔ فضل کریم ان کا اس زمانے میں منشی تھا۔ جب ابا نے ابھی نئی نئی وکالت شروع کی تھی۔ اب وہ آڑھت کی دکان کرتا تھا۔

"ارے بھئی میں جب لائلپور گیا۔ تو اس نے میری دعوت کی۔ بہت خاطر مدارات کی۔ اور اس کے گھر ایک نئی قسم کا ریڈیو میں نے دیکھا، بالکل گلوب کی شکل کا۔ میں نے اس سے پوچھا بھی تھا کہنے لگا۔ "جرمنی کا بنا ہے۔ پاکستان بھر میں صرف تین تھے۔"

ابا کے چہرے پر بچوں کی سی خوشی اور حیرت تھی۔ بڑے غور سے میں نے ان کو دیکھ کر سوچا اس پیشہ میں رہ کر ابا نے یہ زندگی کی سمت بچوں کا سا رویہ کیوں کر سنبھالے رکھا۔

شاید میں نے ابا کا ایک چھوٹا موٹا بت بنا رکھا ہے لیکن اس دن بابا بھی جو کہ ساری دنیا میں کیڑے ڈالنے کے عادی ہیں۔ اپنی خالص کرنالی زبان میں کہہ رہے تھے "تیرا باپ تو بہت بھولا بھالا آدمی ہے۔ تو تو بہت چنٹ ہے"۔ اور پھر میرا بھائی جولی آیا۔

" ابا — باہر ایک بڈھا بیٹھا رو رہا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے —— کہ اس کے بیٹے کو سیشن سے پھانسی کی سزا ہو گئی۔ وہ اس کا اکلوتا بیٹا ہے ابا۔"

جولی کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ جولی جو میرے دوسرے بہت ہی حساس بھائی کی نسبت خاصا سخت دل تھا۔ جس پر ہم کہتے تھے۔ کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا۔ سوائے اس بات کے جو اس کی ذات سے متعلق ہو۔ اور جو باوجود اتنا بڑا ہونے کے ہمارے گھر میں بالکل بچہ سمجھا جاتا تھا۔ جس کا ہم سب بچوں کی طرح تحفظ کرتے تھے۔

ابا ریڈیو کا قصہ بھول کر باہر چلے گئے۔

بڈھا دفتر کی دہلیز پر بیٹھا منشیوں سے کہہ رہا تھا "میرے پاس روپیہ تو نہیں ہے۔"

ابا کچھ دیر تک چپ چاپ بیٹھے میز کی چیزیں اِدھر اُدھر کرتے رہے۔ جب وہ نروس ہوتے تو ان کے ہاتھ مستقل چلتے رہتے۔

منشی جی سینیئر نے بہت منہ بنا کر کہا "فیس کے بغیر تو کام نہیں ہوگا" اور بڈھا بلک بلک کر رونے لگا "تو بھیا میں پھیس کہاں سے لاؤں۔"

"پھر صبر کرو۔" جونیئر منشی جی بولے۔

اب کے بڈھا دھاڑیں مار مار کر رویا۔

دونوں منشیوں نے بہت بُرا سا منہ بنایا۔ ابا ایک دم کھڑے ہو گئے۔

"منشی جی۔ اس کا فائل بنا لو۔ بڑے میاں فیصلہ کی نقل اسے دے دو۔"

منشی جی سینیئر نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر انھیں دیکھا ابا جلدی سے باہر چل دیے "میں ذرا سی دیر میں واپس آتا ہوں۔"

ابا کی بڑی سخت قسم کی فراری ذہنیت تھی۔ وہ زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کسی مسئلہ کا حل تلاش کرنے کے عادی نہیں تھے۔ وہ چپکے سے کچھ طے کرتے (مجھے یقین ہے وہ کچھ طے نہیں کرتے بس وہ چپکے سے کچھ نہ کچھ کر دیتے۔) اور پھر اُٹھ کر چلے جاتے۔ میرا خیال ہے۔ انہوں نے اپنے دل میں کچھ اس قسم کی بات کی ہوگی "ٹھیک ہے۔ یہ مقدمہ مفت ہی کرنا ہوگا۔ لیکن اب منشی جی سے حجت کون کرے"۔ وہ کسی سے سنجیدگی سے حجت کرنے یا کسی کو ڈانٹنے کے قائل نہیں تھے۔ خواہ وہ اُن کے بچے ہوں یا ملازم۔

ابا رات دو بجے تک وہ اپیل تیار کرتے رہے۔ اور صبح منشی جی سے کہنے لگے "کورٹ فیس لگا کر دائر کر دو"
"جناب اس کے پاس کورٹ فیس کے پیسے بھی نہیں ہیں۔"

"ابا نے کنپٹی کے قریب کے بالوں کو چھوا — "دفتر کے پیسوں میں سے لگا دو۔"

دفتر کی میز پر پھول سجاتے ہوئے میں نے ایک نظر ابا کو دیکھا۔ اور پھر منشی جی کو۔

— ابّا ابھی شام ہم سب کیسے خوش تھے۔ آپ ہمیں نئے ریڈیو کی شکل وصورت بتا رہے تھے۔ یہ ہمارا چھوٹا سا مطمئن گھر تھا، اور پھر ایک انسان آیا جس کا اکلوتا بیٹا جیل میں پھانسی کا منتظر ہے۔ اور بوڑھا باپ ہم سب کے سامنے رویا کیوں کہ انصاف بہت گراں ہے۔ یہ کسی کا حق نہیں ایک رعایت ہے۔ اور اس کی ایک قیمت ہے۔ اور ابھی لکھوکھا انسان ایسے ہیں، جو چاندی کے روپیوں کی صورت میں اس کی قیمت ادا نہیں کر سکتے۔ وہ صرف اپنی خودداری فروخت کر سکتے ہیں، اور کر دیتے ہیں۔

ہم سب رونے کو کتنا برا سمجھتے ہیں۔ بہت بچپن میں امّی نے بتایا تھا۔ آنکھ میں کبھی آنسو نہ آنا چاہیئے۔ اس سے کمزوری کا اظہار ہوتا ہے اور کبھی کسی کے آگے کسی بھی ضرورت سے ہاتھ نہ پھیلانا چاہیئے۔ اس سے خودداری کو ٹھیس پہونچتی ہے۔

تو وہ کیا چیز تھی۔ ابّا — جس نے اس آدمی سے اس کی خودداری تک بکوا دی۔ ایک انسان دوسرے انسان کے آگے ہاتھ پھیلا پھیلا کر رویا۔

کس لئے — آخر کس لئے

وہ کون سے حالات تھے۔ جنہوں نے ایک انسان کو اتنا مجبور کر دیا۔

— اور ہم سب غمگین ہو گئے۔ ہم سب جو اس قدر خوش تھے۔

ابّا میرا جی چاہتا ہے۔ ہم سب اس دکھ سے بچ جائیں۔ میری اتنی ہی محدود سی دنیا ہے۔ ہم سب — اور وہ سب لوگ جو وقتاً فوقتاً زندگی میں آتے ہیں۔ جن کا دکھ کافی حد تک ہمارا دکھ بن جاتا ہے۔ میں مانتی ہوں۔ ان کا دکھ ان ہی کا دکھ رہتا ہے۔ صرف چند لمحوں کے لئے ہمارا بنتا ہے۔ صرف چند لمحوں کے لئے وہ جلتا ہوا دکھ ہمارے جسم وجان سے بھی چھوتا ہے — تو یوں وہ ہمارا بھی دکھ ہوا نا —

تو پھر اگر ہم ایک بہتر دنیا کے خواب دیکھیں۔ جہاں پناہ گاہیں خریدنا نہ پڑتی ہوں۔ تو یہ کوئی ہم اس لئے تو نہیں چاہتے کہ کسی پر احسان کر رہے ہیں۔ یہ تو خود ہمارا اپنی ذات پر احسان ہے۔

ہم خود دکھ سے بچنا چاہتے ہیں۔

تو جب میں اس نئی دنیا کی بات کروں، تو آپ کیوں مجھ سے یہ کہیں۔ کہ یہ آئیڈلزم ہے۔ آپ بھی کوئی ایسے عملی آدمی تو ہیں نہیں۔

آپ جس طرح مجھے دکھ سے بچانا چاہتے ہیں، وہ تو نہایت ناپائیدار طریقہ ہے۔ مستقبل اس تحفظ کی کوئی گارنٹی نہیں کرتا — تو پھر کیوں نہ ہم تھوڑا سا دکھ اس وقت جھیل لیں تاکہ آنے والے دکھوں سے بچ جائیں۔

ہو سکتا ہے۔ کسی دن زندگی اتنی محفوظ اتنی پرسکون ہو جائے — کہ کسی باپ کو اپنے بچوں کو دکھ سے بچانے کے لئے کسی غیر ضروری ذہنی کرب سے نہ گزرنا پڑے۔ ہمارے بعد بھی لاکھوں کروڑوں بچے اس دنیا میں آئیں گے۔ ان کو نفرت — بے انصافی — اور اذیت سے بچانا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ جتنا ہم کو —

لیکن مجھے ابا سے یہ باتیں کہنے کی جرأت کبھی نہیں ہوئی۔

معلوم نہیں ان کے خیال میں بچوں کو اس قسم کی باتیں کرنا چاہئیں۔ یا نہیں — ان کے ذہن میں میں اب بھی پانچ برس کی وہ بچی ہوں جسے وہ شکوہ اور جواب شکوہ یاد کروایا کرتے تھے

— اس قسم کی بہت سی خرافات سننے کے بعد اظہر نے کہا "یہ تو خیر تجربات ہوئے۔ یہ بتاؤ۔ ان تجربات کا تمہاری ذات پر کیا اثر پڑا۔ تم نے اپنا رول کیا متعین کیا۔"

"اظہر علوی" — میں نے کہا — "میری ذات پر کوئی اثر نہیں پڑا، اور بہت اثر پڑا۔ یہ چھوٹے چھوٹے تجربات ایک پوری زندگی کا سرمایہ ہیں۔ میں نے اپنا کوئی رول متعین نہیں کیا۔ رول متعین کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ رول تو زندگی میں لاشعوری طور پر متعین ہوتا رہتا ہے۔ شعوری طور پر صرف اس کا خاکہ متعین کرنا پڑتا ہے — بہت پہلے — زندگی کو صحیح صحیح شروع کرنے سے پہلے۔ ذہن چند اصول بنا لیتا ہے۔ زندگی کے کینوس پر چند خطوط کھینچ دیتا ہے۔ اور زندگی میں ہر نیا قدم جو اٹھایا جاتا ہے ہر لمحہ جو گزرتا ہے۔ ہر فیصلہ جو کرنا پڑتا ہے ان خطوط

میں رنگ آمیزی کرتا رہتا ہے۔ اور یوں جب ایک زندگی کی تکمیل ہوتی ہے۔ تو ایک تصویر بھی مکمل ہو جاتی ہے ـــــ اس تصویر میں رنگ کیا ہوں گے۔ یہ پہلے سے کون بتا سکتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ میں جس چیز سے بنا ہوں۔ وہ فولاد ہے۔ جو تپ کر آتش رنگ بن جائے گا۔ یا کچی لکڑی ہے۔ جو لمحہ بھر کی آنچ میں جل کر خاک ہو جائے گی ـــــ "

" آج تمہارا موڈ عجیب وغریب ہے "

" ہاں' میں نے کہا۔ واقعی عجیب وغریب ہے۔"

کیا میں انھیں اس عجیب وغریب موڈ کی وجہ بتا دوں۔ کیا میں ان سے امتیاز کے بارے میں کہہ دوں۔ کہ وہ اس وقت ایک ایسے مقام پر کھڑا ہے۔ جہاں کئی راہیں آن کر ملتی ہیں اس کے ایک سمت رسن ودار کی بلندی ہے اور دوسری سمت ایک کنج عافیت ہے۔

اسے اس وقت ایک ایسے انسان کی ضرورت ہے جو اُسے ذرا سا سہارا دے۔ کمزوریاں ہم سب میں ہوتی ہیں (بلکہ بعض لوگوں کا تو خیال ہے۔ کہ لفظ کمزوری ہی سرے سے غلط ہے۔ اُسے انسانی خصلت کہنا چاہیئے) اپنی اپنی لڑائیاں بھی ہمیں تنہا ہی لڑنا پڑتی ہیں۔ لیکن کچھ ہاتھ ہیں۔ جو سہارا دے سکتے ہیں ـــــ اُسے کون کٹھن راہ لیکن صحیح راہ سجھائے گا؟ ـــــ وہ راہ خارزاروں سے پُر سہی لیکن اس کے اس پار کتنی بلندی ہے۔ اور کتنا اجالا ہے۔

لیکن نہیں ـــــ میں ان لوگوں سے کچھ نہیں کہوں گی ـــــ شائد یہ نہیں سمجھ سکیں گے۔ صرف ناک چڑھا کر اتنا کہیں گے ـــــ ارے بھئی اس ملک اور اس سماجی نظام کی پیداوار سے اور کیا توقع ہو سکتی ہے۔ یہ ان لوگوں کو بھول جائیں گے۔ جو اس سے بھی دشوار گزار مقامات سے گزر کر بھی ثابت قدم رہے۔ اور اگر ان کا ذکر کیا جائے گا۔ تو بڑے بائی برو انداز میں کہیں گے،

ـــــ ڈرائینگ روم کے انٹلکچوئلز اور سیاست والوں کا ذکر دو۔

انھیں یہ نہیں معلوم۔ کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ زندگی کی ترقی میں ڈرائنگ روم کے انٹلکچوئلز کا کوئی مثبت حصہ اور دخل نہیں ہوتا۔ تو یہ بھی کیا کم ہے۔ کہ ان کا کوئی منفی حصہ بھی نہیں ہوتا۔ اور

یہ بھی مثبت بات ہے۔

ان لوگوں کو گھر پہنچانے کے بعد واپسی پر میں نے سوچا کہ اگر کبھی مجھے سوچنے کی مہلت مل سکی۔ تو میں کسی گوشے میں چپ چاپ بیٹھ کر یہ سوچوں گی۔ کہ بڑے بڑے آئیڈلز نے ہمیں کہاں کہاں مایوس کیا۔ ہمارے بھی کیسے کیسے خواب تھے۔ ہم کہاں کہاں سراب پاکر مایوس ہوئے ـــــ لیکن زندگی کی کیسی چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں جن نے ہمیں خوشیاں بخشیں۔ جب ہم اپنی لڑائیاں لڑتے تھے۔ شکستوں کا سامنا کرتے تھے یا ستیت تھی، کہ روح کو لپٹ لپٹ جاتی تھی۔ تاروں کا کوئی جھرمٹ نظر آجاتا۔ اور ہم ہنس دیتے۔ ہم کسی تپش سے گھبرا جاتے۔ روح جلنے لگتی۔ ہوا کا کوئی خوشگوار جھونکا آتا، اور ہم مسکرا دیتے۔ کبھی محبت اور رفاقت بے معنی باتیں نظر آتیں۔ کسی نیلی یونیفارم میں ملبوس کوئی کمسن بھائی اپنی ننھی بہن کو بازو کا سہارا دے کر سڑک پار کرواتا۔ زندہ رہنا اچھا معلوم ہوتا۔ کبھی اعتماد بے ہنگم معلوم ہوتا۔ لیکن کوئی انسان ملتا۔ جو اپنے ساتھیوں پر اعتماد رکھتا۔ جی خوش ہو جاتا ـــــ سچ عنقا نظر آتا۔ اور جینا بے معنی معلوم ہوتا۔ پھر اچانک معلوم ہوتا۔ کہ لوگ ہیں جو اس کی خاطر جان دے دیتے ہیں، اور ہمارا اعتماد بحال ہو جاتا۔ ہم کس شدت سے زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ ایک ایک لمحہ میں، ایک ایک ساعت میں ـــــ اور کیسی چھوٹی چھوٹی خوشیوں نے احساس کی یہ شدت اور زندگی کی یہ امنگ بخشی ہے۔

فی الحال تو میں صرف یہ سوچ رہی ہوں کہ زندگی کی صبحوں، شاموں کے بارے میں جب کبھی ہم نے سوچا تھا تو خیال نہ آیا تھا کہ ایک زمانہ آئے گا جب ایسے دن طلوع ہوں گے کہ صبح اور شام میں تمیز کرنا دشوار ہو جائے گا۔ ہر جانب گرد آلود خستہ سیاہ کوٹ نظر آئیں گے۔ اور کوئی رنگ ڈھونڈے سے نہ ملے گا وہ دھول جو سیاہ کوٹ پہ نمایاں رہتی ہے ذرا دل و دماغ میں جھانکو تو وہاں بھی ملے گا۔

ہمیں صبح کے وہ پھول بہت پسند تھے۔ جن کو چھوؤ تو شبنم کے موتی ٹپ ٹپ ہمارے چہرے پر بکھر کر ٹوٹ جاتے تھے، ہمیں نکھری ہوئی صبحیں اور شفق رنگ شامیں بہت پسند تھیں۔

پھر یہ گرد آلود راستے اور گرد آلود ذہن ہمارا مقدر کیوں بنے۔ ہمیں اجالے سے اور نکھار سے پیار تھا لیکن زندگی نے ہمیں صرف تاریکی اور گرد دی۔

اور بار روم میں کبھی کوئی ذکر نہیں سنا۔ سوائے تیری میری برائی کے ــــ تیری میری چغلی کے اور تیرے میرے عیبوں کے۔ اگر ایک دن یہاں بیٹھ جاؤ تو ہفتہ بھر کے لئے زندگی کے حسن پر سے اور سچائی سے ایمان اُٹھ جاتا ہے۔

ــــ "اجی کیا خبر ہے آپ کو ــــ خود تو وکیل ہیں؟ بیٹا منشی گیری کرتا ہے۔ میں نے خود اُسے مقدمے پکڑتے ہوئے دیکھا ہے۔"

یا پھر بہت ہی غصہ بھری آواز آئی "ارے ان کی کیا پوچھتے ہو۔ میں نے ایک زائدالمیعاد کلیم سات سو روپے میں بک کیا۔ ان صاحب نے اسے دس روپے میں بک کرلیا (معلوم ہوا کہ بک کرنا ایک اصطلاح ہے)

ہر شخص یہ ثابت کرنے پر اُدھار کھائے بیٹھا تھا کہ اس کا معیار بہت اونچا ہے۔ باقی سب کا گھٹیا۔

"اور یہ ــــ یہ بس سٹاپ پر کھڑے لڑکیوں کو گھورتے رہتے ہیں۔ اور ایک دن بس میں دیر ہوگئی تو کچھ لڑکیوں سے کہنے لگے "آیئے مل کر تانگہ کر لیتے ہیں" جب انھوں نے گھور کر دیکھا۔ تو کہنے لگے میں شریف آدمی ہوں۔ وکیل ہوں۔ یہ دیکھئے میرا کارڈ۔"

اور پھر کوئی مصرع اٹھاتا۔

"دیکھئے وہ خط جو پاکستان ٹائمز میں چھپا تھا نا۔ کہ کچھ وکیل بس سٹاپ پر کھڑے لڑکیوں کو گھورتے ہیں۔ وہ انھیں کے بارے میں تھا۔ کسی شیریں نام کی لڑکی نے لکھا تھا۔ اور انھوں نے مجھ سے لڑائی کی۔ کہ یہ خط تم نے لکھا ہے۔ میں نے دراصل ایک ہی دن پہلے ان سے کہا تھا۔ کہ آپ بس سٹاپ پر نہ کھڑے ہوا کریں۔"

پھر اخبارات کے خط کے کالم کا ذکر آتا تو کیونکر ممکن تھا کہ اس شخص کی دھجیاں نہ بکھیری جائیں جس نے نئی حکومت کے قیام کے چند روز بعد اخبار میں ایک خط کمانڈر انچیف کے نام چھپوادیا کہ ملک کو یہ نیا دور بہت بہت مبارک ہو۔ لیکن عالی جاہ اس ملک میں جہاں بہت سے چور اُچکے ہیں۔ وہاں وکیلوں کی یہ قوم تو بہت ہی بدمعاش ہے۔ دوسروں کے گھر لوٹ لوٹ کر اپنا گھر بھرتی ہے۔ بہتر ہوگا۔

حضور والا کہ ان لوگوں کی گوشمالی فرمائی جاوے۔ اور یہ ایسے اچکے ہیں کہ ایسی ویسی گوشمالی سے ان کا کچھ نہ بگڑے گا انتہائی سختی کی ضرورت ہے ان کے گھروں پہ چھاپے مارے جائیں۔ ان کی آمدنی وخرچ کا موازنہ کیا جائے اور جن کے پاس کاریں ہیں۔ ان سے پوچھا جائے کہ وہ کہاں سے آئیں۔"

"اب تم سے بھی پوچھا جائے گا"۔۔۔ ایک صاحب نے انتہائی شگفتگی سے مجھے اطلاع دی۔

میں نے بُرا ماننے کی کوشش کی۔

"بُرا تو تم یوں مان گئی ہو۔ جیسے تمہارے پاس شیورلیٹ ہو۔ لے دے کر ایک"۔۔۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس دیے۔

"میں نے کہا بھیا تم نے لومڑی کا قصہ نہیں سنا کہ دوڑی چلی جا رہی تھی۔ لوگوں نے پوچھا گھبراہٹ کیا ہے۔ کہنے لگی۔ سنا ہے اونٹوں کو بیگار میں پکڑ رہے ہیں۔

"تو بی تمہیں کیا ؟"

"اے لو۔ اگر وہ یہ کہدیں کہ ایں ہم بچہ شتر است ۔ تو میں کیا کر لوں گی ؟"

"تو یہی حساب میرا ہے۔ اگر وہ یہ کہدیں کہ ایں ہم بچۂ شیورلیٹ است ۔۔۔ تو میں کسی کا کیا بگاڑ لوں گی۔"

اتنے میں کسی نے پوچھا کہ وہ تمہاری موٹر کا بونٹ ہر وقت کیوں کھلا رہتا ہے۔ اس پہ مجھے یہ بتانا پڑا کہ ڈرائیور کو مشینری سے کوئی خاص عشق ہے ۔ لہذا وہ بونٹ کھولے یا تو دست درازیاں کرتا ہے اور یا یونہی تکتا رہتا ہے۔ اور چونکہ موٹر سخت بے وفا واقع ہوئی ہے ۔ موقعہ بے موقعہ جل دے جاتی ہے اس سے کوئی ڈرائیور بھی وفا کرتے گھبراتا ہے اب اگر خدا خدا کر کے یہ ڈرائیور ذرا ٹک گیا ہے تو میرا کیا نقصان ہے۔ بے شک انجن کو دیکھ دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کرتا رہے۔

اتنے میں کھڑاؤں کی آواز آئی۔ اور میر صاحب آتے نظر پڑے۔ میر صاحب بھلے آدمی ہیں۔ اور انھوں نے کام بھی سنا ہے۔ بہت کیا ہے آکر انھوں نے پھر قربانی اور ایثار کا فلسفہ چھیڑ دیا۔

"یہ قربانی کا فلسفہ ہی سرے سے غلط ہے میر صاحب"

سب لوگوں نے مجھے گھور کر دیکھا لیکن بیٹھے پہ زبان نہیں رکتی۔

میں نے کہا: "میر صاحب۔ اگر کوئی شخص کوئی کام کرتا ہے تو وہ یہ سوچ کر کرتا ہے کہ میری ذات اور میرے وجود کا جواز اسی کام میں تھا، مجھے یونہی کرنا تھا، تو پھر قربانی کیسی، اور احسان کیا —— اور صلہ کی توقع کیسی —— اس شخص نے جو کچھ کیا اپنے لئے کیا۔"

میر صاحب تو یہ کہہ کر چلے گئے کہ "آپ تو بہت اونچی بات کر رہی ہیں" —— دور تک ان کی کھڑاؤوں کی آواز گونجتی رہی۔

اور یہاں لوگ باگ پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ گئے۔

"جی کیا کہا آپ نے۔ قربانی کا فلسفہ غلط ہے۔"

"قطعی غلط ہے" —— میں نے بھی بہت جل کر کہا "قربانی وربانی کوئی نہیں کرتا۔"

"تو وہ سب بڑے بڑے لوگ جنہوں نے قربانیاں دیں"

"پھر وہی بات —— بھئی کہا جو کہ کوئی قربانی نہیں دیتا۔ ان بڑے لوگوں نے صرف اپنی ذات کو پلنے کی کوشش کی۔"

"ذات —— استغفراللہ —— وہ اپنی ذات سے بہت اونچے لوگ تھے۔"

ایک گرج دار آواز سنائی دی۔

"اے جناب ان کی ذات کا ثبات اسی میں تھا۔" میری منحنی سی آواز نکلتی: "ملحد ہیں آپ لوگ اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔" —— یہ تعریف سن کر اور شدید گھٹن لے کر میں بار بار دم سے اُٹھ آئی۔ یہ گھٹن تو روح میں یوں پیوست ہو کر رہ گئی تھی جیسے ہم اس کو لے کر ہی اس دنیا میں آئے تھے۔ زندگی کی اتنی بے شمار اصطلاحات تھیں جن کے معنی ذہن میں دھندلے ہیں۔ تنقید کرنے والے کو یہ خبر نہ تھی کہ وہ جو الفاظ استعمال کر رہا ہے۔ اس کے پیچھے کیا ہیں۔ وہ اتنے بڑے بڑے فلسفی جن کا صدیوں نے احترام کیا کہتے رہے کہ جہاں سے شکوک جنم لیتے ہیں۔ جہاں سے انسان اپنے عمر بھر کے نظریاتی اعتقادات کو شک کی نظر سے دیکھنا شروع کرتا ہے وہاں سے فلسفہ کی ابتداء ہوتی ہے۔

—— عمر بھر وہ حق کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے۔ نیکی کیا ہے اور بدی کیا ہے۔ یہ معلوم کرنے کے لئے انھوں نے عمریں تج دیں۔ اور پھر بھی یہی کہا کہ میں صرف ایک بات جانتا ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا۔

اور یہ کہ اس سے زیادہ مضحکہ خیز بات کوئی نہ ہوگی کہ آدمی پورے وثوق اور پورے یقین سے ایک بات کہے۔

اور یہ لوگ جن کے دل اور دماغ بالکل ذرا ذرا سے تھے پورے وثوق سے میز پر ہاتھ مار مار کر کہتے۔

یہ اچھا ہے اور یہ بُرا ہے۔

یہ نیکی ہے اور یہ بدی ہے۔

یہ پاکیزگی ہے اور یہ کثافت ہے۔

یہ دین ہے اور یہ بے دینی ہے۔

یہ اخلاق ہے اور یہ بد اخلاقی ہے۔

یہ دین کی اور اخلاقی اقدار کی بات کرتے ہیں۔ یہ جو زندگی میں ذرا سے لالچ سے دامن نہ بچا سکے ان پر حملے کرتے ہیں جنھوں نے زندگیاں تج دیں۔ چند روپلوں پر ایمان فروخت کرنے والے ایمان کی اور دین کی بات کرتے ہیں۔

انسانوں کی ہڈیوں پر چھوٹے موٹے قصر تعمیر کر لینے والے اب بھی یہ توقع رکھتے ہیں کہ انھیں دوسری دنیا میں موتی کے محل ملیں گے دودھ اور شہد کی نہریں ان کے قدم چومیں گی اور دوسرے جو زندگی کے کسی پہلو پر ان سے متفق نہیں ہیں جہنم کے کندے بنیں گے —— اللہ اکبر۔

جو زندگی میں بددیانتی کا جواز یہ پیش کرتے ہیں کہ میں اپنی ماں کے آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا ان پر حملے کرتے ہیں جنھوں نے ماؤں کے آنسو بھی دیکھے۔ بیوی کی آہیں بھی سنیں۔ اور بچوں کو بلکتے بھی دیکھا —— اور زندگی کے حسین ترین دن تنگ و تاریک زندانوں میں گذار دیے۔ قید و بند

کی صعوبتیں برداشت کیں اور اس کے باوجود سب سے پیار کرتے رہے۔

نیلے آسمان سے انھیں بھی پیار تھا۔ ہوا کے جھونکے انھیں بھی اچھے معلوم ہوتے تھے اور پھول انھیں بھی بھلے لگتے تھے۔

اور انھوں نے اس سارے حسن۔ ان سب راحتوں سے ــــ کسی عالمگیر سچائی ہی کی خاطر منہ موڑا تھا۔

ورنہ آرام تو ہر شخص چاہتا تھا وہ سب لوگ بھی آرام سے اپنے اپنے گھروں میں رہنا چاہتے تھے۔ لیکن انھوں نے آنے والی نسلوں کی خاطر اس سکون سے دامن چھڑا لیا۔ اور یہ سمجھا کہ وہ اپنی ذات کو اسی طرح پا سکتے تھے۔

اخلاقی اقدار کی اور ایمان کی صرف باتیں کرنے والے ان لوگوں پر حملہ کرتے تھے جو اخلاقی اقدار کے لئے زندہ تھے۔

بہت غصہ میں بھری میں کام کرتی رہی۔

سب سے پہلے وہ بڑے میاں ہاتھ باندھے آئے جو منگلپورہ میں رہتے تھے۔ یہ میرے اصل نسل مؤکل تھے اپنی وکالت کے شروع میں میں نے ان کا ایک مقدمہ کیا تھا۔ جب منشی نے ان سے فیس وصول کی۔ تو مجھے بہت سخت حیرت ہوئی۔

ارے اپیل ڈرافٹ کرنے کے پیسے لے لئے تم نے بھائی اس قسم کے کام تو ہم ہمیشہ مفت ہی کرتے چلے آئے تھے۔ اس طرح کی کتنی ہی درخواستیں ہم نے لکھی ہیں۔ اپنے ملازموں کی ــــ محلہ والوں کی بیچھواڑے کے کوارٹروں پر جن مہاجرین نے قبضہ کر رکھا ہے، ان کی ــــ اور کبھی فیس نہیں لی تھی۔ بہت سے لوگوں کا کام کرنے کے لئے ہم دفتروں میں بھی مارے مارے پھرے ہیں۔ کسی نے ہمیں فیس نہیں دی تھی۔ اور نہ ہمیں خیال ہی آیا تھا۔

تو خیر ــــ اس اپیل کے بعد سے بڑے میاں اپنے سب متفرق کام مجھی سے کروایا کرتے تھے۔ ہر اتوار کی صبح وہ بڑے اہتمام سے چلے آتے۔ برآمدے میں بیٹھ کر ایک پیالی

چائے پیتے اور دنیا بھر کی باتیں کرتے۔ ایک اتوار نہیں آئے تو مجھے بہت فکر رہا۔ اگلے اتوار کو وہ ایک کپڑے میں چار لڈو باندھ کر لائے اور گزشتہ اتوار نہ آنے کی وجہ یہ بیان کی کہ ان کے ہاں پوتا ہوا ہے۔

بہت دلچسپ آدمی تھے اور کچھ پیری مریدی کا بھی دعویٰ تھا کہتے تھے بس اب ولی ہونے کو ہوں"۔ پھر لہک لہک کر یہ شعر پڑھتے۔

"فقیرا فقیری لمبی ڈور ہے — جتنی کہ لمبی کھجور ہے
چڑھ جائے تو امرت رس پیئے — گر جائے تو چکنا چور ہے"

اب ان کی مشکل یہ تھی کہ ایک بار ۴۸ء میں یہ گرفتار ہوئے تھانہ میں ان کی تلاشی ہوئی جیب سے ستر روپے ایک راشن کارڈ، اور ایک پراویڈنٹ فنڈ کی کاپی نکلی۔ اور وہ بحق سرکار کچھ عرصے کے لئے ضبط ہو کر خزانہ میں جمع ہوئی۔

۴۸ء سے ۵۸ء تک وہ برابر اسی کوشش میں رہے کہ وہ کاغذات اور روپے ان کو مل جائیں۔ مصیبت یہ ہوئی کہ ان کے روپے ان کے کاغذات کو بھی لے ڈوبے تھے روپے تو کھاپی کر برابر ہوئے۔ اب کاغذات دیے جائیں تو روپے بھی دینا پڑیں گے۔ لہذا مال خانے سے ان کی چیزوں کا کچھ پتہ ہی نہ چلتا تھا۔

ایک بار میں بھی مجسٹریٹ کے پاس گئی۔ کہنے لگے "یہ بڈھا تو درد سر بن گیا ہے۔ کاغذ کیونکر ملیں گے۔ روپے ساتھ میں نہ ہوتے۔ تو کاغذ مل جاتے۔"

میں چپ چاپ لوٹ آئی۔

بڑے میاں کے بعد خالہ وزیری بیگم میرے تصور میں بھی لٹھیا ٹیکتی آئیں۔ ایک ہاتھ میں پان کی ڈبیا اور لٹھیا لئے اور دوسرا کسی کے کاندھے پر رکھے۔

"اے بیٹی وہ افسر مجھ سے کہنے لگا۔ مکان کا رقبہ بتاؤ۔ اے لو میں اندھی دھندی۔ رقبہ کیا جانوں یہ تو وہی بات ہوئی۔ اٹھو مردو کھاؤ کھیر۔"

ان کی بے تابی کا تو واقعی یہ عالم تھا کہ ایک دن دفتر آئیں میں نے کہا "خالہ منشی آجائے تو آپ کے کاغذات نکالوں۔"

کہنے لگیں "لے یہ تمہارا چپراسی جو آیا ہے۔"

—— وہ چپراسی نہیں تھا۔ ایک صاحب ملنے کے لئے آتے تھے۔ بہت معذرت کرتی رہیں کہ میاں معاف کرنا یہ تو اندھے کی لاٹھی ہے۔

ہم لوگ صرف ہنس سکتے ہیں۔

—— اس قسم کے بے شمار چہرے میری نظر کے سامنے آئے۔ ان چہروں پر بڑی زندگی تھی۔ بہت سی انہونی باتوں پر یقین تھا۔ زندگی سے پیار تھا۔

میں نے خود کو زندگی سے بہت قریب محسوس کیا۔

یہ قربت اور کہاں نصیب ہوگی۔ مجھے یہیں رہنا ہوگا۔ انھیں لوگوں کی خوشیوں اور انھیں کے دکھوں کو اپنانا ہوگا اور زندگی میرے چہرے پر بھی نشانات ثبت کرتی گزر جائے گی۔

—— لیکن کیا کبھی مجھے یہ خیال تو نہ آئے گا کہ یہ وقت جس میں روپیہ کی ٹکسال لگ سکتی تھی۔ چند خالاؤں سے عشق کرتے ہوئے گزار دیا گیا۔

کیا کبھی یہ سب کچھ بیہودہ تو نظر نہ آئے گا۔ بہت سے لوگ لڑکھڑا جاتے ہیں۔ بہت سے لوگ جو کبھی کسی خیال کو اپنے لہو کی سرخی دیتے ہیں۔ بعد میں اس کے ذکر سے بھی شرماتے ہیں۔

اور پھر مجھے امتیاز کا خیال آیا۔ امتیاز جسے اتنا بنانے کے باوجود ہم سب اس کی عزت کرتے تھے، جو اتنا بھلا آدمی تھا۔ جذباتی انداز میں سہی۔ لیکن ہر ہر قدم پر یہ سوچتا تھا کہ کیا یہ فیصلہ ان اصولوں پر پورا اترتا ہے، جو اس نے بہت پہلے سترہ برس کی عمر میں اپنے لئے متعین کر لئے تھے۔ امتیاز جو انتھک کام کر سکتا تھا۔ جس نے انتہائی دشمنی کے باوجود کالج کے الیکشن میں کچھ لوگوں کے لئے کام کیا تھا اور کہا تھا کہ ذاتیات کو ان معاملات میں نہ آنا چاہیئے۔ اور جس نے میرے سامنے کہا تھا۔

"میرے ان سے صرف اختلافات ہیں میں ان سے نفرت نہیں کرتا۔ کر ہی نہیں سکتا مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم سب ایک ہی ماں کی اولاد ہیں۔"

اور مجھے اپنی کمینگی پر سخت شرم آئی تھی کہ میں صرف ذاتیات میں الجھ کر ان سب سے کٹ گئی تھی۔

اور امتیاز نے میری مدافعت کرتے ہوئے کہا تھا۔"اس میں ابھی بہت انانیت ہے۔ بگڑا ہوا بچہ ہے نا۔ ہم سب نے اسے لاڈ میں بگاڑ دیا ہے۔"

اور میجر صاحب نے ناک چڑھا کر کہا تھا۔"سال بھر تک اس نے اس کالج میں حکومت کی ہے۔ اب میں اس کی سب لیڈری نکال دوں گا۔ بہت سر پہ چڑھا رکھا ہے تم لوگوں نے۔"

میرا تصور لیڈری کے خاتمے سے ہوتا ہوا امتیاز کی شادی تک جا پہونچا، اس کی شادی میں کتنی تفریح رہی تھی۔

ہم سب بس میں لد کر براتی بن کر دوسرے شہر میں پہنچے تھے۔ اور ہم لوگ بہت خوش تھے کہ اب جب ہم اس کے شہر جایا کریں گے تو اس کا اپنا گھر ہو گا جہاں ہم بالکل اپنایت محسوس کریں گے۔

اور اب چند دن گزرے وہ عدالت عالیہ کی محرابوں کے سائے میں مجھ سے ملا۔

"سناؤ امتیاز حسین۔ تمہارے شہر میں کیا حال ہے۔ کوئی نیا ہنگامہ برپا کرو۔ تاکہ ہم لوگ یہاں سے آئیں۔"

وہ باتیں کرتے کرتے ایک دم رُک گیا۔

"میں اب کوئی بات نہیں کر سکتا ـــــ کوئی کام نہیں کر سکتا۔ کسی مسئلہ پر کوئی بحث نہیں کر سکتا"

"کیا ہوا ؟"

اب میں کچھ نہیں کرتا۔ صرف گارنٹی پر مقدمے لڑتا ہوں۔ اور بہت بڑی سی فیس وصول کر کے آدھے پیسے کلکٹر افسر کو دے دیتا ہوں۔"

ـــــ یہ تم نے کیا کیا امتیاز حسین۔ تم تو ہم سب کے ساتھی تھے، ہم سب تمہاری عزت کرتے تھے۔ کالج میں بیٹھ کر ہم اصولوں کی اور اقدار کی بات کرتے تھے۔" میں اب کس منہ سے اقدار کی

بات کروں ۔ میں نے ہار مان لی ہے ۔ میں ماحول سے لڑتے لڑتے تھک گیا ہوں ۔ میں نے بھی وہی کیا ہے ۔ جو دوسرے کرتے ہیں ۔ میری بیوی اصولوں پر زندہ نہیں رہ سکتی تھی ۔ وہ روپیہ چاہتی تھی ۔ میں اُسے روپیہ لاکر دے دیتا ہوں ــــ اب ہمارا ایک گھر ہے اور ایک بچہ ہے ۔ اور خرچ کرنے کو روپیہ ہے ۔ میں نے اپنے سب قرضے اتار دیے ۔ معلوم ہوا کہ زندگی کی انتہا یہی تھی"

میں نے اپنے اس ساتھی کو جاتے ہوئے دیکھا میں نے دعا مانگی ۔ وہ لوٹ آئے ۔ وہ ہمارا ایک بہت ہی اچھا ساتھی تھا ۔ اس نے ہم میں سے کسی سے کبھی نفرت نہیں کی تھی ، وہ کہتا تھا ۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے ہم سب ایک ماں کی اولاد ہیں ــــ تو اب وہ اپنے بہن بھائیوں کو چھوڑ کر کہاں جا رہا تھا ۔ کیا اُسے ڈر نہ لگے گا ۔ تنہائی کاٹنے کو نہ دوڑے گی ۔

لیکن اب یہاں عدالت عالیہ کی سیڑھیوں پر بیٹھی میں کیا سوچ رہی ہوں ۔ جب کہ میرے دائیں اور بائیں نچلی عدالتیں بکھری پڑی ہیں ، کیا میں پست ہمت ہجوم سے گھبرا کر پناہ مانگنے یہاں آئی ہوں ۔

یہ کیا غم ہے ۔ جو ایک افعی کی مانند دل کو لپٹ گیا ہے ، یہ وہ غم نہیں جس میں شعلے کی لپک ہو ۔ کہ آئے اور چھوتا ہوا گزر جائے ۔ اور لمحہ بھر کی سوزش کے سوا کوئی نام و نشان نہ چھوڑے ۔ یہ بے نام سا غم تو یوں ہے جیسے کوئی انگارہ جزو بدن ہو کر رہ جائے ، اور چھٹائے نہ چھوٹے ــــ

اور جیسے ہم کسی صحرا میں تنہا کھڑے ہوں ۔ اور ہر سمت سے سنگ ریزوں کی بارش ہو ۔

اور کوئی ــــ کوئی ــــ پناہ گاہ نہ ہو ۔

سارا تن کھائیو کاگا

میں ہربرٹ ریڈ کی کتاب "غیر سیاسی سیاست" پڑھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس میں وہ مضامین جمع کئے گئے ہیں جو اس نے جنگ کے زمانے میں وقتاً فوقتاً لکھے تھے ـــــ ان سب لوگوں کی سیاست جنہوں نے قوم تعصب اور ملکی مفاد سے بالاتر رہ کر انسانی اقدار کے لئے جدوجہد کی۔

جب میں اور ابا میاں شام کو لوٹے تھے تو میں نے اپنی بہن سے دھاڑ کر کہا تھا۔

"سنو مینا میں ہربرٹ ریڈ کی کتاب لایا ہوں"

"لو اور سنو" ـــــ ابا میاں خفا ہو گئے ـــــ "یہ تو میں نے شیلف میں سے نکالی تھی"

ابا میاں سچ کہہ رہے تھے۔ کتابوں کو کھوٹے کھرے سے نکالنے میں ان کو کمال حاصل تھا۔

اور میری بہن بہت فخر سے کہہ رہی تھی۔ "ابا میاں تو دور سے کتاب کو دیکھ کر بتا سکتے ہیں کہ وہ کیسی ہے"۔

"لگے ہاتھوں کچھ اپنی بھی تعریف کر ڈالو" مجھے بھی غصہ آگیا۔

وہ اٹھ کر کہنیوں کے سہارے بیٹھ گئی "میں ـــــ میں ـــــ کتاب کی جلد چھو کر بتا سکتی ہوں کہ وہ کیسی ہے"۔

خفا ہو کر میں اپنے کمرے میں چلا آیا ـــــ

ابا میاں پکے چلے آتے —— "بھئی وہ کتاب ہے تو تمہاری ہی —— میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ شیلف میں سے نکال کر میں نے دی تھی۔"

ہربرٹ ریڈ کی کتاب کا پہلا پیرا میری نظر کے سامنے ناچ رہا ہے۔ اور میری بہن نے پردہ اٹھا کر مجھ سے کہا ہے۔

سنا تم نے ایک اخبار نے ۱۸۵۷ء کے غدر کے بارے میں ایک خاص نمبر نکالا ہے اور اس کو انقلاب نمبر کہا ہے۔ اس میں سب باغیوں کو انقلابی لکھا گیا ہے۔ بہت بچپن میں ایک بار ابا میاں نے ایک کتاب پڑھتے پڑھتے رک کر مجھ سے کہا تھا —— "وہ محب وطن جو ہار جائے وہ غدار ہے اور غدار جو جیت جائے، وہ محب وطن ہے۔"

مجھے یقین ہے اس وقت میری بہن نے اس بات کی سخت مخالفت کی ہو گی۔ اس وقت اس کے لیے سب سچائیاں عالمگیر سچائیاں تھیں۔ لیکن ذرا بڑے ہو کر یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی ہو گی۔

لیکن اس لمحے تم مجھ سے کیا کہلوانا چاہتی ہو —— جو تم کہلوانا چاہتی ہو، وہ تو میں ہرگز نہ کہوں گا تم اپنے مسائل اپنے پاس رکھو —— اور مجھے اپنے مسائل سے نپٹنے دو —— میرا امتحان سر پر آ رہا ہے اور میں بہت سی باتوں کے بارے میں خاموش رہوں گا۔

اگر ہر شخص اپنے اپنے مسائل سے سروکار رکھے اور دوسرے کی روح کو تنہا چھوڑ دے تو دنیا میں کتنے مسائل حل ہو جائیں۔

"کیا خیال ہے تمہارا۔ میرے بہت ہی پیارے بھائی، کیا تاریخ نئے سرے سے نہ لکھی جائے گی۔"

"بیٹا تمہیں تاریخ کی اتنی فکر کیوں رہتی ہے۔ تم اپنی ذاتی تاریخ کی فکر کرو —— چھوڑو ان باتوں کو —— اور مجھے کام کرنے دو۔ یہ میرے مسائل نہیں۔"

لیکن وہ جو میرا مسئلہ نہیں۔ مجھے یاد آ رہا ہے اور مجھے اس کی ماں یاد آ رہی ہے۔ جو میری ماں کے برعکس چیخ چیخ کر بین کر رہی تھی —— اور ہاں اس کی ایک بہن بھی تو تھی —— وہ

بھی شاید اسے اتنا ہی چاہتی تھی، جتنا میری بہن مجھ کو ـــــ

"تم کچھ سوچ رہے ہو۔ اس لئے میں چلتی ہوں۔ جب تم کسی نتیجہ پر پہنچ چکو تو مجھے بلا لینا ـــــ بات کر لینے سے ذرا غم ہلکا ہو جاتا ہے۔" اور وہ گنگناتی ہوئی چلی گئی۔

آج کل وہ دن بھر گھر پڑی رہتی ہے۔ کام کاج کرنا اس کے بس کا روگ نہیں۔ وقتاً فوقتاً وہ کہیں ملازمت کر لیتی ہے اور کوئی ملازمت چھ مہینے سے زیادہ نہیں کر سکتی۔ ایک بار جب اس نے سال بھر تک ایک ہی جگہ کام کیا۔ تو ہم سب بہت مرعوب ہوئے ـــــ یعنی حد ہے بھئی ـــــ

"تم یہ کام کب چھوڑ رہی ہو" ـــــ میں نے پوچھا۔

"کسی سے کہنا مت ـــــ میں آج استعفا دے رہی ہوں۔"

میں نے حیرت سے سوچا کہ مجھ میں اور میری بہن میں بہت زبردست یگانگت ہے کہ ایک دوسرے کا مستقبل جان جاتے ہیں۔

سخت بوہیمین تھی۔ کبھی کبھار تو صورت حال ایسی خوفناک ہوتی کہ بس کیا کہیے۔

میرا امتحان ختم ہو چکا تھا اور کالج کی طرف سے میری یہ ڈیوٹی لگی تھی۔ کہ میں ایک غیر ملکی مہمان کو لاہور کی سیر کراؤں۔

"سنا ہے تمہارے ہاں کافی ہاؤس ہے۔"

"ہے تو ؟" میں نے مردہ دلی سے کہا۔

معزز مہمان کو کافی ہاؤس کی طلب لگی۔ ابھی ہم کافی ہاؤس کی سیڑھیوں پر ہی تھے کہ میری بہن اپنے دوستوں کے ساتھ آتی نظر پڑی۔ اس کے اپنی طرح کے ان گنت دوست تھے۔ میں نے گننے کی کوشش کی ـــــ دو ملیشیا کی شلواریں ـــــ دو رنگین کے ہاں کے سوٹ ـــــ دو کھدر کے پاجامے ـــــ اور خود میری اپنی بہن کھدر میں ـــــ صفاکٹ چہرے ـــــ فرنچ کٹ داڑھی ـــــ الجھے ہوئے بال ـــــ بہت نفیس مانگ ـــــ ہائے یہ میری بہن کا دل ہے کہ کباڑ خانہ ـــــ جہاں اتنا بہت کچھ سما جاتا ہے۔

"کمال ہے بھئی ـــــ تم کس قدر کمینے ہو ـــــ خود کافی ہاؤس جا رہے ہو، صبح میں نے ایک روپیہ مانگا تو صاف مکر گئے۔ کہ ہے ہی نہیں۔"

خود اپنے کمینے پن کا یہ حال تھا کہ جان بوجھ کر انگریزی میں دھاڑی۔ جانتی تھی کہ غیر ملکی ساتھ ہے سنی ان سنی کر کے میں اندر چلا گیا۔ وہ اُوپر جا کر بیٹھ گئی۔ غیر ملکی مہمان ہنسی سے بے تاب تھا۔

"یہ تمہاری بہن ہے۔"

اب کوئی اپنی بہن کو کیسے عاق کر دے۔ اولاد کو تو سنا ہے عاق کیا جا سکتا ہے۔ کاش میں اپنی بہن کو کاغذ پہ ہی عاق کر سکتا۔

"کاغذ پہ عاق کرنے سے کیا ہوتا ہے" ـــــ اس نے کہا تھا۔ "بہن تو بہن ہی ہے جس سے ماضی مشترک ہے اور حال شرک ہے اور جب تک ان سب میں شراکت باقی ہے۔ مستقبل بھی ساجھا ہے۔" میں نے کہا۔ نا۔ وہ بڑی کمینی تھی۔

"مجھے اپنی بہن سے ملواؤ۔" فرمائش ہوئی ـــــ لو اور سنو ـــــ وہ اس قدر شرمندہ کروائے گی مجھے۔

"کیا کیجئے گا۔ مل کر۔ وہ بہت بیکار ہے۔"

"تم لوگ یہاں آجاؤ۔" بینا نے ہمارا پیغام سن کر اُوپر کی بالکنی سے دھاڑ کر کہا۔ سارا کافی ہاؤس بالکنی کو تک رہا تھا۔

کم سے کم ان لوگوں کو تو اب تک اس کی ان حرکتوں کا عادی ہو جانا چاہیئے تھا۔

"تم نے مجھے روپیہ نہیں دیا تو کیا ہوا ـــــ دیکھو ہم لوگوں کے پاس کتنے پیسے ہیں ـــــ" اس نے چونی نکال کر میز پہ رکھی۔ اس کے سب دوستوں نے اپنی اپنی جیبیں ٹٹولیں ـــــ کل تین روپے پندرہ آنے ہوئے۔ اس نے فخر سے چاروں طرف دیکھا۔

"ہم تمہیں ـــــ اور تمہارے مہمان کو کافی میں نہلا سکتے ہیں۔ کیا سمجھے؟ اور ایک پیکٹ قینچی کے سگریٹوں کا بھی آسکتا ہے۔"

وہ بے چارہ بہت حیرت سے دیکھ رہا تھا اور آؤ اُوپر ——— میں نے دل ہی دل میں اس مہمان کو گالیاں دیں ———

چلتے وقت اس معزز مہمان نے جھک کر میری بہن سے کہا ——— " تم یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہاری باتیں سمجھ نہ سکا۔ لیکن میں ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ اگر اجازت ہو تو؟"

" دو سوال پوچھیئے۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔

" تم ہم لوگوں سے اتنی نفرت کیوں کرتی ہو۔"

" نفرت ——— کس نے کہا ہم تم لوگوں سے نفرت کرتے ہیں۔ نفرت تو ہمیں تمہارے اس نظام سے ہے۔ جس کو تم زبردستی ہم پر مسلط کرنا چاہتے ہو" ——— وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ "میں تمہیں ایک بات اور بتا دوں ہمیں موت نہیں آئی۔ ہم ابھی زندہ ہیں ——— اور ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ کیا سمجھے ؟"

اور جب ہم رخصت ہوئے تو میری بہن دھاڑی۔ "پارٹنر! کیا غیر ملکیوں کو لاہور کی سیر کروانا بھی تمہارے نصاب میں شامل ہے۔"

اور جب غیر ملکی نے حیرت سے پہلے مجھے اور پھر میری بہن کو دیکھا۔ تو بہت لاپروائی سے بولی۔

" یہ میرا بھائی پڑھ لکھ کر ڈبو رہا ہے۔" وہ بیچارا پھر بھی کچھ نہ سمجھا۔ اپنی نیلی نیلی آنکھیں جھپکتا رہا۔

" نہیں سمجھے ؟ ——— یہ مقابلے کا امتحان دے رہا ہے اور میں یہ پوچھنا چاہ رہی ہوں کہ آیا یہ سیر و تفریح بھی مقابلے کے امتحان کا ایک حصہ ہے ؟"

وہ بے چارہ کافی ہاؤس سے اٹھ کر بھی خاموش ہی رہا۔ جب میں نے اُسے میوزیم دکھانے کی پیش کش کی تو اس نے کندھے اُچکا کر کہا۔

" بس دیکھ لیا شہر"

اور شام کو گھر پہنچ کر میں نے اپنی بہن سے لڑنے کی کوشش کی ۔

آخر تمہیں کو دنیا بھر کی زندگی اور موت کی فکر کیوں کھائے جا رہی ہے "

وہ مستقل کوئی کتاب پڑھے چلی جا رہی تھی ۔ اس پر مجھے اور بھی غصہ آیا ۔

لیکن اس وقت مجھے غصہ نہیں آ رہا ۔ غصہ کھو گیا ہے ۔ صرف یادیں رہ گئی ہیں ۔ میری زندگی میری اپنی زندگی ہے ۔ اور میری موت میری اپنی موت ہے —— تو پھر وہ ایک چہرہ مجھے کیوں یاد آئے جا رہا ہے ۔ وہ معصوم چہرہ —— جس پر موت کا درد تھا ۔ اس ماں کا چہرہ —— جس کے بین میں موت کا درد تھا اور وہ بہن —— جو موت کے ہاتھوں مسخ شدہ چہرے کو پیار کر رہی تھی ۔

میری زندگی میری اپنی زندگی ہے ۔ اور میری موت میری اپنی موت ہے اور میں نے اپنی بہن سے چیخ کر کہا تھا ۔

" کیا تم نے دنیا بھر کے ضمیر کا ٹھیکہ لیے رکھا ہے ۔ "

اس نے آہستہ سے کتاب ایک طرف رکھ دی ۔ اور کہا تھا ۔ " نہیں —— اور ہاں لیکن آج میں لڑنے کے موڈ میں نہیں ہوں ۔ میرا موڈ بہت خراب ہے ۔ "

" کیوں خراب ہے ؟ " آخر وہ میری بہن تھی ۔

" اوہ ! آج میں ایک بہت بور جگہ اُلجھ گئی ۔ "

" تم تو کافی ہاؤس میں تھیں ۔ "

" تمہارا کیا خیال ہے ۔ میں دن بھر وہیں بیٹھی رہتی —— عزیزِ من —— زندگی مختصر ہے —— یہی سوچ کر میں ایک پکنک پر چلی گئی ۔ اور وہاں بہت غلط لوگ تھے ۔ سخت بور ہوئی ۔ "

یہ میری بہن بھی عجیب چیز ہے ۔ نہ جانے ایک دن میں یہ کن کن لوگوں سے مل لیتی تھی ۔

" میرا بھی موڈ خراب ہو گیا ۔ " کوئی ڈاکٹر صفدر تھے اور مسز صفدر —— جن کے چکر میں وہ الجھ گئی تھی ۔

" اس قدر عمدہ لوگ ہیں کہ بس کیا کہیے ۔ اپنا ایک دوست بلوچستان کے دورے سے لوٹا ہے ۔ اس نے کہا کہ وہاں اسکول بہت کم ہیں ۔ غربت بہت زیادہ ہے اور بچے پڑھ نہیں سکتے ۔ اس پر

ناک چڑھا کر ان ڈاکٹر صفدر نے کہا۔ کہ جو پڑھتے نہیں وہ اپنی کوتاہی سے نہیں پڑھتے اور جو غریب ہیں انھیں خود ہی غربت سے پیار ہے جب میں نے ایف۔ ایس۔ سی کا امتحان دیا۔ میرے پاس صرف ڈیڑھ سو روپے تھے اور اب میں ڈاکٹر ہوں۔ میری اپنی کوٹھی ہے۔ جس کی نچلی منزل میں میں نے اپنا ذاتی ہسپتال کھول رکھا ہے اور اُوپر کی منزل میں میری رہائش ہے۔"

"ان کے پاس ایک لمبی سی کار بھی ہے۔" مینا نے آہ بھری۔

"تمہیں کیوں تکلیف ہو رہی ہے؟"

"ہاں۔ ہے تو —— ہمارا وہ دوست جو ہم سب کو پکنک پر لے گیا تھا۔ اس نے جانے کے لئے تو ٹیکسی کا انتظام کر دیا تھا۔ لیکن وہ ٹیکسی والا رکنے کو تیار نہ ہوا۔ اور واپسی پر ٹیکسی ملی نہیں —— میاں بیوی دونوں مستقل اُسے ایک عدد موٹر کا مالک نہ ہونے کا احساس دلا رہے تھے۔ وہ بیچارا اتنا اچھا آدمی ہے کہ ذرا جو سمجھا ہو۔ معذرت کرتا رہا کہ موٹر مانگی تو تھی —— ملی نہیں۔"

اور میری بہن اپنی کتاب اٹھا کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی تھی۔

دوسرے دن ناشتہ پر حسب معمول پنچ پڑی تھی۔ ٹوسٹ پر مارملیڈ لگاتے ہوئے میری بہن نے امی سے کہا۔

"اوہ —— امی جان کل ایسے غضب کی خاتون سے ملاقات ہوئی کہ کیا کہیے۔"

امی نے فوراً کان لگائے۔

"ہائے ایسی آئیڈیل بیوی ہے کہ کیا کہیے۔"

اس پر ابا میاں ذرا چوکنے ہوئے۔

"سنیئے خواتین و حضرات!" مینا نے مکّہ میز پر مارا" وہ اس صدی کی آئیڈیل بیوی کہہ رہی تھی۔ صفدر کو ہری مرچ بہت پسند ہے۔ اور مجھے بھی۔ صفدر تین بجے تک ہسپتال میں کام کرتے ہیں۔ اور میں بھی —— شادی سے پہلے میں پردہ کرتی تھی۔ جب میں نے شادی کے بعد پردہ اتارا تو میرے رشتہ داروں نے قتل کی دھمکی دی تھی۔ لیکن صفدر نے کہا۔ برقعہ

کی کوئی ضرورت نہیں ۔ یہ ان سائنٹیفک ہے ۔ بس سادگی ہونی چاہیئے ۔ اور میں بھی ـــــ صفدر کو فیشن ناپسند ہے اور مجھے بھی ۔"

"غضب یہ ہوا کہ میں نے کہا ۔ آپ کے بالوں کا سٹائل تو بہت ماڈرن ہے ۔"

"صفدر کو دو چوٹیاں ناپسند ہیں ۔"

"لیکن یہ پونی ٹیل تو بہت فیشن ایبل چیز ہے ۔"

"اس میں یہ فائدہ ہے کہ بال جلدی سے باندھ لیئے ۔"

"مینڈھیاں گوندھ لی جائیں تو بہت ہی فائدہ ہے ۔ آٹھویں دن کھول کر سرسوں کا تیل لگا کر پھر گوندھ لیں ۔ اُف وہ تیل تو آپ نے بہت خوشبودار لگا رکھا ہے ۔" میں نے ان کے بال سونگھنے کی کوشش کی ۔

بیگم صفدر ذرا نہیں جھینپیں ۔ میں کینہ پن پر اتر آئی ۔" یہ آپ کی سیک شرٹ ـــــ اس میں تو جسم کے تمام خطوط اور زاویے نمایاں ہو جاتے ہیں ۔"

"اس میں انسان بہت چاق و چوبند ہو کر کام کر سکتا ہے ۔" اس نے سائنٹفک وضاحت کی ۔

"بجا ہے ۔ اور گر بھی سکتا ہے "ـــــ میں نے آہستہ سے کہا ۔" اور اسلام کے سادگی کے اصولوں کے عین مطابق ہے ۔ جب کہ جاگیریں ختم کرنا خلاف اسلام ہے اور بچوں کے لیئے دُور اُفتادہ علاقوں میں اسکول کھولنا خلاف اسلام ہے ۔ اور یہ آپ کا نائیلون کا دوپٹہ ۔ دوپٹہ تو شاید ستر پوشی کے لیئے بنا تھا ۔"

وہ پھر بھی نہیں جھینپیں ۔

"ہاں اس اُونچی ایڑی کے جوتے کے معاملہ میں آپ دھوکہ کھا گئیں ـــــ آپ کو شاید یہ نہیں معلوم کہ اُونچی ایڑی کے جوتے ڈرائنگ روم کی چیز ہیں ۔ پکنک پر فلیٹ جوتے پہننا فیشن کی انتہا ہے "ـــــ میں نے اپنے کینوس کے اسٹیلین وضع کر کے نوکیلے شوز ان کی ناک میں گھسانے کی کوشش کی ـــــ اس پر وہ غصے سے سُرخ ہو گئیں ۔ اور ڈاکٹر صفدر نے کڑک

کر کہا ہے یہ کیسی اسلامی مملکت ہے۔ جہاں جاگیریں ختم کر کے اسکول کھولنے کی تجاویز پر بحث ہوتی ہے"
—— اور میرا وہ دوست جو ابھی ابھی بلوچستان کے دورے سے لوٹا تھا۔ چپ ہو گیا
اور بیگم صفدر نے کہا۔" میں بھی۔"

واللہ کیا عورت ہے۔ کیا میاں کا بت بنا رکھا ہے اور میرے دوست نے چپکے سے مجھ سے کہا۔" اس عورت کے لئے دراصل ڈاکٹر صفدر امن کا سمبل ہے" —— ڈاکٹر صفدر نے اسے چولہے چکی سے نجات دی ہے نا۔ بھاتما سے شادی کرتی، تو کھانا پکانا پڑتا۔ ڈاکٹر صفدر سے شادی کی۔ تو موٹر چلانا سیکھ لی۔ سنا تھا کہ بیگم صفدر مال روڈ پر زن سے موٹر چلاتی گزر جاتی ہیں۔

پھر ڈاکٹر صفدر نے ہمیں ہری مرچ کی افادیت پر ایک لکچر دیا کہ ایک ہری مرچ میں دو مالٹوں کے برابر وٹامن ہوتا ہے آل پڑھیں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر انھیں دیکھا —— اور اپنے ایک دوست کے کہنی ماری۔ کہ لانا وہ سامنے کھیت سے ہری مرچیں۔ اور ڈاکٹر صفدر نے کہا" ہاں میں تو ہر کھانے پر پانچ چھ ہری مرچیں کھاتا ہوں۔"

اور بیگم صفدر نے کہا" میں بھی۔"

میں اور میرا ایک دوست ہری مرچیں توڑ کر لائے اور واپسی پر میں نے کہا۔

"پارٹنر! میں تو کھانا اکثر گول کر جاتی ہیں۔ اب چھ عدد ہری مرچیں کھا لیا کروں گی۔ اور یہ سمجھوں گی کہ ایک درجن مالٹے کھا لیے۔"

" مالٹے ہی کھا لینا۔"

" ایک درجن مالٹے کھانا تو بہت مشقت کا کام ہے۔"

میری بہن کو مالٹے کھانے سے سخت نفرت تھی کون ان کو کاٹے چھیلے۔ اگر امی کاٹ دیتیں تو کہتی۔ ان کو کھانا بھی کیا کم مصیبت ہے۔ اس کے خیال میں تو دنیا بھر کے کھانے کوٹ کاٹ کر گولیاں تیار کر لی جائیں۔ تو بہت تفریح رہے۔ کہ رکھ لیں جیب میں اور جہاں شام پڑی۔ اور

جی چاہا۔ کھالیں۔

"تم ہر چیز جیب میں کیوں رکھنا چاہتی ہو"میں نے ایک بار پوچھا تھا۔

"اس لئے کہ زندگی اک سفر ہے عزیز من!"

——— اور ناشتہ کی میز پر وہ غل مچا رہی تھی جب ہم ہری مرچیں توڑ کر لائے۔ تو رستے میں میرے دوست نے کہا۔

"کہیں ایسا غضب بھی نہ کر ڈالنا۔ کہ جیب میں ہری مرچیں رکھنا شروع کر دو۔ کہ جہاں وقت ہوا، اچھے ہری مرچیں کھانا سمجھ کر کھالیں تمہارے گھر میں تو مرچ ویسے ہی بہت کم کھائی جاتی ہے۔ پیچش ہو جائیگی پیچش بہت تکلیف دہ چیز ہے۔ خاص طور پر اگر وہ پرانی ہو جائے۔"

اس پر میں نے اسے بتایا کہ مجھے زندگی بھر کبھی پیچش کی تکلیف نہیں ہوئی۔ حالانکہ میں اس قدر اوٹ پٹانگ کھانا کھاتی ہوں۔

"اگر تم نے ڈاکٹر صفدر کے نسخہ پر عمل کر لیا تو ضرور ہو جائے گی۔ اس کا تو کام ہی یہی ہے کہ پہلے لوگوں کو بیمار کرے اور پھر اپنے ہسپتال بلوائے۔"

——— خیر یہ بات الگ تھی۔ مطلب یہ ہے کہ آپ اب ہر کھانے پر مجھے ہری مرچیں دیا کیجئے

——— اوہ ——— مطلب کی بات تو رہ ہی گئی ——— میں تو یہ بتا رہی تھی کہ بیگم صفدر کس قدر بچی ورتا ہیں ——— جب ہم سب لوگ تھکے ہارے بس سٹاپ کی طرف جا رہے تھے۔ تو بیگم صفدر نے کہا۔" صفدر کو تو بس میں بیٹھ کر ابکائیاں آتی ہیں، اور مجھے بھی۔"

اس پر ڈاکٹر صفدر نے کہا۔" ہاں وہ دھواں مجھے ناگوار گزرتا ہے۔"

"اور مجھے بھی۔" بیگم صفدر نے کہا۔

اللہ اکبر نازک مزاجی کی حد تھی۔ اس پر میں نے ان سے کہا۔

"اپنی تو نصف زندگی بس میں گزر گئی ہے۔"

"اور بقیہ نصف؟"

"وہ سڑک پر پیدل چلتے ہوئے کیونکہ بعض اوقات بس کے لئے کرایہ بھی نہیں ہوتا۔"
اس پر بیگم صفدر نے مجھے حیرت سے دیکھا —— اور میرا وہ دوست جو ہم سب کو پکنک پر لے کر گیا تھا ہنسنے لگا۔

"ہم سب لوگ بہت غریب ہیں" —— میں نے بیگم صفدر کی معلومات میں اضافہ کیا۔
اور ہمارے میزبان نے دانت نکال کر تائید کی۔ اور کہا۔ "بہت کوشش کی کہ موٹر مل جائے لیکن مل رہا نہیں۔"

یہ بات اس نے یوں کہی گویا پیسے ادھار لے کر بگلے کا پیکٹ خریدنے کے لئے گیا ہو۔ جو ملا ہی نہیں۔

آمدم برسر مطلب —— میری بہت ہی پیاری امی —— آپ کو دراصل ایسی بیوی ہونا چاہیئے کہ جیسی بیگم صفدر —— کہ میاں کہے میں تو اس سیاہ رنگ کو سفید سمجھ رہا ہوں، تو بیوی کہے —— میں بھی —— یہ کیا کہ آپ ہر وقت لڑتی رہتی ہیں۔ اگر ابا میاں شمال کو چلیں تو آپ جنوب کو چلتی ہیں۔ وہ مشرق کا رُخ کریں، تو آپ مغرب کا —— ہائے بیگم صفدر —— جو کہ ڈاکٹر صفدر کی "اصلی تے وڈی" بیوی ہے۔ سب بیویوں کو ایسی بیویاں ہونا چاہیئے۔

پھر میری بہن سائیکل سنبھال کر چل دی اور باہر سے پکاری۔" امی ذرا پانچ روپے تو دیجئے گا۔"

"کیوں؟"

"سائیکل کی ہوا نکل گئی ہے" —— جیسے سائیکل میں ہوا بھروانے کے لئے پانچ روپے سے کم کیا چاہیئں۔

تین چار روز بعد وہ پھر ناشتہ کی میز پر غل مچاتی چلی آئی۔

"سنا آپ نے خواتین و حضرات! ڈاکٹر صفدر کو ایک عدد لیڈی ڈاکٹر چاہیئے۔ اپنے ہسپتال کے لئے۔"

"تمہیں کیسے خبر؟"

"یہ اخبار دیکھو۔" اس نے اخبار میرے منہ پر مارا۔

پیج میج اشتہار تھا اور آخر میں لکھا تھا۔ عرضیاں اس پتہ پر پہنچ جانی چاہئیں۔ ڈاکٹر صفدر

ایم بی بی ایس میڈیکل سپرنٹنڈنٹ۔ صفدر ہسپتال۔ لاہور

"یہ شخص خود کو میڈیکل سپرنٹنڈنٹ لکھ کر کس قدر خوش ہوتا ہے۔" —— میری بہن نے

چائے کی پیالی میری طرف کھسکائی۔ "ذرا ہماری چائے بھی بنا دو" —— سبھی کام مجھی سے کروائی تھی

لیکن یہ سب باتیں مجھے کیوں یاد آ رہی ہیں میں ہربرٹ ریڈ کی کتاب کیوں نہیں پڑھتا

—— میں سی ایس پی کی تیاری کیوں نہیں کرتا —— ایک چہرے کی یاد میرے ساتھ ساتھ

یہاں تک چلی آئی ہے۔ لیکن وہ ایک چہرہ نہیں۔ بہت سے چہرے تھے۔ موت کے درد

اور دکھ میں پلٹے ہوئے جسم وجاں۔

لیکن میں اپنے جسم وجاں کے زیاں کی فکر کیوں نہ کروں۔

اور میرے بھی ایک جانب سکھ ہے اور ایک جانب دکھ ہے۔ ایک سمت شان وشکوہ

ہے۔ پرسکون گھر ہے۔ محبتوں کی حدت ہے اور حسن کی خنکی ہے۔ دنیا بھر کے سکھ ہیں ——

اور دوسری سمت غموں کے تپتے ہیں —— غریب الوطنی ہے —— ناتمام محبتوں کے رنج والم

ہیں —— اور دنیا بھر کے دکھ ہیں۔

میرے اپنی بہن سے شدید نظریاتی اختلافات ہیں۔ ہم ان اختلافات کا ذکر بہت کم

کرتے ہیں اور ایک بار اس نے مجھ سے کہا تھا۔

"فاروق مصطفےٰ زندگی میں کبھی نہ کبھی وہ لمحہ ضرور آئے گا۔ جب تم جو یونیورسٹی کے

ذہین ترین طالب علم ہو۔ ٹھٹک کر خود سے پوچھو گے —— میں کس طرف جاؤں؟ یہ لمحہ مجھ

سے کیا چاہتا ہے؟ —— مجھے اس ان دیکھے لمحے سے عشق ہے۔ اور میں اس لمحے کا انتظار

کر رہی ہوں۔ لیکن مجھے کوئی جلدی نہیں —— اس لمحے کا آنا برحق ہے اور جسم وجاں کی تسکین

کو تو یہ بھی بہت ہے!!!"

کیا وہ لمحہ جس کا میری بہن کو انتظار تھا۔ آگیا کیا میں خود سے پوچھوں کہ یہ لمحہ مجھ سے کیا چاہتا ہے۔

مجھے سی ایس پی کا امتحان دینا ہے۔ اور اگر میں نے اس لمحے کے تقاضے پورے کر دیے تو زندگی کے چھوٹے چھوٹے سکھ مجھ سے چھن جائیں گے اور میں کسی دور افتادہ ضلع میں چلا جاؤں گا۔ اسسٹنٹ کمشنر ہو کر نہیں۔ معمولی جونیئر لیکچرر کے طور پر ـــــ اور جونیئر لیکچرر کے گھر میں کتابیں ہوں گی یا خاک۔

لیکن اس بچے کا اتنا خوب صورت چہرہ تھا اور اُسے ایک غیر ملک کی بنی ہوئی لمبی سی کار کچلتی ہوئی گزر گئی تھی، سٹیرنگ وہیل پر بیٹھے ہوئے شخص نے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔

خاک و خون میں لتھڑا وہ بچہ تھا۔ اور اس کی مٹھی میں ایک پیسہ تھا۔ جو اس نے اپنی ماں سے رو رو کر لیا تھا۔ اور وہ اس سے کچھ خریدنے کے لئے جا رہا تھا۔

"منے! تم کیا خریدنا چاہتے تھے" ـــــ میں نے رک کر پوچھا ـــــ لیکن اس طویل و عریض موٹر کے مالک نے پلٹ کر نہیں دیکھا ـــــ اور اس بچے کی ماں تھی۔ باپ تھا اور بہن تھی۔

ہم اُسے قریب ترین ہسپتال لے گئے۔ اور وہاں ڈاکٹر صفدر کی نگرانی میں وہ مر رہا تھا۔

"اسے میو ہسپتال کیوں نہ لے جائیں" میں نے مشورہ دیا۔

"کیوں ـــــ یہاں سب کچھ ہے"

ہاں ـــــ یہاں سب کچھ ہے۔ لیکن ڈاکٹر نہیں ـــــ اور اس بچے کی حالت خراب ہے اسے مملکت خداداد پاکستان کے سب سے بڑے ہسپتال میں ہونا چاہیئے۔

میری بہن نے کہا تھا ـــــ بچے مستقبل ہیں بچے نئی صبح کا پیام ہیں۔

اور بالآخر ڈاکٹر صفدر آئے۔ میں نے کہا ـــــ "اس کی حالت خراب ہے۔ اگر آپ کچھ کر سکتے ہوں تو کیجئے۔ ورنہ ہم اسے لے جائیں۔"

"کوئی ایسی خراب بھی نہیں۔"

—— ہم سب برآمدے میں فرش پر بیٹھ گئے۔ وہاں بہت سی عورتیں فرش پر بیٹھی تھیں اور ڈاکٹر صفدر کا ڈسپنسر ان سب کو اے پی، سی کی ایک ایک آنے والی گولیاں پیس پیس کر ڈیڑھ ڈیڑھ روپے میں دے رہا تھا اور ان کے برقعوں میں پیوند لگے تھے اور میری بہن نے بتایا تھا۔ ڈاکٹر صفدر کی بیوی فرینچ سلک کی ٹیک شرٹ پہنتی ہے۔ اور نائیلون کے دوپٹے اوڑھتی ہے اور پکنک پر جاتے وقت اونچی ایڑی کے سینڈل پہنتی ہے اور پونی ٹیل بناتی ہے۔

بارش شروع ہو گئی۔ اور ڈاکٹر صفدر کی طویل وعریض کار برساتی میں کھڑی ہے اور ڈاکٹر صفدر اپنے ملازم سے کہہ رہے ہیں۔ اس پر جلدی سے کچھ ڈال دو۔ نیا پالش خراب نہ ہو جائے اور یہ سب ہدایات دینے کے بعد وہ بہت اطمینان سے میرے قریب آتے ہیں۔

"بچے کی حالت خراب ہے۔ آپ اُسے میو ہسپتال لے جایئے۔ اور یہ میرا بل ہے۔"

کاغذ کے اس چیتھڑے کو ہاتھ میں لے کر میں نے چاروں طرف دیکھا۔ لیکن کوئی موٹر نظر نہیں آرہی۔ وقت کم ہے اور ڈاکٹر صفدر کی موٹر برساتی میں غلاف پہنے کھڑی ہے۔

"آپ تکلیف کیجئے گا" —— میں نے ان سے کہا۔ "معاف کیجئے گا۔ مجھے تو اور بھی بہت سے کام ہیں۔"

"تو ذرا شوفر سے کہہ دیجئے۔"

"کیا آپ اسے جانور سمجھتے ہیں۔ دن بھر موٹر چلاتا رہا ہے۔ یہ اس کی چھٹی کا وقت ہے۔"

"تو پھر مجھے اجازت دیجئے۔ میں ابھی بچے کو ہسپتال پہنچا کر آپ کی موٹر واپس دے جاؤں گا۔"

"کیا آپ مجھے اتنا احمق سمجھتے ہیں۔ اپنا رستہ ناپیے۔ مجھے کیا معلوم آپ کون ہیں۔ بڑے آئے موٹر مانگنے والے —— لے کر چلتے بنیں۔ تو میں کیا بگاڑ لوں گا۔"

میں نے ان سے یہ نہیں کہا —— کہ میں اس ملک کے سب سے بڑے کالج کی سٹوڈنٹس یونین کا صدر ہوں۔ وہ میرے پرنسپل سے تصدیق کر سکتے ہیں۔ میں یونیورسٹی کا ذہین ترین طالب علم ہوں۔ وہ میری بہن سے پوچھ سکتے ہیں۔

"تو مجھے ٹیلیفون کرنے کی اجازت دیجئے"

"ٹیلیفون کو تالا لگا ہے۔"

اس قسم کے تالوں کی کنجی میرے پاس نہیں تھی۔ میں نے ان سے یہ بھی نہیں کہا کہ آپ کی بیوی موٹر چلا سکتی ہے اور وہ میری بہن کو جانتی ہے ـــــ اپنی بہن کا ذکر کرنا مصیبت کو دعوت دینا تھا ـــــ میں اندھا دھند دوڑتا سڑک پر آیا ـــــ اور جو پہلی موٹر نظر آئی اُس کو ہاتھ کے اشارے سے روک لیا ـــــ بہت چھوٹی سی کھٹارا موٹر تھی ـــــ بہت بڑا ـــــ نفیس انسان تھا ـــــ لیکن جب وہ موٹر ڈاکٹر صفدر کی بڑی سی چمکیلی موٹر کے پاس آکر رُکی (جس پر غلاف چڑھا تھا) تو وہ بچہ دم توڑ چکا تھا۔ اس کی ماں بین کر رہی تھی ـــــ اور اس کی بہن اپنے بھائی کی لاش سے لپٹی ہوئی تھی ـــــ وہ شاید اس سے اتنا ہی پیار کرتی تھی۔ جتنا میری بہن مینا مجھ سے ـــــ

ڈاکٹر صفدر جیت گئے تھے۔ میں ہار گیا تھا۔ موت جیت گئی تھی۔ زندگی ہار گئی تھی۔

اب میں تنہا ہوں۔ صرف ایک لمحہ میرا رفیق ہے۔

ـــــ ایک غیر ملک کی کار اس بچے کو کچلتی چلی گئی تھی۔ اور ایک میرے ملک کے ڈاکٹر کے سامنے وہ بچہ مر گیا تھا۔

کیا یہ دونوں کبھی پلٹ کر دیکھیں گے ـــــ کیا یہ کبھی کسی لمحہ کے ساتھ تنہا ہوں گے۔ جب خود سے ایک سوال پوچھیں گے۔

مجھ میں اور میری بہن میں کسی یگانگت ہے۔ ہم ایک دوسرے کے مستقبل کا حال جان جاتے ہیں۔ اس نے کہا تھا۔ "دیر سویر وہ لمحہ تو آ ہی جاتا ہے۔ ہر شخص کی زندگی میں آجاتا ہے۔ اور تم تو میرے اپنے بھائی ہو ـــــ اس لمحہ کا آنا برحق ہے۔" ـــــ

کیا اسے علم ہے۔ کہ وہ لمحہ آچکا ہے۔ اور میں اپنی بہن مینا کا بھائی اس لمحے تنہا ہوں۔ اک سمت سکھ ہیں اور اک سمت دکھ ہیں۔

اور میری بہن گنگناتی ہوئی میرے کمرے کی طرف آرہی ہے۔

"سارا تن کھائیو کاگا"

"چن چن کھائیو ماس" ـــــ میں نے زیرِ لب تکمیل کی۔ اور وہ سب کتابیں جو مقابلے کے امتحان کی خاطر خریدی تھیں۔ اٹھا کر الماری میں بند کر دی ہیں

اور بینا نے ـــــ سارا تن کھائیو کاگا، گاتے گاتے پردہ اٹھا کر جھانکا ہے۔ اور خالی شیلف دیکھ کر وہ بے غیرتی سے ہنس دی ہے

ـــــ لمحہ گزر رہا ہے۔ اور میں تنہا ہوں۔

"کس قدر ڈھیٹ ہو تم" ـــــ میں نے چلا کر اس سے کہا۔

"کس قدر نفیس انسان ہو تم ـــــ آخر میرے بھائی ہو نا ـــــ" ـــــ اس نے لفظ میرے پر زور دیا۔

نصاب کی کتابیں قید کی جا رہی ہیں۔ لمحہ گزر چکا ہے۔ اور میں تنہا نہیں۔ !!!

نیا شہر

سنا ہے کبھی زندگی پریوں کی دنیا کی طرح حسین تھی۔ اس میں قوس قزح کے سے رنگ تھے۔ جھلمل کرتے ہوئے ـــــ اور سدا بہار پھول تھے۔ وہ بس مسکراتے ہی رہتے۔ کوئی شہزادی ہنستی تو اس کے منہ سے پھول جھڑتے ـــــ اور جب وہ روتی تو اس کے آنسو موتی بن جاتے۔ ایسے موتی کہ بس ایک موتی بھی اگر کسی کو مل جائے تو عمر بھر کے لئے فکر معاش سے بے نیاز ہو جائے۔ ـــــ لیکن مصیبت یہ تھی کہ عام آدمی کو رونے کی اجازت نہ تھی۔ بھلا ہنستی مسکراتی دنیا میں آنسوؤں کا کیا کام ـــــ صرف ملک کی شہزادی رو سکتی تھی۔ اور وہ بھی کوئی جلدی سے تھوڑا ہی روتی تھی۔ بس رو لیا زندگی میں ایک آدھ بار ـــــ جب کسی دیو کی قید میں دل بھر آیا ـــــ اور شہزادے کی راہ تکتے تکتے آنکھیں پتھرا گئیں۔ اور پھر جو غم عشق میں آنسو ٹپکے تو موتی بن گئے ـــــ اور وہ موتی دیو کے محل کے قریب جو دریا لہریں مارتا۔ اس میں بہتے بہتے دور نکل جاتے۔ اور عشق کا مارا شہزادہ اپنی گمشدہ شہزادی کا اتا پتہ انھیں موتیوں سے پاتا ـــــ اور صبا رفتار گھوڑے پر سوار آندھی کی طرح آتا ـــــ اور بگولے کی طرح جاتا ـــــ بہت گھمسان کا رن پڑتا ـــــ اور بالآخر شہزادہ اپنی شہزادی کو بازوؤں میں اٹھا اپنے دیس لوٹ جاتا۔ پھر ایک ننھی منی سی دنیا کی تخلیق

ہوتی۔ اور وہ ہنسی خوشی زندگی گزار دیتے۔

اسی گمشدہ جنت کی تلاش کی کہانیاں بہت سے داستان گو کہتے رہے۔ اور پھر کسی کو ملبس کو معلوم ہوا کہ اپنے دیس میں شہزادے شہزادیوں کے علاوہ بھی لوگ بستے ہیں۔ ان کے بھی اپنے خط و خال اور اپنے دکھ سکھ ہیں۔ اور ان کے آنسوؤں کو بھی موتی بننے کا حق حاصل ہے۔

لیکن جب کسی فنکار نے عوام کے دکھ سکھ کی کہانی کہی۔ تو معلوم ہوا کہ یہ ادب میں پروپیگنڈا ہے تب صاحب انصاف بیٹھے۔ اور خطا کار دل کو تختۂ دار پر کھینچنے کی دھمکیاں دی جانے لگیں۔

حق و باطل میں گھمسان کا رن پڑا۔ ویسا ہی جیسا کہ کبھی شہزادے اور دیو میں پڑتا تھا۔ سنا ہے ابھی یہ طے نہیں پا سکا۔ کہ کس نے کیا کھویا۔ اور کیا پایا۔ کیونکہ یہ معرکہ ابھی جاری ہے۔ اور سود و زیاں کے حساب و کتاب کو اک عمر پڑی ہے۔

ایک روز صبح ہی صبح منیر صاحب نظر آئے۔ جن سے اپنی اکثر لڑائی رہتی تھی۔ اور بعض دفعہ نوبت تُو تُو میں میں تک پہنچ جاتی تھی۔ نازک مزاج آدمی تھے اور لطیفوں پر بُرا مان جاتے تھے۔ مثل مشہور ہے کہ "نازک مزاج شاہاں تاب سخن نہ دارد" بہتیرا ان سے کہو۔ کہ بھائی لطیفہ تو بس لطیفہ ہی ہوتا ہے۔ لیکن وہ منہ تھکائے رکھتے۔

اس صبح جب وہ نظر آئے۔ تو دریچے کے قریب رک کر انہوں نے اپنا ہیٹ اتارا اور بولے سنا تم نے۔ اس خطۂ زمین پر ایک شہر ایسا بھی ہے۔ جہاں رات کی تاریکیاں چھٹ گئی ہیں۔ اور صبح طلوع ہو گئی ہے۔ میں نے ان کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ کیونکہ صبح کا مفہوم تو اپنی نظر میں ایک ہی تھا اور یہ وہ صبح تھی۔ جس کا حساب ہم کالج میں بیٹھ کر لگایا کرتے تھے۔ کہ پانچ برس چھ مہینے اور دس دن بعد نئی صبح کا سورج ہمیں اپنی آغوش میں لے گا ——— اور پھر کالجوں میں ہر سمت نکھرے نکھرائے چہرے اور دھلے دھلائے لباس نظر آئیں گے۔ کوئی چہرہ اس فکر سے تاریک نہ ہو گا۔ کہ کل فیس داخل کرنے کا آخری دن ہے۔ ورنہ نام کٹ جائے گا۔ ہیڈ کلرک کو یہ موقع نہ ملے گا۔ کہ کسی طالب علم کو کاریڈور میں روک کر یہ کہے کہ "میاں یہ جو تم دھاری دار پاجامہ پہنے چلے آئے ہو۔ تو یہ

کالج کا لباس نہیں ہے۔" اور کسی طالب علم کی یہ مجال نہ ہو گی کہ زینہ چڑھتے ہوئے مڑ کر دیکھے۔ اور گھٹی ہوئی آواز میں کہے ——— "یار! اس کالج کی روایات کا بیڑا ہو رہا ہے۔ ننگے ٹنگے پاجامے نظر آ رہے ہیں"——— اور کوئی سر شرم سے جھک جائے۔ ایسا موقع بھی نہ آئے گا۔ کہ پرنسپل کسی وظیفہ خوار کو بلا کر کہے کہ تم جلوس بیٹھے! میں شاہ کا وظیفہ خوار ہوں اور دو شاہ کو دعا" اور جب وہ نفی میں سر ہلائے۔ تو پرنسپل بہت رعب سے سر ہلا کر کہے۔ تمہیں وظیفہ زیادہ پیارا ہے یا جلسوں کی بکواس ——— اور وہ بیوقوف وظیفہ خوار حالات کو بھول کر کہہ دے۔ جلسوں کی بکواس ——— اور پھر اسی روپے کے وظیفے سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اور سالی سینی ٹوریم چلا جائے ——— اور سالہا سال بعد جب اس سے سرِ راہے ملاقات ہو۔ تو اس کی آنکھوں میں پٹے ہوئے کتے کی سی کیفیت ہو اور جب میں ٹھٹھک کر پوچھوں۔ کہ "اب تم کیا کر رہے ہو" تو وہ منہ پھیر کر جواب دے "میں اے۔ جی آفس میں کلرک ہوں"۔ اور پھر کہے۔ "شاہ زندہ باد"!

اور یہ بھی نہ ہوگا۔ کہ انگریزی ادب کا غریب طالب علم جو کلاس میں سب سے اچھے مارکس لیتا ہو اور جس کے مضامین پروفیسر بڑے فخر سے ہم سب کو سنا کر شرمندہ کیا کریں۔ کہ دیکھو یہ ہے انگریزی ادب پر تنقید ——— کمبختو! تم نے کیا چنے دے کر پڑھا ہے! ——— اور جو یہ سوچتا ہو کہ میں کیمبرج جا کر انگریزی ادب کا مطالعہ کروں گا۔ ایک دفتر میں صرف اکاؤنٹنٹ ہو کر رہ جائے ——— اور پھر کراچی میں مصوری کی کسی نمائش میں نظر آئے۔ اور ہم تک پہنچنے کی جرأت نہ کر سکے۔ کیونکہ اس کی شیروانی کا کالر پھٹا ہوا ہے۔ اور جوتے شکستہ اور گرد آلود اور مجمع میں غلام محمد انفسٹن سٹریٹ والے کے ہاں کے بہترین کالر اور صاف شفاف جوتے ہیں ——— اور ٹیلیفون کی گھنٹی زور سے بجے ——— اور میں ٹیلیفون اٹھاؤں تو آواز آئے۔ مس احمد ہیں کیا ——— اور جب میں اثبات میں جواب دوں۔ تو کہے۔ کہ میں حسن بول رہا ہوں۔ اور میں یہ سوچوں کہ یا اللہ! یہ اس تکلف سے مخاطب کرنے والا کون ہے اور ایک طویل وقفے کے بعد مجھے پتہ چلے۔ کہ اللہ یہ وہ حسن ہے ——— وہ شرمیلا سا طالبعلم ——— جس کو سب مل کر بنایا کرتے تھے۔ اور جو اتنے اچھے مضمون لکھتا تھا۔ اور کیمبرج جانا

چاہتا تھا۔ جب میں اس سے پوچھوں۔ کہ وہ اگر لاہور ہی میں ہے۔ تو ملا کیوں نہیں۔ تو بہت بھرائی ہوئی سی آواز سنائی دے "میں آیا تھا مس احمد۔ لیکن باہر آپ کے لان میں بہت سے لوگ بیٹھے تھے ——— میں لوٹ آیا" اور میں اس کے جواب میں کچھ نہ کہہ سکوں۔ صرف یہ سن کر چپ ہو جاؤں۔ کہ اب وہ اکاؤنٹنٹ ہے۔

اور پھر کسی روز سلیم احمد مرزا کی بہن شاپنگ کرتی ہوئی مل جائے۔ اور کہے۔ سنا تم نے ——— سلیم آکسفورڈ جا رہا ہے اور اللہ! امی ابا کس قدر خوش ہیں۔ کہ اسے سرکاری وظیفہ مل گیا ہے۔ اور میں سر ہلا کر حسن کے بارے میں صرف سوچ سکوں۔ سلیم احمد مرزا بھی تو انھیں میں سے تھا۔ جس کو پروفیسر حسن کا مضمون پڑھ کر سناتے اور پھر لعنت ملامت کرتے تھے۔

تو اپنا صبح کا شعور کچھ اسی گڑبڑ قسم کا تھا۔ یہی وجہ تھی۔ کہ میں نے بہت آنکھیں پھاڑ کر منیر صاحب، کو دیکھا۔ اور نفی میں سر ہلایا کہ نہیں ابھی بہت عرصہ تک صبح طلوع نہ ہو گی۔ بہت عرصہ تک انسان کو ظلم جہالت اور افلاس کے خلاف جدوجہد کرنا ہو گی۔

لیکن منیر صاحب سے بحث کرنے کا مطلب تھا۔ کہ آدمی کو باکسنگ میں خاصی مہارت ہو لہٰذا میں صرف اپنی آنکھوں میں شک لئے خاموش رہی۔ شاید میری آنکھوں کو شک و شبہ کے جذبہ کو اپنانے کی ہمت نہ ہوتی۔ اگر انہیں یہ اطمینان نہ ہوتا کہ چشمہ خاصے عیوب ڈھانک لیتا ہے۔

تو صاحبو! پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا۔ کہ لوگ جوق در جوق اس نئے شہر کی سمت جہاں صبح طلوع ہوئی تھی رُخ کرنے لگے۔ ہزارہا لوگ ترک وطن کر کے چلے گئے۔ کیونکہ سنا تھا۔ وہاں چیزیں سستی ہیں۔ اور چور بازاری کرنے والوں کو چار چوٹ کی مار دی جاتی ہے اور طرہ یہ کہ تعلیم پرائمری تک مفت ——— ہماری امی جان نے جب یہ سنا۔ کہ تعلیم مفت دی جاتی ہے۔ تو ان کے کان کھڑے ہوئے۔ کیونکہ فیس دیتے دیتے ان کا دیوالہ پٹ جاتا ہے۔ یوں بھی انھیں ہر شخص میں ٹیلنٹ (TALENT) تلاش کر لینے میں کمال حاصل ہے۔

انتہا یہ ہے کہ ہمارے ملازم تک اس سے محفوظ نہیں۔ خانساماں کے بارے میں امی کو پتہ

چلاکہ اسے پڑھنے کا بے انتہا شوق ہے اور وہ مڈل پاس ہے۔ لہٰذا میٹرک کی کتابیں خریدی گئیں۔ حالت یہ ہوتی کہ ادھر ہنڈیا چولہے پر جل رہی ہے۔ اور ادھر خانساماں اکبر اعظم کا دور حکومت پڑھنے میں مصروف ہے ــــ ہماری بہن کے ہوسٹل میں ایک لڑکا ٹینس کی گیند اٹھانے پر ملازم تھا۔ سب اکو منشی منشی کہہ کر پکارتے تھے۔ ہماری اماں جان ہوسٹل گئیں۔ تو انہوں نے اس لڑکے میں پڑھنے لکھنے کے جراثیم پائے۔ لہٰذا وہ اُسے لے آئیں۔ باقاعدہ اس کا نام تبدیل کیا گیا۔ کیونکہ خیال کیا جاتا ہے کہ نام سے انسان کی ذات اور کردار پر بہت اثر پڑتا ہے۔ اب وہ حضرت اسکول جاتے ہیں۔ اور فالتو وقت میں تھوڑی بہت بیگار بھگت لیتے ہیں۔ کیونکہ جو وقت کام کا ہوتا ہے۔ وہی ان کے اسکول کا ــــ ہم میں سے کسی کی مجال نہیں۔ کہ صبح کے وقت انھیں کوئی کام بتایا جائے۔ اگر کبھی امی کے ساتھ چپکے ہوئے وہ ہماری بہن کے ہوسٹل چلے جائیں۔ اور وہاں کوئی انھیں منشی کہہ کر پکارے تو بہت بُرا مانتے ہیں۔ اور ہماری امی جان بڑے فخر سے کہہ رہی تھیں کہ "اب تو ماشاء اللہ بڑا ہو گیا ہے۔ اے ہے جب آیا ہے۔ تو آٹے کے ٹین تک اس کا ہاتھ نہیں پہنچتا تھا۔ پیڑھے پر کھڑا ہو کر آٹا نکالتا تھا۔ اور اب دیکھو ــــ"

تو خیر ہماری امی نے جب یہ سنا کہ نئے شہر میں تعلیم مفت دی جاتی ہے۔ تو تقاضا کیا۔ کہ چلو ــ چلو ــــ سوچا ہو گا۔ کہ ملازموں کی فیسیں دینے سے ہی چھوٹوں گی ــــ ہم نے بھی سوچا۔ کہ چلو اچھا ہے۔ اب انسانوں میں TALENT تلاش کرنیکی ذمہ داری حکومت کی ہو گی۔ ہماری امی تو شہر کے اندیشے میں دبلی نہ ہوں گی۔ اور ہمیں بھی آرام رہے گا۔ یہ تو نہ ہو گا۔ کہ ادھر شام کے سات بجے اور ادھر یہ حکم کہ خانساماں سے کوئی کام نہ کہا جائے ــــ صبح کے سات بجے تو اُوپر کے ملازم سے یہ بھی نہ کہا جائے۔ کہ جوتا صاف کر دو۔ کیونکہ اس کے اسکول کا وقت ہے

اب اتفاق دیکھیے کہ نئے شہر میں ایک روز میر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔ کہ "آپ کہاں ــــ" معلوم ہوا کہ وہ ایک محکمہ میں بہت بڑے افسر ہیں ــــ "بڑے بڑے بی۔ اے، اور ایم۔ اے اور جانے کیا کیا ڈگریوں والے اس کے امیدوار

تھے۔" منیر صاحب نے میرے کان میں کہا:

"اور کم سے کم قابلیت کا معیار کیا تھا۔؟"

"بی۔اے۔"

"تو پھر منیر صاحب آپ تو ___ آپ تو ___ فقط میٹرک پاس ہیں۔ پھر کس اسم کا ورد کیا تھا۔"

اس سوال کا جواب منیر صاحب نے بہت رازداری میں دیا۔ کہ ان کے بھائی اس نئے شہر کے وزیر ہیں۔ "اب تم ہم سے ڈر کر رہو"___ "لیکن منیر صاحب آپ تو کہہ رہے تھے کہ نئی صبح طلوع ہو چکی ہے ___ اب خویش پروری اور دوست نوازی نہ ہو گی۔ آپ نے تو کہا تھا۔ کہ اب اندھیرا اور اجالا الگ الگ نظر آئیں گے۔ اور بیچارے لوگ تو امیدوں اور آرزوؤں کے قافلے کے ساتھ چلے تھے۔"

اس پر منیر صاحب نے ناک چڑھا کر کہا۔ "اونہوں تم نہیں سمجھو گی۔ آدمی کو عملی ہونا چاہیئے"

"اور یہ آپ ابھی تک دفتر نہیں گئے گیارہ بج رہے ہیں۔"

"سیاں بھئے کوتوال اب ڈر کاہے کا۔" اور یہ گنگناتے ہوئے منیر صاحب اپنی راہ چل دیے۔

اتنی دیر میں کیا دیکھتی ہوں کہ ایک مجمع بڑے جوش و خروش سے گاتا چلا آرہا ہے۔

"رہنے کو گھر نہیں ہے سارا جہاں ہمارا"

معلوم ہوا کہ یہ نئے شہر کا قومی ترانہ تھا۔

پھر ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ اور پپا کی آواز آئی۔

"یہ تم ہو تارا۔"

"جی پپا"

"بیٹی پولیس آئی بیٹھی ہے۔ اور میں جیل جا رہا ہوں۔"

پپا نے کوئی اُلٹا سیدھا سا قانون بتایا۔ جس کی رو سے وہ جیل جا رہے تھے۔ میں نے

بڑی حیرت سے سوچا کہ میرا بیچارہ باپ کس جرم میں جیل جا رہا ہے اس کو نہ تو چور بازاری کا موقعہ ملا ہے۔
اور نہ ذخیرہ اندوزی کی سہولتیں ——— پپا کے پاس تو لے دے کر ایک لائبریری ہے ———
شاید کتابوں کی ذخیرہ اندوزی بھی منع ہے یا خیالات کی چور بازاری بھی جرم ہے۔

ایک وکیل کے گھر جا کر میں نے اسے سوتے سے جگایا۔" ذرا جلدی سے بتاؤ کہ یہ کیا قانون ہے!"
——— اور میں نے پرزہ پر لکھی ہوئی دفعہ پڑھی ——— "قصہ کیا ہے ؟"

میں نے مختصر الفاظ میں اُسے قصہ سنایا۔ وہ بیچارا کوئی بہت ہی شریف وکیل تھا۔ بجائے اس کے کہ وہ مجھ سے فیس مانگتا۔ اس نے گھور گھور کر ایک کتاب پڑھنا شروع کر دی۔ اور وہ ناشتہ جو اس کی خوبصورت آنکھوں والی بیوی نے اس کے لئے بڑے اہتمام سے تیار کیا تھا۔ میرے سامنے رکھ دیا

"تم یہ ناشتہ کرو"

کتاب پڑھ کر اس نے دو چار ٹیلیفون کئے۔ اور مجھ سے کہنے لگا" قانون کے مطابق تمہارے پپا کا جرم بہت سخت ہے۔ ان کی ذات سے ملک شہر کا تحفظ اور اس کی سالمیت خطرے میں ہے۔"

جب میں نے اس سے پوچھا کہ کیا قانون کی اس کتاب میں کہیں لفظ تحفظ یا سالمیت کی تشریح کی گئی ہے۔ تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔" زیادہ سے زیادہ سزا کیا ہے ؟"

"دس برس قید با مشقت۔" اس نے بڑی شفقت سے میرے سر پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔

اور میں جو اس بارے میں سخت احساس کمتری میں مبتلا تھی۔ کہ پپا کبھی جیل نہ گئے۔ اپنے دل میں ایک درد لے کر لوٹ آئی ——— حوالات کی سلاخوں کے اُس پار وہ تھے۔ اور اس پار میں تھی۔

——— یہ میرا باپ تھا۔ جو جمہوریت کا اس حد تک قائل تھا۔ کہ لوگ کہتے تھے کہ ہمارے گھر میں جمہوریت نہیں اندھیر ہے جس نے آج تک کسی کی بُرائی نہیں کی تھی ——— جو دشمن میں بھی خوبیاں دیکھنے کا عادی تھا ——— پپا سے ہم گھنٹوں آزادی۔ جمہوریت اور مساوات پر بحث کرتے تھے۔ اپنے زاویۂ نگاہ کو ثابت کرنے کے لئے کتابوں کے حوالے دیتے تھے چھوٹے چھوٹے پمفلٹ ان کو دیتے تھے۔ کہ پپا آپ ان کو پڑھیں۔ تو معلوم ہو ——— اور وہ ہنس کر کہتے تھے۔

"تارا بی بی ـــــ والٹیئر نے کہا ہے۔ کہ تم جو کہہ رہے ہو۔ مجھے اس سے شدید اختلاف ہے۔ لیکن میں زندگی کے آخری لمحوں تک تمہارے اس حق کا تحفظ کروں گا کہ جو تم سوچتے ہو۔ وہ کہہ سکو۔"

یہ تو پپا تھے۔ جن کے چہرے پر میں نے کبھی تاریکی نہیں دیکھی تھی جن کو میں نے کبھی مایوس نہیں دیکھا تھا۔ جن کو میں دیکھ کر سوچا کرتی تھی۔ پپا! آپ نے یہ نہ مٹ سکنے والی امید اور نہ ٹوٹ سکنے والا حوصلہ کہاں سے لیا ہے ـــــ کیسے آپ ہمیشہ یہ سوچ سکتے ہیں۔ کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

یہ پنجرے میں بند انسان میرا باپ تھا۔ جو آزاد فضا میں گھومنے کا عادی تھا جسے بند کمرے میں وحشت ہوتی تھی۔ جو سڑکوں پر بلا وجہ گھومتے رہنے کو کمرے میں بیٹھنے پر ترجیح دیتا تھا۔ جو شکار کی خاطر ہفتوں ترائی کے جنگلوں میں جا کر رہتا تھا ـــــ اور یہ صرف چند فیٹ جگہ تھی ـــــ اور میں سوچ رہی تھی۔ کہ یہ کس ناکردہ گناہ کی سزا ہے۔ میرا جی چاہا ـــــ پوچھوں ـــــ "پپا والٹیئر نے کیا کہا تھا"

لیکن میں نے یہ نہیں پوچھا ـــــ صرف ہنس کر اتنا کہا "پپا! اچھا ہوا آپ جیل چلے گئے۔ آپ بہت کام کرتے تھے۔ آپ کو آرام کی سخت ضرورت تھی۔ اب آپ آرام کر سکیں گے۔"

پپا اور ان کے سب ساتھی جو ان کے ساتھ سلاخوں کے اس پار تھے۔ ہنس دیے۔ اور انہوں نے مجھے قصہ سنایا۔ کہ طالب چچا کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ جب معلوم ہوا کہ ان کے وارنٹ نکل آئے ہیں۔ تو وہ ٹکٹ کٹا کے شہر لوٹ آئے۔ اسٹیشن سے گھر پیغام دیا۔ کہ میرا بستر حوالات بھیج دیا جائے۔ اور خود سیدھے تھانے پہنچ گئے۔ تھانیدار نے بہتیرا کہا۔ کہ اس وقت تم جاؤ۔ ہم صبح باقاعدہ کارروائی کے بعد تمہیں گھر سے پکڑ لائیں گے جواب ملا کہ "نہیں بھائی اب تو میں آ گیا ہوں۔"

میں نے طالب چچا کو فخر سے دیکھا۔ آپ پپا کے دوست ہیں نا ـــــ میں آپ کو عرصہ دراز سے جانتی چلی آئی ہوں لیکن مجھے معلوم نہیں تھا۔ کہ آپ اتنے دلیر ہیں ـــــ اور اتنی دیر میں سنتری چلایا "بی بی تم بھاگ جاؤ۔ ڈی ایس پی صاحب آ رہے ہیں۔"

پپا نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روکا۔ "تارا بی بی ـــــ تم غیر طبقاتی نظام کی باتیں کرتی تھیں۔ تو یہ غیر طبقاتی نظام اور کہیں وجود میں آیا ہو یا نہ ـــــ قیدیوں کے لئے ضرور آ گیا ہے۔ ویسے تو سب

کو بلا تخصیص سی کلاس ہی ملے گی۔ لیکن اگر کبھی کوئی سوال اُٹھے۔ تو میرا ایکسرے جو ابھی ہوا تھا۔ اس کی کاپی میرے کمرے کی میز کی اُوپر والی دراز میں ہے"۔

— میں نے بڑے ترحم سے اپنے باپ کو دیکھا۔ پپا۔ آپ کی وہ نہ ٹوٹنے والی امید کیا ہوئی۔ آپ جو انصاف کی اور جمہوریت کی باتیں کرتے تھے۔ اور جو ایک بار امی سے صرف اس بات پر خفا ہو گئے تھے کہ انہوں نے انصاف کے تصور کا مضحکہ اڑایا تھا — تو اب آپ کو کیا ہوا کہ آپ کے ذہن میں رہا ہوتے یا قید ہونے کے مسئلہ پر کوئی شک نہیں ہے۔ خیال ہے تو صرف یہ کہ شاید کلاس کا جھگڑا کسی مرحلے پر اٹھے۔

حوالات سے نکلتے ہوئے انسپکٹر صاحب نظر پڑے۔ وہ امی جان کے ہم وطن تھے۔ بڑے ادب سے میں نے ان کو سلام کیا اور جواب میں دعا پاکر کہا۔ کہ اگر کبھی پپا سے ملنے کی ضرورت پڑے۔ تو کیا میں ان سے آکر اجازت لے سکتی ہوں — وہ ذرا سی دیر کو ٹھٹکے — شاید انھیں اس قسم کے سوال کی توقع نہ تھی۔ کچھ جھجکے — اور پھر بولے — "کیا یہ مناسب نہ ہو گا۔ کہ میں رات کی تاریکی میں ملازم کو بھیج کر ان کی خیریت معلوم کر لیا کروں —، بات یہ ہے کہ تمہارے پپا زیرِ عتاب ہیں نا"

"آپ بجا فرماتے ہیں" — میں آگے چل دی۔

آپ میری امی کے گاؤں کے ہیں۔ اور مجھ سے کہا جاتا ہے کہ میں آپ کو ماموں کہہ کر پکاروں کیونکہ بچپن سے امی نے دیہات کے بارے میں ہمارے ذہن میں ایک پریوں کی سی دنیا لبسا رکھی ہے۔ میں نے وہ گاؤں چند ہی بار بچپن میں دیکھا تھا۔ اب وہ سرحد کے اس پار رہ گیا ہے۔ اور وہاں جاکر حالات دیکھنے کا کوئی سوال نہیں — ایک بار جب میں کالج کی ٹیم کے ساتھ اس دیس گئی تھی۔ تو میں نے اپنے آباؤ اجداد کی قبریں ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔ میرے سامنے اپنے نانا کا چہرہ آگیا تھا۔ جس پر بیک وقت نرمی اور درشتی تھی۔ اور میں نے سوچا تھا۔ کہ مٹی کے ڈھیر میں میں اسی چہرے کو ڈھونڈنے کی کوشش کروں گی۔ اور شاید میرے نانا آبا کا وہ پورٹریٹ اب بھی میری ننھیال میں موجود ہو جس کو یاد کر کے میری امی اب تک سرد آہ بھر کر کہتی ہیں۔ "کچھ نہ آسکا۔ لیکن وہ پورٹریٹ آجاتا" — اور میرا خیال

تھا۔ میں اپنے خاندانی قبرستان میں جاؤں گی۔ جس کے گرداگرد سفید پتھر کی چار دیواری ہے۔ اور دروازے پہ دو اشعار کندہ ہیں:

اور پپا نے کہا تھا۔ ٹھہرو! میں تمہیں نقشہ کھینچ کر بتاؤں۔ کہ تمہارے دادا کی قبر کس سمت ہوگی۔ ویسے تو کتبہ لگا ہوگا۔ لیکن اگر ــــ اور پھر پپا چپ ہو گئے تھے اور کاغذ پہ لکیریں کھینچنے لگے ــــ انہوں نے کیا بتایا تھا۔ کہ پچھم کے رُخ یا پورب کے رُخ چنبیلی کی جھاڑیوں کے قریب میرے دادا دفن ہیں ــــ میرے ذہن میں میرے دادا کا کوئی چہرہ نہیں ہے ــــ میں نے ان کو کبھی نہیں دیکھا ــــ شاید پپا کو بھی ٹھیک سے یاد نہ ہو ــــ وہ آٹھ ہی برس کے تو تھے۔ اور آٹھ برس کی عمر کی باتیں کہاں یاد رہتی ہیں بھلا ــــ میرے ذہن میں صرف وہ تصویر ہے جو ہمارے گاؤں والے دیوان خانے میں آتشدان کے اُوپر لگی ہوئی تھی۔ یا وہ پنسل سکیچ یاد ہے۔ جو دادا ابا کے ایک آرٹسٹ دوست نے ایک بار میرے سوال کے جواب میں بنایا تھا ــــ کہ ایسے تھے تمہارے دادا ابا! اب تو ہمارے پاس وہ دھندلی دھندلی تصویریں بھی نہیں ــــ صرف یادیں ہیں، کسی روز یہ بھی دھندلا جائیں گی۔

اور پپا کس بھولپن سے کہہ رہے ہیں۔ اس رُخ چنبیلی کی جھاڑیوں کے پاس تمہارے دادا ابا دفن ہیں۔ پپا کو معلوم نہیں ــــ کہ جب طوفان آتا ہے تو چنبیلی کی جھاڑیاں ریت میں کھو جاتی ہیں اور جب طوفان تھم جاتا ہے۔ تو صرف آنسو رہ جاتے ہیں۔ جنہیں بہنے کی اجازت نہیں ــــ۔

تو میں نے ان انسپکٹر صاحب کو بہت غور سے دیکھا۔ میری امی کہتی ہیں۔ کہ گاؤں میں ایک کی بیٹی سب کی بیٹی ہوتی ہے۔ میری ماں آپ کے گاؤں کی بیٹی ہے۔ اس ناطے وہ آپ کی بہن ہوتی ہیں ــــ اور امی کہتی ہیں۔ ہم دیہاتی لوگ زمین کے لوگ ہیں۔ زمین سے ہمارا بہت گہرا رشتہ ہے ہماری وفا کی جڑیں بھی دھرتی تک پہنچتی ہیں ــــ اور اگر اس وقت میری امی میرے قریب ہوں۔ تو میں ان سے پوچھوں،، مما! کیا آپ نے کسی جاپانی گاؤں کا تذکرہ کیا تھا؟"

جب میں گھر پہنچی۔ تو امی بہت غصہ میں بھری بیٹھی تھیں۔ کہنے لگیں۔ یہ وہ جعفری جو ہے نا۔ وہ

ایسا یا جی ہے۔ کہ سب سے چھپ کر یہاں آتا ہے اور اپنے گھر میں کہتا ہے۔ کسی سے کہنا مت کہ میں وہاں گیا ہوں۔ یہ تمہارے باپ کے دوست ہیں" ــــ میں نے ہنس کر اپنی ماں کے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کی ــــ کہ دیکھئے نا۔ قانون یہ ہے کہ مجرم کو پناہ دینے والا یا اس سے میل جول رکھنے والا بھی مجرم ہوتا ہے ــــ اور نئے شہر کے قانون نے ہمیں غدار شہری قرار دیا ہے۔

میں نے ان سے انسپکٹر صاحب کا قصہ نہیں کہا۔ وہ بھی تو میرے ماموں تھے۔ میں اُن سے کس کس چچا اور کس کس ماموں کا گلہ کرتی۔

اور پھر ایک دن نئے شہر کے بازاروں میں ہنگامہ برپا ہوا۔ سب لوگ خوشی سے نعرے لگا رہے تھے۔ کچھ سر جھکائے اپنی اپنی راہ جا رہے تھے۔ غل غپاڑہ سن کر میں نے اپنے دریچے میں سے جھانک کر دیکھا تو معلوم ہوا۔ کہ شاہ شہر نے آج ایک بہت بڑے غدار کو سزا دی ہے۔ اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے ایک ایسے ملک کی لڑکی سے عشق کیا تھا۔ جس سے ہمارا نظریاتی اختلاف تھا۔ لہذا اس کی تمام جائیداد ضبط کر لی گئی۔ اور اس کے ہونٹوں پہ مہر لگا دی گئی۔ اور جو کوئی اس سے بات کرنے کے جرم کا مرتکب ہو گا۔ اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈلوا دیا جائے گا۔

اس رات بہت بھاری جشن ہوا۔ شہر جاناں میں چراغاں ہوا۔ لوگوں کو خوشیوں کی کتنی کمی تھی۔ ایک زمانہ میں شہنشاہوں کے جنم دن پر چراغ جلائے جاتے تھے۔ اور اب کسی غدار کو سزا دینے پر ــــ اور لوگ بھی کہ خوش تھے۔ کیونکہ وہ خوش ہونا چاہتے تھے ــــ اس رات جشن تھا۔ اور وہ لوگ جن پر ہر شاہ وقت کا عتاب نازل رہتا تھا۔ اب بھی معتوب رہے بلکہ کرتے پہنے وہ ایک ایک کر کے ویران تاریک راہوں سے گزرتے رہے ــــ

خدا کا کرنا کیا ہوا۔ کہ ایک شام جب میں ادھر اُدھر آوارہ گردی کے بعد اپنے گھر پہنچی۔ تو مجھے اپنی ماں ویران ویران سی آنکھیں لیے بالکنی میں کھڑی نظر آئی۔ ہمارے گھر کے گرد پولیس کا زبردست پہرہ تھا۔ ہمارے لان میں سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ اور ہماری سب کتابیں اس میں جل رہی تھیں ــــ میں لپکی ہوئی پپا کی لائبریری میں گئی۔ تو وہاں سب شیلف جن میں کتابیں چھت تک

بھری ہوئی تھیں ـــــ خالی تھے ـــــ شاید میری سٹڈی کا بھی یہی حشر ہوگا ـــــ میری ہمت نہ پڑتی تھی۔ کہ وہاں جاؤں۔

لیکن پھر آہستہ آہستہ خواب کی سی حالت میں چلتی ہوئی میں اپنی سٹڈی میں پہنچی۔ وہاں میرے دل کی سی ویرانی تھی ـــــ میرے ننھے منے شیلف اپنی اداس اداس آنکھوں سے مجھے تک رہے تھے یہ کتابیں ان کی رفیق تھیں ـــــ اور اب وہ باہر جل رہی تھیں ـــــ ہم سب بہن بھائیوں نے مل کر ان شیلوز پہ سفید پالش کیا تھا۔ اور کنارے پہ سرخ دھاری بنائی تھی ـــــ ہم نے بڑے چاؤ سے ان میں کتابیں سجائی تھیں ـــــ بڑے پیار سے ان کو پڑھا تھا ـــــ ہم گھنٹوں آزادی، مساوات اور جمہوریت پر بحث کرتے تھے ـــــ اور ہمارے گھر میں اس کی آزادی تھی ـــــ اور آج باہر کتابیں جل رہی تھیں ـــــ ان میں وہ کتابیں بھی تھیں۔ جو میں نے جیب خرچ سے پیسے بچا کر خریدی تھیں ـــــ ان میں وہ بھی تھیں جو پپا نے میری سالگرہ پہ تحفتہً دی تھیں۔ پپا نے میری کسی سالگرہ پہ مجھے کتاب کے سوا اور کچھ نہیں دیا تھا۔ ـــــ اور ان میں وہ بھی تھیں، جو سکول اور کالج کے زمانہ میں مجھے انعام کے طور پہ ملی تھیں ـــــ اور کچھ ایسی بھی تھیں جن پر میں نے قبضۂ غاصبانہ کر رکھا تھا۔ اور اب ان سب سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ شاید میں برلن میں ہوں۔ اور ہٹلر نے ابھی ابھی کتابوں کے جلائے جانے کا حکم دیا ہے۔ شاید میں روم میں ہوں۔ روم جل رہا ہے۔ اور نیرو بانسری بجا رہا ہے ـــــ لیکن یہاں سب میری جانی پہچانی چیزیں ہیں ـــــ یہ ہمارا چھوٹا سا چمن ہے جس میں ہم نے بڑے اہتمام سے ـــــ بڑے چاؤ سے ـــــ آلوچے کے اور آڑو کے پیڑ لگائے تھے کہ جب بہار آتی ہے اور وہ پھولوں سے لد جاتے ہیں۔ تو آگ اور چاندنی کا میل نظر آتا ہے۔ اور آج وہاں صرف آگ ہی آگ ہے۔

میں دریچے میں سے ہٹ آئی ـــــ یہ سب، کچھ جانا پہچانا ہے ـــــ اور کچھ جانا پہچانا نہیں ہے ـــــ یہ میرا کمرہ ہے۔ میرے دکھ سکھ کا ساتھی ـــــ یہاں میرا غریب دل پہلی بار درد سے آشنا ہوا تھا ـــــ یہاں کسی زمانے میں گوتم بدھ کا مجسمہ تھا ـــــ اب صرف اس کے ٹکڑے ہیں۔ کیونکہ اس

سے ہمارا نظریاتی اختلاف ہے ـــــ یہاں میرے ایک ساتھی کا بنایا ہوا ایک اور کھلے ماڈل تھا. جس پر اس نے مدتوں محنت کی تھی۔ اور ایک ایک خط اور جسم کا TEXTURE پیار سے بنایا تھا ـــــ اب اس کے ریزے میرے پیر میں چبھ رہے ہیں سنا ہے کہ مشورہ دیا گیا تھا. کہ اس بت کو تباہ نہ کیا جائے. صرف عریانی سے بچاؤ کے لئے برقعہ اڑھا دیا جائے اس پر جواب میں اس بت کو پاش پاش کر دیا گیا۔

پھر میں اپنی ماں کے پاس گئی۔ تو معلوم ہوا کہ انہیں اصلاحی سکول میں بھیجا جا رہا ہے تاکہ ان کو جسے پڑھایا لکھایا جا سکے۔ ان کی تعلیم انتہائی غلط لائنوں پر ہوئی ہے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بچوں کی تعلیم و تربیت بہت غلط کی یہی وجہ ہے کہ ہم سب بہن بھائی کسی طور بھی نارمل نہ ہو سکے۔ ہمیں دراصل صرف لباس کی اور صرف فلموں کی باتیں کرنا چاہیئے تھیں ـــــ اور زیادہ سے زیادہ موسم کی۔

امی جان چپکے چپکے اپنا سامان پیک کر رہی تھیں۔ اور ایک آیا کمرے میں ٹہل رہی تھی" اپنا نائٹ سوٹ بھی رکھ لو بی بی! اور ٹوتھ برش بھی ـــــ جس جس چیز کی ضرورت ہو رکھ لو ـــــ اب تم صرف گرمیوں کی چھٹیوں میں یہاں آسکو گی۔ وہ بھی اگر تم نے اپنا رویہ ٹھیک رکھا اور سکول کی پرنسپل نے تمہیں اچھے اخلاق کا سرٹیفکیٹ دیا۔"

امی کو پیکنگ کرتا چھوڑ کر میں اپنی بہن کے کمرے کی طرف بڑھی۔ اسے ہوسٹل سے واپس بلا لیا گیا تھا اور اس کے سامنے ڈریسنگ ٹیبل پر لوہے کی ٹوپیاں پڑی تھیں ـــــ "یہ کیا؟" ـــــ میں نے پوچھا

"چینی عورت کا پیر باندھنے کے لئے کسی زمانے میں لوہے کا جوتا پہنایا جاتا تھا۔ تاکہ پیر بدنما طور پر بڑا نہ ہو جائے اور خوبصورت رہے ـــــ ہمیں اب یہ لوہے کی ٹوپیاں پہنائی جائیں گی۔ گو بہت دیر ہو گئی ہے۔ لیکن شاید ہمارے سر خوبصورت ہو جائیں۔ اور اپنے صحیح حجم تک لوٹ سکیں"

مجھے سخت ہنسی آئی "ارے یعنی تم ـــــ سائنس کی طالب علم ہوتے ہوئے ایسی احمقانہ باتیں کر رہی ہو۔"

"چپ۔ چپ ـــــ آہستہ بولو" ـــــ میری بہن نے کہا۔

"یہ وحشت کیوں ہے؟"

" اس لئے کہ پپا کے دفتر میں ایک ڈپٹی منسٹر بیٹھی ہیں۔ آج سے اس گھر کا انتظام وہی کریں گی یہ شاہِ شہر کا حکم ہے اور خدا کے لئے اپنے جلسے جلوسوں والا ہنگامہ برپا نہ کرنا ورنہ ہمیں بھی مرواؤ گی ـــــ" جب میں پپا کے آفس کی طرف گئی تو وہاں ایک خاتون بہت خوبصورت لباس میں پپا کی کرسی پر بیٹھی تھیں۔ اور ہمارا خانساماں جو میٹرک کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔

اس خوبصورت لباس والی خاتون نے ڈپٹ کر کہا " سنا ہے کہ تمہارے ہاں مولی بہت کھائی جاتی ہے تمہیں معلوم نہیں۔ مولی کا بیج ہمارے دشمن ملک سے آتا ہے۔ ایک ایسے ملک سے جس سے ہمارے نظریاتی اختلافات ہیں ـــــ خبردار! آج کے بعد اس گھر میں مولی کی شکل نہ دیکھی جائے"

اتنی دیر میں اس کی نظر ان کتابوں پر پڑ گئی۔ جو خانساماں نے اپنی پیٹھ کے پیچھے چھپا رکھی تھیں

" اچھا جناب کو بھی یہ لپکا ہے۔ پھینکو ان کو باہر"

خانساماں نے کھڑکی میں سے کتابیں باہر پھینک دیں اور وہ اس الاؤ میں جا گریں۔ جو بہت دیر سے سلگ رہا تھا ـــــ پھر وہ دہک اٹھا ـــــ یہ کس کی چتا تھی۔ کہ دنیا بھر کے فلسفی اور دانشور آج ستی ہو رہے تھے ـــــ آج سارے نظریے، سارے فلسفے جلا دیے گئے ـــــ اب کوئی نظریاتی اختلاف نہ رہے گا ـــــ اب نئے شہر کے تحفظ اور سالمیت پر کوئی آنچ نہ آسکے گی ـــــ میرا جی چاہا ـــــ میں جیل کی سلاخوں کے قریب جا کر پوچھوں۔

" پپا! والٹیئر نے کیا کہا تھا ـــــ "!!!

ایک قدم

کاغذات میرے سامنے بکھرے پڑے ہیں اور میرے دل میں ایک جنگ جاری ہے۔ یہ خیر و شر کی وہ جنگ ہے۔ جس سے ہم زندگی کے ہر ہر لمحے گزرتے ہیں۔ ماضی حال مستقبل سب بہت الجھے ہوئے الفاظ ہیں۔ ان میں کس قدر کم فاصلہ ہے۔ درمیان میں کوئی حدِ فاصل نہیں۔ یہ لمحہ جس سے میں گزر رہا ہوں۔ ماضی بن گیا ہے۔ اور وہ جو مستقبل تھا۔ حال ہو گیا ہے۔ ایک ہلکی سی آواز آئی۔ بہت ہی ملائم ــــــ یہ گلاب کے پھول کی وہ پنکھڑی ہے۔ جو بہت ملائمت سے میز پر گر پڑی ہے۔

خیر و شر میں صرف ایک قدم کا فاصلہ ہے۔ بالکل اسی قسم کا فاصلہ جو انسانیت کے غموں اور خوشیوں میں حائل ہے۔ انسانیت پاتال میں اسیر ہے۔ جیسے میں اس لمحے میں اسیر ہوں۔ اور اُسے آفتاب کی کرنوں سے شناسا کرنے کے لئے صرف ایک قدم اٹھانا پڑتا ہے۔

مجھے چین کی کہاوت یاد آ رہی ہے۔ کہ ہزاروں میل کے سفر کا آغاز ایک قدم سے ہوتا ہے۔

لیکن وہ ایک قدم اٹھانے سے پہلے ہم کن جہنموں سے گزرتے ہیں۔ کیا کیا اذیت دہ لمحے دل کو لپٹ جاتے ہیں۔ لمحے جو طویل ہو جاتے ہیں جو صدیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتے ہیں۔ جن میں ہم اپنے وجود کو شدت سے محسوس کرتے ہیں۔

زندگی میں ایسے لمحے بھی آتے ہیں، جو زندگی کی سب مسرتوں ــــــ سب غموں ــــــ سب ناکامیوں اور سب صعوبتوں کو اپنے دامن میں لئے ہوتے ہیں ــــــ یہ میں ہوں۔ یہ میری ناکامیاں ہیں۔ یہ میری مجروح انا ہے۔ یہ میرے خوابوں کی کرچیں ہیں۔ اور یہ سب کچھ میری روح کو زخمی کئے دے رہے ہیں۔ ہم اپنی روح کو کس کس طرح بچا کر رکھنا چاہتے ہیں۔

میں زندگی میں کوئی تلخی نہیں چاہتا تھا۔ میری سب خواہشیں وہی تھیں۔ جو ایک عام نارمل انسان کی ہوتی ہیں۔ ہلکی پھلکی لہراتی ہوئی زندگی۔

اور اس لمحے دل مجروح مجھے تنگ کر رہا ہے۔ یہ خیر اور شر کے درمیان حائل ہے۔ میں کیا کرونگا۔ کدھر جاؤں گا۔

اور میں اپنی زندگی کی فلم دیکھ رہا ہوں۔ ایک اونچے ستون پر بیٹھ کر ــــــ گو یہ کلوولیس نہیں۔ اور میں خدا نہیں۔ لیکن میں اپنے ــــ امکان بھر غیر جانبدار اور پرسکون رہنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں جو خدا نہیں۔ صرف ایک عام انسان ہوں۔ بہت ہی عام۔ اور بہت ہی عامیانہ خواہشوں کا مالک ــــــ یہ میں ہوں۔ اپنی امید اور دل خوش کن خیالوں سمیت ــــــ یہ یونیورسٹی کی لائبریری ہے یہاں کاونٹر کے قریب کھڑا میں کتابیں لے رہا ہوں۔ یہ ڈیپارٹمنٹ کا ریڈنگ روم ہے۔ یہاں میں بیٹھا سیمینار لکھ رہا ہوں۔ اور میں کس قدر خوش فہم اور پرامید ہوں ــــــ اور یہ فیاض آگیا ہے۔ اور پھر زارا آگئی ہے وہ میرے نوٹس دیکھ رہی ہے۔ میں اُسے دیکھ رہا ہوں۔ فیاض بھی اُسے دیکھ رہا ہے۔ گذشتہ پانچ برس سے میں اور فیاض زارا سے عشق کر رہے ہیں اور وقت گزرتا جا رہا ہے۔ وقت جو کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ وقت جو ظلم کی حد تک تیز رفتار ہے۔ جو گزرتا ہے۔ تو روح پر خراشیں چھوڑ جاتا ہے۔

ــــــ رات کے دس بجے ہیں اور ہم سب یونیورسٹی انکوائری آفس کے قریب لگے ہوئے نوٹس بورڈ پر اپنا نتیجہ دیکھ رہے ہیں۔ زارا نے مجھے اوّل آنے پر مبارک باد دی ہے۔ اور فیاض نے بھی ــــــ گو بجھے ہوئے دل سے ــــــ

اور یہ میں ہوں جس نے مقابلے کا امتحان دیا ہے۔ اور نہ جانے کس اتفاق سے اوّل آگیا ہوں شاید

یہ ممتحن احمق ہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ کس کو کونسا درجہ ملنا چاہیئے۔ لیکن یہ باتیں تو مجھے بعد میں معلوم ہوئیں ——— اس وقت تو اس درجہ کو میں اپنا حق سمجھا تھا۔

یہ زارا ہے۔ اس کی انگلی میں منگنی کی انگشتری پہناتے وقت ایک لمحہ کو میں نے کچھ سوچا ——— مجھے اپنی ماں کا وہم یاد آگیا ہے۔ یہ میری ماں کی منگنی کی انگوٹھی ہے۔ اس سے نہ جانے کتنی یادیں، کتنے تاثرات وابستہ ہیں۔ یہ میری ماں کا سہاگ ہے۔ لیکن میری ماں نے کہا تھا" بیٹے یہ انگوٹھی دیتے مجھے وہم آتا ہے۔ اللہ زارا سدا سہاگن رہے۔" ——— میں نے ہنس کر اس بات کو ٹال دیا تھا۔ میری ماں کا سہاگ اگر صرف دس برس قائم رہا تو ہمیں اس انگوٹھی کی تو کوئی خطا نہیں ———

اور یہ میں ہوں۔ اس گزٹ میں اس اعلان کو پڑھ رہا ہوں۔ کہ فیاض کو ترقی دے دی گئی ہے۔ لیکن ترقی کے لئے پہلا نمبر تو میرا تھا۔ فیاض تو اکیادن نمبر پر تھا لیکن میں یہ بھول گیا ہوں۔ کہ فیاض کے وزیر محکمہ سے مراسم ہیں۔ اور ترقی کے بھی قاعدے قوانین ہیں۔

میں ابھی تک یونیورسٹی کا سر پھرا طالب علم ہوں۔ اور ایک بہت تیز قسم کا احتجاجی خط لکھ دیتا ہوں اب میرا تبادلہ ڈیرہ غازی خاں ہو گیا ہے اور کشتی کا ملاح مجھ سے پوچھ رہا ہے۔ کہ مجھ سے کیا خطا ہوئی۔ اور میں بہت گھمبیرتا سے کہتا ہوں۔ ترقی کے اُمیدواروں میں میرا نمبر پہلا تھا۔ بس یہی میری خطا تھی ——— ایک ہی ہفتہ میں میرا شعور پختہ ہو گیا ہے۔ اور وہ باتیں جو میں برسوں میں نہ سمجھ پاتا۔ چند گھنٹوں میں میری سمجھ میں آگئی ہیں۔

میں آتشدان کے قریب آرام کرسی پہ بیٹھا ہوں۔ میرے پہلو کی تپائی پر زارا کا خط کھلا رکھا ہے اور اس کے قریب وہ انگوٹھی رکھی ہے جو میری ماں کا سہاگ تھی۔ اس میں سرخ نگینے جڑے ہیں۔ ——— جھوٹے ہوں گے ——— دو دن اور دو راتیں گزر گئی ہیں۔ یہ خط یہیں رکھا ہے۔ میں یہیں بیٹھا ہوں۔ آنے والے دنوں میں میں یہ کبھی نہ سمجھ سکا۔ کہ میں کیوں کر ایک جگہ ایک ہی پہلو اتنی دیر بیٹھا رہا۔ لیکن وہ دن ایسے تھے۔ جب مستقبل ایک بے معنی لفظ تھا۔ جب کوئی صبح نئی صبح نہ تھی۔

اور یہ ایک سرکاری تقریب ہے۔ جس پہ زارا فیاض کے ساتھ موجود ہے۔ زارا اور فیاض ———

یہ دو اب ایک وجود ہیں۔ یونیورسٹی کے زمانہ میں کبھی اس کا تصور بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔ اب یہ واقعہ ہے کوئی صاحب مجھ سے عشق کے مسئلہ پر گفتگو کر رہے ہیں۔ بہت ہنس کر میں نے کہا —— "صاحب میں تو اس نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ کہ دنیا میں دو قسم کے مرد ہیں۔ اور ان دو قسموں کے علاوہ اور کوئی قسم نہیں۔ ایک وہ جن سے عشق کیا جاتا ہے۔ اور دوسرے وہ جن سے شادی کی جاتی ہے۔"

"خوش قسمت کون ٹھہرا۔ ؟" —— انہوں نے اورنج جوس کا گلاس مجھے تھماتے ہوئے پوچھا۔

" دونوں ہی بدنصیب اور نامراد ہیں۔ ایک کو گھر اور اس کی وہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں کبھی نصیب نہیں ہوتیں۔ جن کا اس نے محبوب کی معیت میں تصور کیا تھا۔ دوسرے کو وہ گداز اور دل کی وہ گرمی نصیب نہیں ہوتی۔ جو ہونا چاہیئے تھی۔ ایک کو محبت کے لمحے مل جاتے ہیں۔ وجود نہیں ملتا۔ دوسرے کو وجود مل جاتا ہے۔ محبت کے لمحے نہیں ملتے۔ بہرحال محروم دونوں ہی رہتے ہیں۔" —— اگر پُرسکون گھر اور محبت کی گداز تپش آپس میں گھل مل جائیں۔ تو کیا ہو —— ؟ میں نے چپکے سے خود سے پوچھا۔

ان صاحب نے بزاخفش کی طرح سر ہلایا: "خوب تھیوری ہے آپ کی ——" اور بات ذرا جو ان کی سمجھ میں آئی ہو۔ اپنا گلاس رکھنے کے لئے جب میں میز کی طرف بڑھا۔ تو وہاں زارا تھی۔ اور اس کا رنگ خزاں کے پتے کا سا تھا —— کیا میں نے تمہیں اذیت پہنچائی ہے میں کس قدر کمینہ ہو گیا ہوں۔ ذہن کی تلخی نے میری زبان بھی تلخ کر دی ہے۔ زارا —— زری —— میں تمہیں اس نام سے پکارنا چاہتا ہوں۔ جس کا مجھے کوئی حق نہیں رہا۔

وقت گزرتا جا رہا ہے۔ میرے ریٹائر ہونے میں ایک مہینہ باقی ہے۔ صرف تیس دن —— میں بالآخر اس عہدے پر پہنچ چکا ہوں۔ جس پر مجھے آج سے پچیس سال پہلے پہنچ جانا چاہیئے تھا لیکن جس کو وہ عہدہ مل گیا تھا۔ وہ آج ڈائریکٹر جنرل ہے۔ اس کے فضول سرکلر آتے ہیں۔ اور میں تعمیل کرتا ہوں۔ وہ محکمہ کی میٹنگ میں صدارت کرتا ہے۔ اور میں چپ رہتا ہوں۔ بولنے سے کوئی

فائدہ نہیں۔ کہیں میرے ذہن کی تلخی زبان تک نہ آجائے۔

میں ہمیشہ کلچر کا بہت شدت سے قائل رہا ہوں۔ کلچر لباس کا اور فرنیچر کا نام نہیں۔ نفیس کٹ کے سوٹ پہنے جا سکتے ہیں۔ بہترین فرنیچر خریدا جا سکتا ہے۔ لیکن ذہن کا کلچر خریدا نہیں جا سکتا۔

ذہن —— جذبات —— اور احساسات ——

—— کلچر کی پرکھ تو یہاں ہوتی ہے۔

میں اس کلچر تلے پس گیا ہوں۔

کتنی فضول۔ بیکار مہمل کہانی ہے۔ ایک عامیانہ کہانی —— ایک عامیانہ خواہش ——

اس میں وہ رنگ کہاں ہے جس کی میں نے خواہش کی تھی۔

زندگی کی یہ فلم جو ابھی ابھی میں نے دیکھی۔ اس میں کوئی خاص بات نہیں۔ وہی عام خطوط ہیں۔ جن پر ہماری فلمیں بنتی ہیں۔ ہماری کہانیاں لکھی جاتی ہیں۔ کوئی انوکھی چونکا دینے والی بات نہیں۔ کوئی آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی چکا چوند نہیں —— کوئی رنگ نہیں —— کوئی بو نہیں —— لیکن اس کے باوجود دل میں ایک درد ہے۔ اس درد کو کوئی نام بھی نہیں دیا جا سکتا۔ اس کی کوئی واضح صورت بھی نہیں —— یہ تو بہت دھندلا سا اک درد ہے۔ جیسے کانٹا چبھا رہ جائے۔

وہ صورتیں اور وہ آرزوئیں بہت دھندلا گئی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں۔ میں اپنے خول میں رہتا ہوں۔

لیکن آج میں اپنے خول سے نکل کر کچھ سوچ رہا ہوں۔ مجھے اپنے وجود کی شدت کا ایک بار پھر احساس ہوا ہے۔ کوئی یہ نہ سمجھے۔ کہ میں کسی رخسار یا زلف کا ذکر کروں گا —— یہ تو صرف میری مجروح انا ہے۔ صرف میری اپنی ذات ہے —— اور اس ذات پر جو کچھ گزرا۔ وہ ایک ایسی عام کہانی ہے جو اس وقت تک دہرائی جاتی رہے گی۔ جب تک انسانیت اپنی آخری جنگ جیت نہیں لیتی۔ محاذ جنگ پر سناٹا ہے۔ بعض لڑائیاں بہت خاموشی سے لڑی جاتی ہیں۔ اس سناٹے میں میں کن طاقتوں کا ساتھ دوں گا؟ کیا میرے ساتھ دینے سے کوئی فرق پڑ جائے گا!؟ کیا یہ وہ قدم ہو گا۔ جس سے ہزاروں میل کے کسی سفر کا آغاز ہوتا ہے۔

میرے سامنے کاغذ بکھرے پڑے ہیں - ابھی ابھی میرے پی ۔ اے نے مجھ سے پوچھا ہے ۔ کیا میں ڈکٹیشن دوں گا ؟ ——— ذرا تھم جاؤ ۔ مجھے فیصلہ کرنے دو ۔

میرے سامنے اس وزیر کا چہرہ آگیا ہے ۔ جس کی وجہ سے میری ترقی رک گئی ۔ اور میں نے دو سال ڈیرہ غازی خاں میں گزارے ۔ وہ سرد نامہربان طویل برس ۔

میرے سامنے وہ دو دن آگئے ہیں ۔ جو میں نے آتش دان کے قریب ایک کرسی پر بیٹھے بیٹھے گزار دیے تھے ۔

میرے سامنے ایک خزاں کے زرد پتے جیسا چہرہ آگیا ہے ۔ زارا ——— زری ——— کیا میں نے تمہیں دکھ پہنچایا ہے ۔

لیکن تمہاری تو کوئی خطا نہ تھی ۔ نہ تمہاری نہ فیاض کی ——— تم دونوں تو میری ہی طرح صرف اس مشین کے پرزے ہو جو ہمیں پیستی ہوئی گزرتی چلی جا رہی ہے ۔ تم نے تو وہ ہی کیا ۔ جو منطقی طور پر کیا جانا چاہیے تھا ۔

لیکن میں تم سے پوچھتا ہوں ۔ جس کے صرف ایک کاغذ پر دستخط کر دینے سے میری روح اتنی ناہموار ، اتنی کھردری اور اتنی بدنما ہو گئی ہے ۔ اور میں روح کے کلچر کا قائل تھا ۔ کیا تم مجھے میری روح کی خوشنمائی لوٹا سکتے ہو ۔

اور تم کیا محسوس کرو گے ۔ اگر آج میں برس ہا برس کے بعد تم سے انتقام لے سکوں ۔

تمہارے بیٹے کی فائل میرے سامنے رکھی ہے ۔ ترقی کا مسئلہ ہے ۔ اور اس کا نمبر اول ہے لیکن کیا تمہیں اس دکھ سے نہیں گزرنا چاہیئے ۔ جس سے میری ماں گزری ——— کوئی زارا شاید صرف اس فیصلے کی منتظر ہے ۔ اور اگر یہ اُلٹ ہوا ۔ تو تمہارے بیٹے کو منگنی کی انگوٹھی معذرت کے خط کے ساتھ واپس مل جائے گی ۔ اور تمہارا بیٹا زندگی بھر اپنے سے کمتر ذہن کے ایک شخص کے پیچھے رہتے سرکلرز کی تعمیر کرتا رہے گا ۔ اور محکمہ کی میٹنگ میں صاحب صدر کے ارشادات سن کر دانت پیس پیس کر رہ جائے گا ۔ اور ایک دن وہ بھی روح کا کلچر کھو بیٹھے گا ۔ اور میری

طرح کا تحفظ ہو جائے گا۔

لیکن میرے سامنے تمہارے بیٹے کا چہرہ آجاتا ہے۔ وہ کس قدر ذہین ہے۔ اور کس قدر صلاحیت کا مالک اس کی بڑی بڑی حساس دیانت دار آنکھیں ہیں ——

لیکن مجھے تمہارے بیٹے کا چہرہ نہیں روک رہا —— میری راہ میں کوئی ایک فرد زنجیر بن کر حائل نہیں —— یہ جنگ جو میرے دل میں جاری ہے۔ اس کا واسطہ کسی اور جنگ سے ہے —— اس مورچہ پر لوگ بلا لحاظ ملک و ملت اور رنگ و نسل لڑتے ہیں۔

مجھے یہ خیال آ رہا ہے۔ کہ شاید یہ قدم وہ قدم ہو۔ جس سے ہزاروں میل کے سفر کا آغاز ہوتا ہے اگر میں خیر و شر میں تمیز کر سکوں۔ تو شاید حال اور مستقبل کے درمیان فاصلہ کم ہو سکے۔ شاید میں مستقبل کی خوشیوں میں ذرا سا ہی اضافہ کر سکوں۔ یہ ہمارے بچوں کا حق ہے۔ اور تمہارا بیٹا صرف تمہارا اپنا بیٹا ہی نہیں۔ ایک نئی نسل کا ایک نیا فرد ہے۔

دل میں اک ہنگامہ برپا ہے۔ یہ میں ہوں یہ میرے دکھ ہیں۔ بہت چھوٹے بہت حقیر —— بہر حال میرے دکھ —— اور یہ تمہارا بیٹا ہے۔ میرے چند سطور لکھ دینے سے شاید میرے دکھ کم ہو جاتے —— لیکن یہ چہرہ صرف تمہارے بیٹے ہی کا نہیں یہ تو مستقبل کا سمبل ہے —— آنے والا دن ہے —— کیا میرے وجود کو آج میں اور صبح کی پہلی کرن میں حائل ہونا چاہیے۔

میں نے تمہارے بیٹے کی فائل پر دستخط کر دیے ہیں۔ میں نے اسے ذہین کی اس تلخی سے بچا لیا ہے۔ جو تم نے میرا مقدر بنا دی تھی۔ ابھی چند لمحوں بعد میرا پی اے آکر اس فائل کو لے جائے گا۔ میں نے آخری سگریٹ ختم ہونے سے پہلے بجھا دیا ہے۔ راکھ دان سگریٹ کے بجھے ہوئے ٹکڑوں اور راکھ سے اٹا پڑا ہے۔ ہوا کا ایک خنک جھونکا مجھے چھوتا ہوا گزر گیا ہے۔ فیصلہ کر لو۔ تو طوفان تھم جاتا ہے —— شاید ہزاروں میل کے سفر کا آغاز ہو چکا ہے!

نزدیک رگِ جاں

علی قاسم ! میرا تم سے کیا رشتہ ہے ؟ ــــــ یہ میرے دوست مجھ سے پوچھتے ہیں ــــــ میں نے پکار کر تم سے پوچھنا چاہا ہے۔"کلیسا میں گھنٹیاں بج رہی ہیں۔"

"تمہارے کان بج رہے ہیں۔" ــــــ سلویا نے گھور کر مجھے دیکھا ہے ــــــ سلویا میری دوست ہے۔ اور ابھی ابھی ہنستے ہوئے میں نے اس سے کہا تھا۔"کیا فادر لیوری آج تم سے ملنے نہ آئینگے؟"

"کیوں ؟" ــــــ وہ غرائی ــــــ وہ مجھے بہت زبردست فتنہ پرداز سمجھتی ہے۔

"بات یہ ہے سلویا کہ وہ تم پر بہت محنت کر رہے تھے۔ اور اچانک میں یہاں آن دھمکی۔ سب کئے کرائے پر پانی پھر گیا۔ اور ویسے بھی وہ تمہیں کچھ زیادہ ہی پسند کرتے ہیں۔"

اس پر سلویا نے مجھے بہت پیار سے یہ سمجھانے کی کوشش کی۔ کہ دراصل بات کچھ نہیں۔ یہ سب میرے تخیل کی آوارگی ہے۔

میرے تخیل کی آوارگی میرے کام آئی۔ اور میں نے جھک کر فادر لیوری سے کہا ــــــ فادر لیوری کلیسا میں گھنٹیاں بجاؤ آج ایک مسیح مصلوب ہوا ہے اگر فادر لیوری اس لمحے یہاں ہوتے تو جھنجلا کر کہتے تمہارا کیسا انتشار زدہ ذہن ہے۔ لیکن یہ کونسی نئی بات ہے۔ یہ بات تو میں بچپن سے آپ سے سنتی چلی آ رہی ہوں۔ ذرا سا الفاظ

کا فرق ہے۔ بہت دفعہ کلاس میں آتے ہی آپ نے کہا تھا۔ تم ––– تمہارا تو دماغ بالکل خراب ہے۔

صبح اٹھ کر تیار ہونے سے پہلے میں نے برابر کے فلیٹ میں جا کر جھانکا۔

"سنو ––– سلویا! مجھے رات نیند بالکل نہیں آئی۔"

"کیوں؟"

"معلوم نہیں۔ آنا تو چاہیئے تھی۔ شاید سردی تھی۔" –––

"ہوں ––– اپنی امّی سے بات کر کے تم بہت مطمئن ہوئی تھیں۔"

"سلویا اصل میں رات کے نو بجے قرب و جوار میں ٹیلیفون ڈھونڈتے پھرے تھے۔ میں نے ایک دم اس سے کہا تھا۔ "سلویا امّی کی آواز سننے کو میرا جی تڑپ رہا ہے۔" اور اس نے کہا تھا۔ "چلو پھر کریں ٹرنک کال۔"

لیکن اس کے باوجود مجھے نیند نہیں آئی تھی –––

"رائیڈنگ کے لئے چلتی ہو۔" ––– گھوڑے والے کو دیکھ کر سلویا نے کہا۔

"نہیں بھئی ––– ابھی لائبریری جا کر اخبار پڑھنا ہے۔" "اخبار تو یہاں بھی مل سکتا ہے۔ کیا ضرورت ہے ––– روزانہ وہاں جانے کی؟"

میں نے اپنی اس خوبصورت دوست کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ لائبریری میں نصف درجن اخبار پڑھنے کو مل جاتے ہیں اور یہاں خصوصاً ––– اور زندگی میں اتنی فرصت سال ہا سال بعد نصیب ہوئی ہے۔ کہ میں صبح ہی صبح (پہلی حرف میں) نصف درجن اخبار پڑھ سکوں۔ تو پھر کیوں نہ موقعہ کا فائدہ اٹھایا جائے۔ کہ دل کو تقویت اور ذہن کو جلا نصیب ہو۔

لائبریری میں جا کر سب اخبار پڑھ ڈالے۔ سوائے پاکستان ٹائمز کے ––– اور پھر کمبخت لائبریری بند ہو گئی۔ یہ بار بجے معلوم بھی نہیں ہوتے۔

وہاں سے نکل کر میں نے جنرل پوسٹ آفس کا راستہ پکڑا ––– پاکستان ٹائمز میں وہاں جا کر پڑھتی ہوں اور اگر مطلب کی کوئی خبر ہو۔ تو خرید بھی لیتی ہوں۔

"فرکوس" مری کا کافی ہاؤس ہے۔ اور وہاں موسم خزاں میں بھی بے فکرے جمع رہتے ہیں۔
اور ٹیلیفون کی گھنٹی اور ریڈیو بیک وقت بجتا رہتا ہے ——
بے فکروں کے ساتھ ساتھ وہاں سرکاری افسر بھی موجود رہتے ہیں، جس وقت کوئی شخص ٹیلیفون کا
ریسیور چپکائے کاؤنٹر کے قریب کھڑا زور زور سے بولتا نظر آئے۔ سمجھ لیجئے کہ وہ کوئی مقامی افسر ہے۔
اور اپنے ماتحت کو ٹیلیفون پر ڈانٹ رہا ہے۔

جب کوئی افسر ٹیلیفون پر مسلسل ڈانٹ ڈپٹ کرے، اور ساتھ ہی ریڈیو سے خبریں شروع ہو جائیں۔
تو میں جاکر ریڈیو سے چپک جاتی ہوں۔ کہ شاید میں اپنے بھائی کا نام سن سکوں۔ جو آجکل ٹیسٹ کرکٹر
بن گیا ہے۔ اگر اخبارات سچ بولتے ہیں تو کل ولیس متھائس اور میرے بھائی نے بڑودہ میں اپنے ملک
کو تباہی سے بچالیا۔ اور دونوں کو یہ بڑی سرخی ملی۔

لیکن علی قاسم! تمہیں اپنا لہو دے کر بھی کوئی سرخی نہ ملی۔

اور میں نے اپنے بھائی کو خط لکھا تھا۔ پارٹنر اب تو تم بہت اہم شخصیت بن گئے ہو۔ کہ زکام
ٹھیک ہو جائے۔ تو ریڈیو سے خبروں کے وقت اعلان ہوتا ہے کہ اب وہ صحت یاب ہو رہے ہیں ——
بڑے آدمیوں کی بڑی باتیں ——!

اور میں نے اپنی ماں سے فون پر کہا تھا —— "مما ڈیئر سب بچے قرینے سے جیئے۔ سوائے
اس کالی بھیڑ کے۔"

اور ریلوے اسٹیشن پر اپنے بھائی کو خدا حافظ کہتے وقت میں نے کہا تھا۔

"وہاں میرے بیشمار دوست ہیں۔ وہ تم سے میرا بھائی ہونے کے ناطے بہت پیار سے ملتے۔
لیکن برادر! تم ان سے نہیں مل سکتے اس لئے آج کے دن تم اپنی بہن کو معاف کر دینا۔ کہ وہ اپنے چھوٹے
بھائی کو پردیس سدھارتے سمے کسی کے نام کوئی خط نہیں دے سکتی۔ میرے اور تمہارے راستے جدا ہیں۔
ہم اپنی اپنی جنگ تنہا ہی لڑیں گے۔

لیکن علی قاسم! میری اور تمہاری راہ تو ایک تھی —— ہم تو ایک ہی جنگ کے ساتھی تھے۔

اس جنگ میں کام آنے والوں کو اخبار میں کوئی سرخی نصیب نہیں ہوتی۔ پھر دکھ سے بھرپور لمحہ کا کوئی پیغام میرے دل تک کیوں نہ پہنچا —— کیا پہرے بڑھ گئے ہیں۔ یا میرا ہی دل بے حس ہو گیا ہے۔

کافی گھر کے روشن دریچے کے قریب بیٹھے ہوئے میں نے کرسی کو مضبوطی سے تھام لیا۔ ڈرائنگ روم میں ریڈیو پوری آواز سے بج رہا تھا۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بج رہی تھی —— اور میرے سامنے اخبار کھلا رکھا تھا —— یہ کسی اہم ورق کی کوئی سرخی نہیں تھی —— صرف ایک غیر اہم ورق کے غیر اہم کالم کی چند سطریں تھیں۔

بیرے نے میرے قریب آن کر کہا۔

"آج کے اخبار میں ایک بہت دلچسپ خبر ہے بی بی —— ایبٹ آباد کی ایک لڑکی نے فلم اسٹار اعجاز کو ایک محبت نامہ لکھا ہے۔ اور بالوں کی ایک لٹ بھیجی ہے۔"

آج کے اخبار میں بہت سی خبریں ہیں میرے بھائی —— ایک اور خبر بھی ہے —— اس نوخیز عشق سے بھی زیادہ اہم —— میرے بھائی کے سنسنی خیز بنانے سے بھی زیادہ اہم —— یہ بھی ایک عشق ہے —— یہ بھی ایک سنسنی ہے۔ لیکن علی قاسم! تمہیں سرخی کیوں نہ ملی! چلو تم نے اپنے ملک کو تباہی سے نہ بچایا —— نہ سہی —— کیا تم ایبٹ آباد کی اس نوجوان لڑکی سے بھی گئے گزرے ہو —— تم نے بھی تو ایک عشق کیا ہے۔

علی قاسم! شب فرقت بہت طویل تھی۔ اور رقیب کے ہاتھوں بہت رسوائی ہوئی —— لیکن دشمن سے تم توقع ہی کیا رکھ سکتے ہو! —— اُن دکھوں کو بھول جانا جو پرایوں کے ہاتھوں پہنچے۔ صرف اس پیار کو یاد رکھنا جو تمہیں اپنوں نے دیا ——

اور میرے دوست مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ میرا تم سے کیا رشتہ ہے۔

وہ خبر پڑھ کر بہت دیر تک میں ڈرائنگ روم میں بیٹھی رہی۔ بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ ریڈیو بج رہا تھا۔ اور ٹیلیفون کی گھنٹی بج رہی تھی اور میرا ایک واقف آ گیا تھا۔ وہ میرے سامنے کبھی کبھی تکلفاً اپنا رشتہ ہم سب سے جوڑتا ہے۔ میں نے اس رشتہ کا سہارا لینے کی کوشش کی۔

"تم علی قاسم کو جانتے تھے؟"

"اچھا ـــــ وہ! ـــــ" اس نے لاپرواہی سے شانے اچکائے۔ اس کی نظر میں علی قاسم مرے ہوئے چوہے سے زیادہ وقعت نہ رکھتا تھا۔ "تم تو خیریت سے ہو نا؟"

"بالکل" ـــــ میں نے دانت بھینچ کر جواب دیا۔ "کسی چیز کی ضرورت؟" اور وہ جلدی سے باہر چلا گیا۔ مجھے بہت غصہ آیا۔ اس شخص کی عقل کو کیا ہو گیا ہے۔ ـــــ پاگل کتوں کو بھی بھلا کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ تو اس قابل ہیں کہ گولی سے اڑا دیے جائیں اور ایک روزنامہ میرے سامنے رکھا ہے۔ اس میں ہر تیسرے دن ایک ایڈیٹوریل پاگل کتوں اور طاعون زدہ چوہوں کے بارے میں ہوتا ہے۔

میں نے بہت اشتیاق سے اس کے ورق الٹے۔ لیکن وہ خبر کہیں نہیں ـــــ صرف ایک ایڈیٹوریل ہے۔

"اگر ان لوگوں کو معلوم ہو۔ کہ بات بم بنانے سے بنے گی ـــــ تو یہ بم بناتے ہیں۔ اگر معلوم ہو کہ نظم اور کہانی لکھنے سے بنے گی۔ تو نظم اور کہانی لکھتے ہیں۔"

مجھے بہت ہنسی آئی ـــــ آج کے دن بھی یہ شخص خاموش نہیں رہ سکا۔ اس لمحے کے احترام میں دنیا بھر کے ہنگاموں پر چند لمحوں کے لئے سکوت چھا جاتا ہے۔ بڑے بڑے سنگ دل اس لمحے تمام اختلافات کو بھول کر ایک لمحہ کے لئے ایک سنگین حقیقت کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں ـــــ لیکن یہ شخص آج بھی خاموش نہیں رہ سکا۔

آج کے دن اس روزنامہ کے دفتر کی عمارت پر چراغاں ہونا چاہیے۔

ایک بجنے میں دس منٹ تھے۔ اور دس منٹ بعد خبریں نشر ہوں گی۔ لیکن میں نہیں سنوں گی مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ کہ آج کے دن میرے وطن کو تباہی سے کون بچاتا ہے ـــــ میرا بھائی ـــــ یا کسی اور کا بھائی ـــــ

ایک سناٹے نے میرے دل کو محیط کر لیا ہے۔

اخبار ہاتھ میں لیئے میں لوٹ آئی۔ سلویا نے اپنے فلیٹ میں سے جھانکا ——

"تم اخبار لائی ہو —— کیا آج پھر تمہارے بھائی نے کوئی معرکہ کر ڈالا ہے —— "

"کون سا بھائی !" —— میں نے احمقوں کی طرح اسے دیکھا —— پھر میں نے اپنی آنکھیں جھپکیں —— لاحول ولا قوۃ —— میرے کون سے دس پندرہ بھائی ہیں —— "نہیں" —— میں نے اپنا کھویا ہوا وقار بحال کرنے کی کوشش کی —— "آج ایک اور خبر ہے —— میرے بھائی کے معرکہ سے بھی زیادہ اہم۔"

"تم تیار ہو جاؤ —— لارنس کالج جانا ہے آج —— استری لا دوں؟"

"کس لئے ؟" —— میں خفا ہو گئی، حالانکہ صبح جب ہم نے لارنس کالج جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ تو میں نے اس سے کہا تھا —— استری ٹھیک ٹھاک کروا رکھے۔" اور تو سب ٹھیک ہے پلگ نہیں ہے اس میں —— خیر میں لگوا لوں گی۔"

"پلگ کی کیا ضرورت ہے بھئی —— تاریں ہی اٹکا دیں گے —— اس قسم کے کام میں نے بہت کیئے ہیں۔"

اور اب میں اس سے اس بات پر خفا ہوں۔ کہ اس نے استری کا پوچھا ہی کیوں ——

"میرے کپڑے بالکل ٹھیک ہیں۔ بدلنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" —— میں نے خود کو دیکھا —— اور پھر سلویا کو —— وہ اپنے فیروزی رنگ کے سوٹ میں بہت اچھی لگ رہی تھی۔ جمپر پہ چاندی کے بٹن تھے —— اور کانوں میں چاندی کے جھمکے —— میں نے یہ ساری جزئیات نوٹ کیں —— اور پھر اس سے کہا —— "چلو۔"

—— اور جب وہ صرف اپنا کارڈیگن پہنے باہر نکلی۔ تو میں نے اسے غور کر دیکھا —— "اپنا کوٹ بھی لے لو ——"

"وہ بھالو کوٹ —— وہ بہت بوجھل ہے ——" اس نے ناک چڑھائی —— "اور اگر خشکی بڑھ گئی تو !" —— میں نے اپنی اُونی ٹوپی کا بٹن بند کرتے ہوئے کہا۔

" تم نے دیکھا علی قاسم ! زندگی کیسی اہم چیز ہے۔ انسان اپنے اور اپنے آس پاس کے لوگوں کیلئے سردی اور گرمی کا اہتمام کرتا ہے۔ ایسا کرتے وقت مٹی اور سناٹے اور تاریکی کو بھول جاتا ہے۔

اور لارنس کالج کی طرف شارٹ کٹ سے جاتے ہوئے ہم ایک بڑے سے چٹانی پتھر پر بیٹھ گئے۔ میں فوراً اس پر سے اُٹھ گئی۔ لاحول ولا قوۃ کیسی پھسلن ہے۔ اور ایک نسبتاً چھوٹے پتھر پر جا بیٹھی۔ اور سلویا کو ایک عمدہ لیکچر مذہب، فلسفہ، سیاست۔ اور نہ جانے کس کس چیز پر پلا ڈالا۔ سلویا غضب کی سننے والی ہے۔ بڑے تحمّل سے میری بکواس سنتی ہے۔

جب کہ ایک روز فادر لیوری میرا ایک اسی قسم کا لیکچر سن کر بُرا مان گئے تھے ــــ" اب تم سیاست۔ کو مذہب کے درمیان لا رہی ہو ــــ"

" سیاست کہاں نہیں ہے۔ مائی ڈیئر فادر ــــ" میں نے ان کے بُرا ماننے کا ذرا بُرا نہیں مانا "کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ تمہارے مشنز کے پیچھے نہیں ہے یا تمہارے کانوینٹس کے اندر نہیں ہے یا تمہاری معیشت کے عقب میں بصد انداز دلربائی جلوہ گر نہیں ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی جب آئی۔ تو یہ مت بھولو کہ یونین جیک بھی آیا تھا۔ اور ہمارے ہی ملک میں رہ کر تم نے اور تمہارے ہم وطنوں نے وہ نوٹس لگائے تھے "ہندوستانیوں اور کتوں کا داخلہ ممنوع ہے ــــ"

"یہ سچ ؟" ــ فادر لیوری نے زبردستی جاہل بننے کی کوشش کی۔

" لاعلمی کا اظہار مت کرو فادر لیوری ! ــــ تم خوب جانتے ہو ــــ اور مجھے غرا کر بھی مت دیکھو ــــ مدت گذری میں ہائی سکول پاس کر چکی۔ اور تمہارے کانونٹ سے اپنی روح ثابت و سالم لے آئی۔ اب کبھی ایسا نہ ہو گا۔ کہ میں کوئی شرارت کروں ــــ اور کوئی سسٹر مجھے تمہارے پاس بھیجے۔ کہ میں جا کر تمہارا وعظ سنوں۔ اب تو میں تمہیں وعظ پلا سکتی ہوں۔"

مجھے یاد ہے۔ میری کلاس کی کچھ لڑکیوں نے شکایت کی تھی۔ کہ میں آج کل دہریت پر لیکچر دیتی ہوں۔ اور سن سن کر اُن کے کان پک گئے ہیں ــــ اور یہ کہ میرے پاس کتابیں ہیں ــــ تب سسٹر نے میرا ڈیسک کھول کر وہ کتابیں نکال لیں۔ اور مجھ سے پوچھا۔ "کیسی غیر اخلاقی حرکت ــــ

تم یہ کتابیں پڑھتی ہو؟" "کیسی غیر اخلاقی حرکت ـــــ" میں نے کہا تھا۔ "آپ نے بغیر میری اجازت میرا یہ ڈیسک کھولا ـــــ"

"تمہاری روح بالکل تباہ ہو گئی ہے" ـــــ مسٹر نے چلا کر کہا تھا۔ اور پھر مجھے تمہارے پاس بھیج دیا تھا۔ کہ تم مجھے ایک عدد لیکچر روح کی حفاظت کے بارے میں دو ـــــ۔

میں نے وہ لیکچر چپ چاپ سن لیا تھا۔ لیکن آج کے دن نہیں سنوں گی۔ آج کے دن تمہیں میرا لیکچر سننا ہو گا ـــــ ہر لڑائی دیانت داری سے لڑی جانی چاہیئے ـــــ اب پلڑے ہم وزن ہیں۔ اب کرو بات ـــــ!

اور فادر لیوری نے آنکھوں میں چمک پیدا کر کے کہا تھا۔ رجیسے کوئی بھولی بسری بات یاد آجائے)" میرا خیال ہے تم اخلاقی مریض ہو ـــــ"

"میری اخلاقیات بالکل ٹھیک ہے ـــــ"

"جو یہ کہتے ہیں۔ ان کا تو میں کبھی اعتبار نہیں کرتا ـــــ"

"تم غلط سمجھ رہے ہو فادر لیوری! میری اخلاقیات اس لئے ٹھیک ہے کہ وہ بالکل میری اپنی اخلاقیات ہے۔"

"تم سب لوگ یہی کہتے ہو ـــــ" ـــــ فادر لیوری پژمردہ ہو گئے

"سب لوگوں سے آپ کی کیا مراد ہے؟" ـــــ میں نے دھاڑ کر پوچھا

"میرا مطلب ہے تم لوگ!" ـــــ فادر لیوری چبا چبا کر باتیں کر رہے تھے۔

"آپ کو کیسے خبر؟"

"مری بہت مختصر جگہ ہے میری بچی ـــــ اور خبریں یہاں تیزی سے سفر کرتی ہیں۔ جب پہلی شام تمہارے فلیٹ میں روشنی ہوئی۔ تو میں نے سلویا سے کہا تھا ـــــ سلویا تمہارے ہمسائے میں ایک سرخ بتی جل رہی ہے۔ یہ خطرے کا نشان ہے ـــــ" ـــــ فادر لیوری کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔

"شاید آپ کو بہت افسوس ہوا۔ اس محنت پہ پانی پھرتا نظر آیا۔ جو آپ سلویا پر کر رہے تھے۔ آپ لوگ کس قدر خوفزدہ ہیں۔" ـــــ میں نے شگفتگی سے کہا ـــــ

"اچھا سلویا اب میں چلتا ہوں۔" ـــــ اور فادر لیوری جلدی سے اپنی ٹوپی اٹھا کر چل دیئے تھے۔ اور دروازے کے قریب رُک کر انہوں نے کہا تھا۔

"تم خود بھی تو ایک راہبہ کی سی زندگی بسر کر رہی ہو۔"

"میں قطعاً راہبہ کی سی زندگی بسر نہیں کر رہی۔"

ـــــ اب میری باری تھی کہ بُرا مانوں ـــــ

علی قاسم! تاریکی کا پردہ ہٹا کر ایک نظر اس سمت دیکھو ان لوگوں کو بتاؤ۔ کہ رہبانیت سے ہمیں کوئی واسطہ نہیں ـــــ کوئی انسانی سکھ اور کوئی انسانی دُکھ ہم سے ناآشنا نہیں ـــــ

اور پھر ہم نے اپنا سفر شروع کیا۔ اور لارنس کالج پہنچنے کے بعد میں ایک فینس کے قریب بیٹھ گئی ـــــ

"کتنی چھوٹی سی خوبصورت فینس ہے۔" ـــــ سلویا نے کہا۔

"ہاں مجھے سب خوبصورت چیزوں سے پیار ہے۔" ـــــ میں نے کہا اور سوچا کہ اس پیار کی حسرت سے میرا دل پگھلا جا رہا ہے ـــــ

جونیئر سکول کے لان میں بچے کھیل رہے تھے۔ "ہم ان بچوں کے لئے لڑ رہے ہیں" ـــــ

"کیا کہا ـــــ" سلویا نے چلا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں" ـــــ میں برا مان گئی ـــــ "میں قطعی اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہوں۔"

سینئر سکول کے قریب لڑکے ٹینس کے ریکٹ لئے غل مچا رہے ہیں۔

تم یہ سمجھتے ہو۔ کہ ہم یہ ٹینس کے ریکٹ تم سے چھین لینا چاہتے ہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم تو صرف یہ سمجھتے ہیں۔ کہ ٹینس کے یہ ریکٹ صرف چند لوگوں کا اجارہ نہیں۔

ہم تم سے تمہارے قہقہے بھی نہیں چھین رہے۔ ہم تو صرف چاہتے ہیں کہ ساری دنیا کو قہقہے

لگانے کا حق مل جائے ـــــ خوشیاں گھر گھر ہوں ـــــ مسرتیں سب کے پاس ہوں۔

اور ان سب چیزوں کی خاطر ہم مر جاتے ہیں۔ کیونکہ ہمیں انسانوں کی چھوٹی چھوٹی مسرتوں سے بہت پیار ہے۔ اور مرتے وقت ہمیں بہت دکھ ہوتا ہے۔ اور ذرا دکھ نہیں ہوتا۔ لیکن تم لوگ یہ بات نہیں سمجھو گے۔ یہ علم ہندسہ کا آخری اور سب سے نیا فارمولا ہے۔

اور پھر اپنے میزبان پروفیسر کے بہت گھمبیر سٹنگ روم میں بیٹھ کر ہم نے چائے پی۔ اور بہت الا بلا کھایا۔ اس نے انتہائی مکمل میزبان کے طور پر دنیا بھر کے آرام اس کمرے میں جمع کرنے کی کوشش کی۔ اور جب وہ ہیٹر لینے کے لئے دوسرے کمرے میں گیا ـــــ تو میں نے آنکھیں پھاڑ کر سلویا سے کہا ـــــ " یعنی اس شخص کی کوئی بیوی نہیں ہے۔ تو پھر یہ کمرہ اس قدر صاف کیوں ہے۔"

" یعنی اس میں بُرا ماننے کی کیا بات ہے ؟" سلویا نے بھی آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھا۔

پروفیسر سٹر پسٹر کرتے ہوئے واپس آ رہا تھا ـــــ میں چپ ہو گئی۔

اس نے ہیٹر ہمارے قریب رکھ دیا۔ " کیا یہ ہیٹر بھی آپ نے خود بنایا ہے ؟" ـــــ میں نے انتہائی کلچرڈ انداز خود پر طاری کر کے کہا۔ " ہاں اسے بھی میں بناتا بگاڑتا رہتا ہوں۔" پروفیسر نے اطلاع دی۔ یہ سوال مجھے اس لئے پوچھنا پڑا۔ کہ آتے ہی جب میں نے ٹیبل لیمپ کی تعریف کی۔ تو معلوم ہوا۔ کہ یہ پروفیسر نے خود بنایا ہے۔ میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

" اور یہ گلدان بھی کیا آپ نے بنایا ہے ؟" ـــــ میں نے منٹیل کی طرف اشارہ کیا۔

" نہیں یہ خریدا ہے۔"

" تم اس پر پینٹ کیوں نہیں کرتے ؟" سلویا نے سوال کیا۔

" سلویا ـــــ " میں نے آہستہ سے کہا۔ " اس گلدان کی ساری خوبصورتی اس کی ساخت میں ہے، کتنے واضح خطوط ہیں۔ اس پر پینٹ کیا گیا۔ تو ساری خوبصورتی مر جائے گی۔"

یہ میں نے یوں کہا۔ گویا سلویا کی تجویز ہی سے اس کی خوبصورتی مر گئی ہو۔

" تم نے دیکھا۔ علی قاسم ! ـــــ خوبصورتی کو مرتے ذرا دیر نہیں لگی ـــــ ایک فقرہ ـــــ

صرف ایک فقرہ —— اور جسم جسم کی خوبصورتیاں مرجاتی ہیں۔"

اور پھر ہمارے میزبان نے آتشدان میں آگ جلائی۔ اور سلویا نے کسمسا کر مجھے دیکھا۔

" اب تو اُٹھنا اور بھی دشوار ہوگیا ہے۔"

" تم انتہائی کاہل ہو" —— میں نے اسے غصے سے دیکھا۔

" جیسے تم خود نہیں ہو۔" سلویا نے بھی مجھے غصے سے دیکھا۔

اور ہم دونوں باؤلوں کی طرح ہنسے۔ اور ہمارے میزبان نے جو آتشدان کے قریب کھڑا لکڑیاں ٹھکانے لگا رہا تھا۔ ہمیں گھبرا کر دیکھا۔ جیسے ہم اس پر ہنس رہے ہوں۔

" کچھ نہیں" —— میں نے ہنسی کو روکنے کی ناکام کوشش کی —— ہم لوگ صرف ہنس رہے ہیں ——

اگر اس لمحے میری بہن میرے قریب ہوتی۔ تو کہتی —— " توبہ ہے جو لوگ تمہیں جانتے نہ ہوں۔ وہ یہی سمجھیں۔ کہ تم ہسٹریکل ہو اس بری طرح سے ہنستی ہو۔"

اور میں ہنسی کو روکنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہوں۔" لیکن تم سب تو جانتے ہو۔ اور جو نہیں جانتے ان کی کیا پرواہ —— !"

" میرا خیال ہے تمہیں اس ہنسی کی ضرورت ہے۔" —— میزبان نے مجھے غور سے دیکھا۔

یعنی تمہیں کیا خبر ؟ —— مجھے اور بھی ہنسی آئی " بات یہ ہے۔ پروفیسر کہ آج کے اخبار میں ایک بہت دلچسپ خبر تھی۔" —— میں نے باؤلوں کی طرح ہنستے ہوئے کہا۔" ایک شخص کے بارے میں "

آتشدان میں آگ پوری طرح سے بھڑک اٹھی تھی —— کمرے میں بے تحاشا روشنی تھی۔ اور بے تحاشا آگ تھی۔

" آج میں نے ایک شخص کی موت کے بارے میں پڑھا ہے۔"

ایک شعلہ بھڑک کر خاموش ہوگیا —— ایک لکڑی سے چٹاخ کی آواز نکلی۔ اور وہ آتشدان

کے سامنے بنے ہوتے پلیٹ فارم پر آن گری ــــــ

ہمارے میزبان کے مستعد ہاتھ آگے بڑھے اور اس نے لکڑیاں پھر آتشدان میں جما دیں۔

"اس سے تمہارا کیا رشتہ تھا ؟" ــــــ میزبان نے مہربان لہجہ میں پوچھا

ایک انگارہ پلیٹ فارم پڑا سلگتا رہا ــــــ

علی قاسم ! میرا تم سے کیا رشتہ تھا ؟ ــــــ میں نے تم سے پوچھا

کیا صرف وہ رشتہ تھا ۔ کہ آتشدان میں چند لکڑیاں پڑی سلگتی رہیں ۔ اور کمرہ روشنی سے اور آگ سے پر نور ہو جائے ، وہ لکڑی جل بجھی ــــــ !

ایک انگارہ پلیٹ فارم پر پڑا سلگتا رہا ــــــ !

اور ایک مختصر زندگی کی طویل جد و جہد اخبار کے ایک غیر اہم ورق کے ایک غیر اہم کالم تک محدود ہو کر رہ گئی۔

"تمہیں شاید سردی لگ رہی ہے ۔" ــــــ میرے میزبان نے مجھے کپکپاتے دیکھ کر کہا ہے اور وہ میرا کوٹ لے آیا ہے۔ ہمارے یہاں آتے ہی اس نے ہمارے کوٹ بہت اہتمام سے اٹھاتے ــــــ اور لے جا کر کہیں لٹکا دیے تھے اور اب وہ مجھے کوٹ پہننے میں مدد دے رہا ہے ــــــ مکمل میزبان ۔ لیکن موت کے سیخ بستہ ہاتھ جن کے تصور سے مجھے کپکپی محسوس ہو رہی ہے ــــــ کیا کوئی ہاتھ ان ہاتھوں کو روک سکتے ہیں ۔

ہمارے میزبان نے صوفہ گھسیٹ کر آتشدان کے قریب کر دیا ہے ــــــ

اور مجھے اپنا جیکی یاد آ رہا ہے ۔ وہ روزانہ میرے پیچھے پیچھے سکول چلا آیا کرتا تھا ۔ اسے لاکھ سمجھاؤ ۔ لیکن وہ گھر رہنے پر رضامند نہ ہوتا ــــــ اور اسکول میں مجھ پر ڈانٹ پڑتی ــــــ اس اسکول میں ہم ویسی تو جا سکتے تھے ، لیکن کتوں کا داخلہ پھر بھی ممنوع تھا ۔ بہت مشکل سے میں جیکی کو یہ سمجھا پائی تھی ــــــ کہ اگر تم اتنے ہی ڈھیٹ ہو ۔ جتنا کہ میں سمجھتی ہوں ۔ کہ تم ہو ــــــ تو پھر یہاں گیٹ پہ بیٹھے رہا کرو ــــــ اور چھٹی ہوتے ہی ہم گھر چل دیا کریں گے ــــــ کیسا وفادار تھا ۔ وہیں بیٹھا رہا ۔ اور ایک روز باؤلا ہو گیا ــــــ اسے ایک آوارہ باؤلے کتے نے کاٹ کھایا تھا ــــــ اور معمول کے مطابق جیکی میرے ساتھ آیا تھا

گھر آیا تھا۔ گھر آکر وہ میرے کمرے میں میرے قدموں میں بیٹھا رہا ـــــ شام کو جب وہ زیادہ ہی باؤلا ہوگیا۔ تب دم ہلاتا گیٹ پر جاکر آنے جانے والوں کی طرف لپکتا رہا۔ ـــــ اور پھر اُسے زنجیر سے باندھ دیا گیا تھا ـــــ اور میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا تھا ـــــ

جیکی ڈیئر! تم نے مجھے کیوں نہیں کاٹا ـــــ دن بھر تم میرے ساتھ رہے۔ اور ایک بار بھی تم نے مجھے کاٹنے کی کوشش نہیں کی باؤلے ـــــ! اس نے پھر بھی مجھے نہیں کاٹا ـــــ اپنی وحشت زدہ آنکھوں سے مجھے تکتا رہا ـــــ اور بالآخر اُسے گولی ماردی گئی ـــــ پپا نے نہیں ماری۔ گو ان کا دعوٰی ہے کہ ان کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا ـــــ لیکن ان کے پاس وہ دل نہیں جو گولی مار سکے۔ وہ تو جب ان کا ایک دوست پستول ہاتھ میں لئے جیکی کی طرف نشست باندھ رہا تھا۔ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر اندر چلے گئے تھے۔ میں تنہا رہ گئی تھی۔ اور پپا پکار رہے تھے "اندر آجاؤ بیٹے" ـــــ لیکن میں نہیں گئی۔ وہیں لان میں ایک درخت سے بندھے جیکی سے ذرا دور کھڑی رہی ـــــ دو فائر ہوئے ـــــ اور جیکی اپنی وحشت زدہ آنکھوں اور اپنے تمام پاگل پن سمیت ختم ہوگیا ـــــ صرف اس کی آنکھوں کی یاد میرے پاس رہ گئی ـــــ مرتے وقت ان آنکھوں کی وحشت ختم ہوگئی تھی۔ صرف ایک التجا تھی۔ زندگی اُسے بھی پیاری تھی اور التجا کے ساتھ ساتھ میرے لئے ترحم بھی تھا ـــــ

اب تمہارے ساتھ اسکول کون جایا کرے گا بی بی! ـــــ

جیکی کے بعد میں نے کوئی کتا نہیں پالا۔ کتنے باؤلے ہو جاتے ہیں۔ اور ان کو گولی مارنا پڑتی ہے۔ اور میں تنہا رہ جاتی ہوں ـــــ اور پپا اندر چلے جاتے ہیں ـــــ وہ تو کتے تک کو مرتا نہیں دیکھ سکتے ـــــ

لیکن علی قاسم! دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں۔ جو انسانوں کو گولی مار دیتے ہیں۔ اور ان کا دل ذرا نہیں دکھتا ـــــ اور آج کے دن میرا بھی دل ذرا نہیں دکھا ـــــ میں کس قدر ہنسی ہوں۔ بالکل باؤلوں کی طرح ـــــ ہنسی سے بیتاب ہوتے ہوئے میں نے سلویا سے کہا ـــــ "خادر لیوری

تم سے عشق کرتے ہیں۔"

"بکواس بند کرو جی۔" —— اور سلویا بھی ہنسی سے بیتاب ہو گئی۔

اور ہمارے میزبان نے مجھے پھر غور سے دیکھا۔

"کیا اس شخص کی موت اب تک تمہارے ذہن پر مسلط ہے؟"

"ہرگز نہیں" —— میں نے چیخ کر کہا۔

لیکن علی قاسم! تمہاری اپنی زندگی بھی اور اس زندگی کے دکھ سکھ اور خدوخال تھے

اسے غیروں نے اتنا غیر اہم کیوں جانا۔

اور سلویا نے مجھ سے پھر یہ پوچھا ہے۔ کہ میرا اس مرنے والے سے کیا رشتہ ہے؟

اور میں نے سوچنے کی کوشش کی ہے۔

میرے پاس ایک ہار تھا۔ ایک روز ہاتھ کے ذرا سے دباؤ سے وہ ہار ٹوٹ گیا —— اور موتی

اِدھر اُدھر بکھر گئے —— جب میں ان کو چن رہی تھی۔ تو ایک موتی قدموں تلے آکر چکنا چور ہو گیا

—— میں اس موتی کو تکتی رہ گئی تھی —— اور میری امی نے مجھے پیار کرتے ہوئے کہا تھا۔

"میں تمہیں دوسرا ہار لے دوں گی" ——

"لیکن یہ موتی!" —— مجھے اپنی چیزوں سے ہمیشہ بہت پیار رہا ہے؟

"میں تمہیں ڈھیروں موتی لے دوں گی ——" —— امی نے کہا۔

"لیکن امی ان میں، یہ موتی تو نہ ہو گا" —— میں نے افسردگی سے کہا تھا۔

نت نئے موتی آتے دن قدموں تلے آن کر کچلے جاتے ہیں اور میں یہ طے نہیں کر پاتی۔

کہ میرا ان سے کیا رشتہ ہے —— کیا وہ دھاگہ جو موتیوں کو منسلک کرتا ہے۔ ٹوٹنے پر بھی

نہیں ٹوٹ پاتا؟

پسر کے بعد ہم نے قہوہ پیا۔ جو خاص سرحد کی چیز ہے۔ الائچی کی خوشبو والا ——

اور کمرے میں دلآویز روشنی تھی۔ بھڑکتے ہوئے شعلوں پر سے نظر اٹھا کر میں نے اپنے

میزبان سے کہا تھا،

"اب تو آپ سلویا کا کوٹ لا ہی دیجیئے۔ ورنہ ہم کبھی نہیں جا سکیں گے۔"

میزبان نے بہت اہتمام سے سلویا کا کوٹ تھاما۔ اور کہا ــــــ "میں تم لوگوں کو گھر تک چھوڑ آؤں۔ اندھیرا بہت ہے۔"

ہاں اندھیرا بہت ہے۔

اور خوبصورت رات کا خوبصورت چاند چمک رہا تھا۔ اور وہ درد جو میرے دل میں ہونا چاہیئے تھا۔ وہ چاند میں سمٹ گیا تھا ــــــ

ایک موڑ پر آکر ہم سب رک گئے۔ "مجھے ایک شعر یاد آگیا ہے۔ لیکن تم لوگوں کو اردو شاعری سے دلچسپی نہیں ؟" ــــ "کیوں نہیں ــــ کیوں نہیں ــــ اب سے ہاؤس کی زبان اُردو ہو گی ــــ"

ہمارے میزبان نے مکمل میزبان ہونے کا ایک اور ثبوت دیا ــــ

لیکن میں ہنس کر چپ ہو رہی ــــ

آج کی رات اس شعر کے درد کی متحمل نہ ہو گی ــــ

علی قاسم! مجھے آنے والے دن کی قسم! وہ رات اپنے جلو میں بہت درد لئے تھی۔

کیا انہوں نے تمہیں بہت پیٹا تھا ــــ ایک لمحہ کے لئے لوٹ آؤ ــــ اور مجھے بتاؤ تم نے کہاں کہاں درد محسوس کیا تھا ــــ چوٹ کہاں کہاں لگی ؟

کیا سچ مچ انہوں نے ایک انسانی زندگی کو طاعون زدہ چوہے سے اور ایک سچ مچ کے انسان کو باؤلے کتے سے زیادہ اہمیت نہ دی۔!

کیا اس روزنامہ کی قتل کی سب دھمکیاں سچ ثابت ہوئیں ــــ وہ روزنامہ جو غیر ملکی امداد پر زندہ ہے ــــ اور ہر تیسرے دن اس امداد کے جواز کی خاطر ایک عدد ایڈیٹوریل لکھتا ہے ــــ!!

علی قاسم!

کیا تم مجھے نہیں بتاؤ گے۔ کہ میرا تم سے کیا رشتہ ہے۔ جو میں اپنے دوستوں کو بھی بتا سکوں

—— اور کہوں۔ دیکھو! میرا اس مرنے والے سے یہ رشتہ ہے!!!

اور اب سلویا ایک پتھر پر بیٹھ گئی ہے۔ اور اس نے مجھ سے پوچھا ہے،

"تم نے ایک دن مجھ سے کہا تھا۔ کہ ہم سب اپنے اپنے طور پر جنگ میں حصہ لے سکتے ہیں، ہم سب کا اپنا اپنا ایک رول ہے۔ اور چھوٹے سے چھوٹے رول کی بھی ایک عظمت ہے۔ مجھے میرا رول بتاؤ ——" سلویا نے ہاتھ پھیلا کر کہا۔

"میں تمہیں کیسے بتا سکتی ہوں سلویا ڈارلنگ —— تمہیں کوئی بھی نہ بتا سکے گا —— تم خود ہی فیصلہ کرو گی۔" اور میں نے اُسے ایک کہانی سنائی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران کی —— جب لندن پر بمباری ہوئی تھی۔ اور بمباری کے فوراً بعد ایک گُل فروش خاتون ایک خاص نکڑ پر حسب معمول کھڑی پھول فروخت کرتی نظر آتی —— اس گلفروش خاتون کا بھی جنگ میں ایک حصہ تھا۔ اور اس کی بھی ایک اپنی عظمت تھی۔

"کاش میں کہانیاں لکھ سکتی۔ لیکن میرے پاس الفاظ نہیں۔" —— سلویا نے حسرت سے کہا۔

آج اس روزنامچہ کو نہیں۔ خوبصورت خواتین تک کو احساس ہے۔ کہ محاذ جنگ پر بم متروک ہو چکے۔ اب جنگ ذہن کی جنگ بن چکی ہے۔

لیکن سلویا ڈیئر! الفاظ والے نہیں جیتیں گے۔ لفاظی کا زمانہ بیت گیا۔ اب جیت ان کی ہو گی جن کے پاس خلوص ہے۔ خواہ الفاظ نہ بھی ہوں —— تب میں نے اپنی اس دوست کو بتایا۔ کہ کہانیاں لکھنا بھی ٹھیک ہے —— لیکن ہر شخص کا کام مختلف ہے —— جیسے جنگ میں صرف محاذ جنگ پر گولیاں کھانے والے ہی نہیں لڑتے۔ وہ خواتین بھی لڑتی ہیں۔ جو گھروں میں بیٹھی محاذ جنگ پر لڑنے والوں کے لئے موزے اور دستانے بنتی ہیں ——

"اس کا مطلب یہ ہوا۔ کہ میں بہت کچھ کر سکتی ہوں۔" —— سلویا کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"کیوں نہیں۔" —— میں نے آہستہ سے کہا۔

رات کے چاند کا درد بڑھ گیا، لیکن صبح سورج اپنی پوری تابانیوں سمیت طلوع ہو گا —— یہ ایک ان مٹ حقیقت ہے —— نہ ٹل سکنے والی تقدیر ہے —— اور بیسیوں بار ہم سب نے

اپنے ساتھ کہا ہے۔ کیا کبھی کسی نے اس حقیقت پہ بھی شک کیا ہے۔ کہ کل سورج طلوع ہو گا۔

لیکن علی قاسم! کل کا سورج تمہارے لئے طلوع نہیں ہوگا ـــــ لیکن تم بھی جانتے ہو۔ اور میں بھی جانتی ہوں۔ کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ـــــ وہ طلوع ہو جائے ـــــ خواہ تمہارے لئے طلوع ہو یا نہ ہو ـــــ میرے لئے ہو یا نہ ہو ـــــ ایک بار ـــــ صرف ایک بار طلوع ہو جائے۔

اور گھر قریب آگیا۔ اپنے کمرے میں داخل ہو کر میں نے اپنے ملازم سے کافی بنانے کو کہا وہ ان مل بے جوڑ پیالیاں اور ایک مگ لے کر آگیا۔

ـــــ اور میں نے اس انتہائی نفاست پسند پروفیسر سے کہا ـــــ "اُمید ہے آپ ان پیالیوں کا بُرا نہ مانیں گے۔"

علی قاسم! کیا مجھ میں اور تم میں ان مل بے جوڑ پیالیوں کا رشتہ تھا ـــــ!

کیا دنیا کی ساری بدصورتی ہمارا مقدر ہے۔ ہم جو خوبصورتی سے پیار کرتے ہیں ـــــ!!

اور سلویا نے مجھ سے کہا۔

"کیا تم لوگوں کے لئے امن کے زمانہ میں بھی چین نہیں؟" ـــــ اور میں نے کہا ـــــ "نہیں ـــــ سلویا ڈارلنگ ـــــ"

اور سلویا نے کہا ـــــ "فادر لیوری کو کیسا افسوس ہوگا کہ میں مذہب پرست ہوتے ہوئے ملحد ہو گئی۔"

میں نے کہا ـــــ "سلویا کلیسا میں گھنٹیاں بج رہی ہیں۔"

سلویا نے کہا۔ "تمہارے کان بج رہے ہیں۔" ـــــ اور کافی کی پیالی منہ کو لگالی۔

کہیں یہ وہ زہر نہ ہو سلویا۔ جس کو پی کر سقراط مر گیا تھا ـــــ سقراط آج بھی ہیں۔ اور زہر بھی ہے ـــــ اور زہر دینے والے بھی ہیں ـــــ سب کچھ ہے"

سچ مچ گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ آج ایک مسیح مصلوب ہوا۔

علی قاسم! تم نے مار کیوں کھائی — ؟ — تم کیوں پٹتے رہے ! — جہنم میں جاتے سب لوگ — تم نے سلطانی گواہ بن کر جھوٹی گواہی کیوں نہ دے دی — ؟

لیکن میں یہ بھول رہی ہوں، کہ سقراط ہر دور میں زہر پیتا رہا — مسیح ہر زمانے میں مصلوب ہوتا رہا — اور تم تو وہ مسیحا ہو جس نے مرتے مرتے بھی لوگوں کو جلایا — موت کو جھٹک کر ایک لمحہ کے لئے ادھر دیکھو — ایک خوبصورت خاتون زندگی میں اپنا رول متعین کر رہی ہے — اسے راہ سجھاؤ —

درد کی شدت کس قدر بڑھ گئی ہے —

مجھے معاف کر دو — اگر میں نے ایک لمحہ کو بھی یہ سوچا۔ کہ تم سلطانی گواہ بن سکتے تھے۔ لیکن میں تم سے کس کس خطا کی معافی چاہوں — ؟

ابھی لمحہ بھر پہلے بہت حسرت سے میں نے کہا تھا — "سنو سلویا! یہاں آتے وقت میں ایک پارٹی فراک بھی لائی تھی۔ کہ شاید ضرورت پڑ جائے احتیاط عمدہ چیز ہے —"

"پارٹی فراک" — وہ ہنسی سے بے حال ہو گئی —

یا وحشت! آخر اس میں ہنسی کی کیا بات ہے۔ وہ سچ مچ بہت خوبصورت ہے، سفید رنگ کا وہ مہین لباس جس پر ہلکا ہلکا سنہرا کام ہے — اور اس سے منسلک ٹیفیٹا کا پیٹی کوٹ میرا خیال تھا۔ میں آج وہ فراک پہنوں گی۔ لیکن پھر دل نہ مانا۔

"کوئی بات نہیں" اس کلچرڈ پروفیسر نے پھر انتہائی سلیقہ سے کہا۔ سلیقہ اس کی گھٹی میں پڑا ہے۔ "تم پھر کسی روز وہ لباس پہن کر آؤ۔ اور ہم سب کالج میں کھانا کھائیں گے۔"

تم نے دیکھا علی قاسم! تمہاری موت سے کوئی ہنگامہ برپا نہیں ہوا۔ زندگی کے ہنگامے جوان ہیں — اور میں اپنے دوستوں کے پاس بیٹھی اپنے خوبصورت لباس کا ذکر رہی ہوں۔ تم نے دیکھا میری کیسی گھٹیا ذہنیت ہے۔ کہ مجھے تمہاری بے وقت موت کا صرف اتنا افسوس ہے۔ کہ لارنس کالج جاتے وقت میں اپنا خوبصورت پارٹی فراک نہیں پہن سکی۔ سفید رنگ کا آنکھوں کو خیرہ کر دینے والا لباس —

سفید رنگ جو میرے لیے سب خوبصورتیوں ـــــ سب سچائیوں ـــــ اور سب محبتوں کا مظہر ہے۔

اور میں یہاں تنہا ہوں ـــــ یہاں کوئی نہیں جس کے قریب جاکر میں کہہ سکوں۔

"علی قاسم مر گیا۔"

اور وہ سر ہلا کر خاموش ہو رہے۔

ہاں وہ مر گیا۔

یہ شہر میرے لیے اجنبی ہے۔ یہاں آج اس دکھ بھری رات میں اُلجھے ہوئے رشتے سلجھا رہی ہوں ـــ اب سب لوگ چلے گئے ہیں۔ میں نے ٹیبل لیمپ بجھا دیا ہے۔ اور ہیٹر بھی ـــــ اور ہیٹر بجھاتے وقت میں نے تم سے پوچھا ہے ـــــ

علی قاسم! تم نے کتنی طویل راتیں سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے گزار دیں ـــــ ہر حدت سے محروم ـــ یہاں تک کہ تمہارے جسم کی حدت بھی ختم ہو گئی۔

آج کی رات کتنی طویل تنہا رات ہے۔ تنہا رات جو انسان کو کھا جاتی ہے۔

علی قاسم! ایسی کتنی طویل تنہا راتیں تم نے اس طرح گذار دیں۔ کہ پلکوں پر شبنم تھرائی۔ اور تمہارے اپنے ہی دل میں جذب ہو گئی۔

کیا تم مجھے نہ بتاؤ گے۔ کہ کے بار دل تڑپا اور محروم رہا۔ اور کوئی ہمدرد ہاتھ نہ بڑھا ـــــ کوئی شناسا چہرہ نظر نہ آیا۔ ایک سمت تم تھے۔ دوسری سمت تمہاری دنیا تھی۔ اور درمیان میں سنگین دیواریں تھیں ـــ

یہ دیواریں کیسی ہیبت ناک ہیں علی قاسم! ـــ یہ ایک انسان میں اور اس کے پیاروں میں حائل ہو جاتی ہیں۔ تم ان دیواروں کو گرا دینا چاہتے تھے۔ اور انہی دیواروں نے تمہارے لہو کا ہر قطرہ جذب کر لیا اور ان قیامت کے لمحوں میں کوئی زلف تمہارے شانے پہ نہ بکھر سکی ـــــ اور کوئی عارض قریب نہ آسکا۔

علی قاسم! کیا وہ تمہیں شب و روز ستاتے رہے؟ کیا انہوں نے تمہیں سونے بھی نہ دیا؟ ـــــ

تم کن کن اذیتوں سے گزرے ؟ میرا دل پُوچھنا چاہ رہا ہے ۔

اور موت سے پہلے اس آخری لمحہ میں تم نے کیا سوچا ـــــ یہ میں کبھی نہ جان سکوں گی ۔

انہوں نے تمہیں موت سے پہلے کس کس طرح مارا ـــــ

یہ کوئی نہ بتلائے گا ـــــ

تو حساب کس طور برابر ہو گا ـــــ

مجھے سنگین دیواروں سے بہت ڈر لگتا ہے ۔ ان سنگلاخ چٹانوں کو دیکھ کر میری روح سر بخ کر رہ جاتی ہے ۔ لیکن آج کی رات نے سب سنگین دیواریں گرا دی ہیں ـــــ یہ سارے فاصلے پھلانگ گئی ہے ـــــ اس نے سب پہرے ختم کر دیئے ہیں ۔

اور علی قاسم ! تم مجھ سے اتنے قریب ہو ۔ کہ میں تمہیں چھو سکتی ہوں ۔ اس لمحے کوئی طاقت میرا ہاتھ نہیں جھٹک سکتی ۔

اب صبح ہونے کو ہے اور میں نے ہزارویں دفعہ خود سے وہی گھسا پٹا سوال پوچھا ہے ۔ کہ میرا اس مرنے والے سے کیا رشتہ ہے ۔

تم میرے بھائی نہیں تھے ـــ تم میرے محبوب نہیں تھے ـــ مجھ میں اور تم میں کوئی خون کا رشتہ نہیں تھا ۔ کوئی قانون کا رشتہ نہیں تھا ۔ قطعاً قطعاً کوئی رشتہ نہیں تھا اور بہت عظیم رشتہ تھا ۔

آج کی رات جب سب دنیاوی رشتے ٹوٹ چکے ہیں ۔ یہ ایک رشتہ اپنے دامن میں کائنات کا کل درد سمیٹے برقرار رہے ۔

آج کی رات کوئی بھائی تم سے عزیز تر نہیں ـــــ اور کوئی محبت تم سے محبوب تر نہیں ۔

تم میرے کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ ہو ـــــ تم میں اور مجھ میں درد کا رشتہ ہے ـــــ

کیا کائنات کا کوئی رشتہ اس سے عظیم تر اور مقدس تر بھی ہے ! ـــــ

میرے عزیز ! تم بتلاؤ گے یا میں بتلاؤں ۔ کہ تم میری رگِ جان سے بھی قریب ہو ۔ !!!

دریچے کی صلیب

فلیٹ میں ہنگامہ برپا ہے۔ ہر سمت لوگ بکھرے پڑے ہیں۔ ہر سمت لوگ باتیں کر رہے ہیں۔
میرا بھائی سرجی ایک سیدھی سادی لڑکی سے ماڈرن آرٹ پر لیکچر سن رہا ہے۔ ابھی ابھی جب
اس لڑکی کو معلوم ہوا کہ سرجی خود بھی پینٹر ہے اور پیرس میں اس کا اسٹوڈیو ہے تو وہ بہت پریشان ہوئی
سرجی مسکراتا ہوا اپنی شستہ فرانسیسی میں کہہ رہا ہے "کوئی بات نہیں —— کوئی بات نہیں ——
تمہاری گفتگو بہت دلچسپ تھی۔ اور یقین کرو کہ میں نے تم سے بہت کچھ سیکھا ہے مادموزیل"
اور یہ ہمارا میزبان ہے۔ تھیوری آف میوزک کا ماہر —— اس سمر سکول کا منتظم جس میں
میں پچھلے چار ہفتے سے جا رہی ہوں اور ابھی چار ہفتے اور جاؤں گی اور اس نے سر ہلا کر کہا ہے۔
"مادموزیل —— مادموزیل —— تم آکسفورڈ میں کیا کر رہی ہو؟ تمہیں پیرس میں رہنا چاہیئے"
اور پھر میں نے دور ایک چہرہ دیکھا ہے۔ ایک شائستہ، نرم، حساس چہرہ —— میں
اس سے بات کرنا چاہوں گی۔ میں جاننا چاہتی ہوں یہ اتنا اداس کیوں ہے۔ اس نے کن تجربات
سے گزر کر اتنی افسردگی کو اپنا لیا ہے۔ لیکن وہاں بہت سے لوگ ہیں۔ اور وہ بہت انہماک
سے گفتگو کر رہا ہے۔
اور بار کے قریب پہونچ کر میں نے خود سے پوچھا —— کیا میں ذرا سی وائن اور لے لوں؟

یہ بہت نفیس ہے ! اور اچانک میں نے خود کو ایک بہت دلچسپ گروپ میں پایا۔

ایک طالب علم نے میرا گلاس بھرتے ہوئے کہا "مادموزیل میں تمہارا پورٹریٹ بنانا چاہتا ہوں۔ کیا تم مجھے سٹنگ دے سکو گی ـــــ ؟"

اور اچانک ایک مشہور مجسمہ ساز میرے قریب آیا "مادموزیل میں تمہارا مجسمہ بناؤں گا۔ تم اب تک کہاں تھیں ـــــ ؟"

یہ فرانسیسی بھی خوب لوگ ہیں بھائی۔ یہ ہر لڑکی سے یہی کہتے ہیں۔ تم اب تک کہاں تھیں مادموزیل ـــــ !

"کیا تم خالص ہندوستانی ہو ؟" ـــــ اس مجسمہ ساز نے پوچھا ہے۔

"قطعی" ـــــ میں نے جھوٹ بولا۔

"میرے خیال میں ہندوستانی بہت خوبصورت ہوتے ہیں" ـــــ میرے عقب سے ایک آواز آئی ـــــ یہ تو وہی خوبصورت اداس چہرہ تھا۔

"تمہیں یہ خیال کیسے آیا کہ میں خالص ہندوستانی نہیں ؟"

"میں نے کبھی کسی ہندوستانی لڑکی کو اس قدر خوش نہیں دیکھا ـــــ"

ہاں میں تم سے سچ بولوں گی۔ میں خالص ہندوستانی نہیں۔ میری ماں ہسپانوی ہے اور اس کے علاوہ بھی میری رگوں میں جانے کہاں کہاں کا خون ہے۔ ہمارا بہت عجیب وغریب گھرانا ہے۔ چار نسلوں سے ہم عقیدے، قومیت اور نسل کے بُت توڑتے چلے آئے ہیں اور تم نے یہ بھی ٹھیک کہا ـــــ میں بہت خوش ہوں۔ ماحول بہت خوبصورت ہے۔ دنیا بہت خوبصورت ہے۔ وائن بہت خوبصورت ہے ـــــ اور میں MASTER OF CEREMONIES ہوں۔ میں پریما ڈونا (PRIMA DONNE) ہوں۔ اور یہ بہت طمانیت کی بات ہے ـــــ میں نے مسکرا کر اس خوبصورت چہرے کی طرف دیکھا۔ اور اب میرا گلاس چھلک گیا ہے اور وائن میرے لباس پر گر پڑی ہے ـــــ اس نے تاسف سے میری ساری کو دیکھا ـــــ

"فکر مت کرو۔ یہ دھل سکتی ہے" ——— اس چہرے پہ اتنی پریشانی دیکھ کر مجھے بہت ہنسی آئی۔ ارے یہ صرف ایک ساری ہی تو ہے۔ تم اس قدر پریشان کیوں ہوتے ہو؟ ——— کیا ایسی ہی پریشانیوں سے گزر کر تم اتنے اداس ہو گئے ہو؟؟

اور اس مجسمہ ساز نے کہا ——— "مادموزیل میں تم کو اپنا سٹوڈیو دکھانا چاہتا ہوں۔ تم کب چل سکو گی ———؟"

لیکن اس لمحہ کسی نے جھک کر اپنے نیپکن سے میرے بال پونچھ ڈالے۔ ارے یہ وائن کیا میرے بالوں پر بھی گر گئی تھی؟ ——— یہ وہ خوبصورت چہرہ تھا۔ اور وہ لمحہ بہت طویل ہو گیا ——— جیسے صدیوں پر محیط ہو۔

اور اب سب لوگ چلے گئے ہیں۔ صرف ایک لمحہ میرے قریب ہے ——— اور ایک چہرہ ——— ایک خوبصورت ——— اداس چہرہ ——— اور میں نے کہا ——— "زندگی اتنی حسین ہے۔ اور دنیا اتنی اچھی ——— پھر تم اتنے اداس کیوں ہو ———؟" ———

"میں کچھ ہوں ہی اُداس سا آدمی ———" اس نے مسکرا کر کہا۔

"مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔ تم کون ہو؟ اور زندگی سے کیا چاہتے ہو؟"

اور اس نے کہا ——— "میں آسٹرین ہوں۔ میں وی آنا کا رہنے والا ہوں۔ اور میری ماں فرانسیسی تھی۔"

وی آنا جو موسیقی کا شہر ہے۔ جو خوبصورتیوں کا شہر ہے ——— لیکن تم میرے سوال کو غلط سمجھے ہو۔ مجھے تمہاری قومیت سے کوئی مطلب نہیں ——— میں تو یہ جاننا چاہتی ہوں کہ کیا تم نے خود کو پالیا ہے؟ ——— کیا تمہیں بالآخر یہ علم ہو گیا ہے کہ تم زندگی سے کیا چاہتے ہو؟ ———

اور پھر میں نے کہا ——— "میں تمہیں اپنے بارے میں بتاؤں گی۔ اگر مجھے زندگی کو ایک بار پھر نئے سرے سے شروع کرنے کا موقع مل سکے تو جب بھی میں وہی کروں جو میں نے اب تک کیا ہے"

اور اس نے کہا: "تم بہت خوش قسمت ہو۔ شاید تم نے زندگی میں کوئی غلطیاں نہیں کیں ———

نہیں شاید یہ غلط ہے ـــــ شاید تم نے اتنی کم زندگی گذاری ہے کہ غلطیوں کا امکان ہی نہ تھا۔"
اور میں نے اسے اپنے بھائیوں کے بارے میں بتایا ہے۔ میرے تین بھائی ہیں۔ پرچی
وہ جو اس کونے میں کھڑا اس لڑکی سے گفتگو کر رہا ہے۔ پہلے وہ فارن سروس میں
گیا اور بہت بیزار ہوا۔ چھ سال بعد اس نے استعفیٰ دے دیا۔ اب وہ مستقل پیرس میں رہتا ہے
اور پینٹ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ بالآخر اس نے اپنے آپ کو پالیا ہے۔

اور وہ بار کے قریب میرا دوسرا بھائی ہے۔ اُرون ـــــ وہ موسیقار ہے وہ یورپ
بھر میں کانسرٹ دیتا پھرتا ہے۔ اس دنیا میں وائلن اس کی عزیز ترین متاع ہے۔ وہ کہتا ہے وائلن
بہت خوبصورت ساز ہے ـــــ خوش ہو کر اس کو گلے سے لگایا جا سکتا ہے۔ اور خفگی میں
اُسے جھنجھلا کر پٹخا جا سکتا ہے ـــــ وہ کہتا ہے۔ پیانو یا آرگن کبھی دل سے یوں قریب نہیں
ہو سکتے جیسے کہ وائلن ـــــ غم میں اپنے وائلن سے لپٹ کر رویا جا سکتا ہے۔ لیکن پیانو سے
لپٹ کر رونے کا خیال ہی کس قدر مضحکہ خیز ہے۔

اور وہ میرا تیسرا بھائی ہے۔ ارجن ـــــ ادھر شمعدان کے قریب ـــــ وہ جو اپنا
پائپ صاف کر رہا ہے۔ وہ میونک کی یونیورسٹی میں فزکس پڑھاتا ہے۔ کبھی کبھار مجھے خیال آتا
ہے کہ شاید ہم میں سے صرف ارجن نے خود کو پالیا ہے۔ دراصل یہ سائنس دان لوگ بڑے اچھے
ہوتے ہیں ـــــ بہت سیدھے سادھے ـــــ بہت سلجھے ہوئے ـــــ ان کو اکثر یہ
معلوم ہوتا ہے کہ یہ زندگی سے کیا چاہتے ہیں ـــــ ان کی چاہتیں بھی بہت سیدھی سادی ہوتی
ہیں ـــــ بہت معصوم ـــــ بچوں کی سی ـــــ جیسے چاند تک پہونچنے کی خواہش ـــــ
اس میں کوئی الجھاؤ نہیں ـــــ کوئی ہیر پھیر نہیں ـــــ اور یہ فنکار لوگ ـــــ یہ تو بہت
گڑبڑ ہوتے ہیں ـــــ ایک دم فراڈ ـــــ لیکن شاید مجھے یہ باتیں نہیں کہنا چاہئیں
ـــــ کیونکہ یہاں بہت سے فنکار موجود ہیں۔

بہت حیرت سے میں نے سوچا ہے۔ میں کیوں اس سے اتنی باتیں کر رہی ہوں۔ کیا بالآخر ایک وجود دوسرے وجود سے یوں باتیں کر سکتا ہے جیسے درمیان کوئی حد فاصل نہیں — کوئی شے حائل نہیں —— کیا اس دنیا میں اتنی یگانگت ممکن ہے !

کھانے کے بعد "کریم دی ماں" کا گلاس ہاتھ میں تھامے ہوئے میں نے اس سے کہا —— "کیا ہم اب سٹنگ روم میں واپس چلیں۔ اور کیا تم "کریم دی ماں" نہیں پیو گے ؟"

اور اس نے کہا "نہیں تم کریم دی ماں" سے زیادہ حسین ہو۔ اور زیادہ دلچسپ —— ہاں ہم سٹنگ روم کی طرف لوٹ جائیں گے۔"

"نندیتا کیا تم ہمارے ساتھ چلو گی ؟ —— "سرجی نے پکار کر کہا ——

"نہیں سرجی۔ کرنے کو اتنی بہت سی باتیں ہیں۔ میں ٹھہر کر آؤں گی۔ تم جاؤ" ——

میں اپنی پسندیدہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ آس پاس کوئی جگہ خالی نہیں۔ اور اس نے کہا —— "مجھے تمہارے قدموں میں بیٹھنا پڑے گا۔"

میں نے دور پڑے ہوئے ایک سٹول کی طرف اشارہ کیا "نہیں۔ میرے قدموں میں بیٹھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم وہ سٹول اٹھا لاؤ۔"

اور تب ہم نے بہت سی باتیں کیں —— میں نے اسے بتایا ہے۔ کہ آکسفورڈ بہت خوبصورت جگہ ہے وہاں بہت خوبصورت دریا ہے۔ بڑی خوبصورت پگڈنڈیاں ہیں —— بہت حسین سبزہ زار ہیں —— بہت اچھے قہوہ خانے ہیں —— اور بہت خوبصورت مے خانے —— اور وہاں خواب آلود SPIERS ہیں اور فن تعمیر کا حسن ہے —— اور کالجوں کا سحر ——

اور میں نے اسے بتایا ہے کہ مجھے آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ کہ میں اپنے کس بھائی سے زیادہ پیار کرتی ہوں۔ دراصل وہ تینوں ہی بہت اچھے ہیں۔ بڑے پیارے

ــــ ایک دم ـــــ ایلفا ایلفا - (ALPHA ALPHA)

"یہ ایلفا ایلفا کیا ہوتا ہے ؟" ـــــ اس نے مہربانی سے پوچھا ہے۔

"ارے تم ایلفا ایلفا نہیں جانتے !" ـــــ مجھے بہت عجیب لگا ـــــ "ہمارے ہاں ـــــ یعنی آکسفورڈ میں اونچی قسم کے فرسٹ کلاس مارکس ہوں۔ تو اس کو ایلفا ایلفا کہتے ہیں ـــــ یعنی بہت فرسٹ کلاس قسم کی فرسٹ کلاس ـــــ جس کے بارے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ ہو" ـــــ میں نے وضاحت کی۔

وہ بہت ہنسا۔ اور ہنستا ہوا بہت اچھا لگا ـــــ "اور ایلفا ایلفا قسم کے اور کتنے لوگ ہیں اس دنیا میں ؟" ـــــ اس نے پوچھا۔

"میرے بھائیوں کے بہت سے دوست بھی وہاں ہیں۔ ارجن اور سرجی بیلیل ـــــ (BALLIOL) میں تھے اور اروِن ماڈلین (MAGDALEN) میں ـــــ ابھی تک ان کے بہت سے دوست وہاں ہیں ـــــ وہ سب بھی بہت اچھے ہیں۔ ایلفا بیٹا۔ (ALPHA - BETA) قسم کے ـــــ"

"وہ کیا ہوتا ہے ؟"

"جب فرسٹ کلاس تو ہوتی ہے لیکن کچھ کچھ سیکنڈ کلاس بھی ـــــ یعنی وہ خالص فرسٹ کلاس نہیں ہوتی کہ جہاں شک وشبہ کی گنجائش ہی نہ ہو ـــــ لیکن تم بھی اچھے آدمی ہو۔ بہت اچھے۔"

"کیا تمہارے خیال میں مجھے ایلفا بیٹا (ALPHA-BETA) دیا جاسکتا ہے ؟؟" ـــــ اس نے بھویں چڑھا کر سوال کیا۔

میں نے اس کو غور سے دیکھا "نہیں تم خالص ایلفا قسم کے آدمی ہو۔ اور تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو ـــــ ہاں یقیناً تم خالص ایلفا ہو۔ میرے بھائیوں کی طرح ایلفا ایلفا ـــــ" میں

نے پورے وثوق سے کہا۔

وہ بہت ہنسا۔

"تم آکسفورڈ ضرور آنا۔ وہ بہت خوبصورت ہے۔ اور تم اس کو بہت پسند کرو گے۔"

"سوال یہ ہے کہ کیا آکسفورڈ بھی مجھے پسند کرے گا؟ —— لیکن میں ضرور آؤں گا

ہاں میں ضرور آؤں گا —— لیکن کیا ہم اس سے پہلے نہیں ملیں گے؟؟ —— گو مجھے یقین

ہے کہ تمہارے بہت سے دوست ہونگے۔ اور تمہارے پاس میرے لئے شاید وقت نہ ہو!!!"

اور تب اس خوبصورت شخص نے مجھے گھر پہنچایا —— میں نے غور سے اس کے بالوں

کو دیکھا —— یہ کیسے بے تحاشا خوبصورت بال تھے —— اور ان میں چاندی کے سے

تار چمک رہے تھے۔ کس قدر حسین ——

"کیا تم بُرا تو نہیں مانو گی۔ اگر میں اپنے گھر سے اپنا چشمہ لے لوں؟" —— اور اس نے

اپنا چشمہ لیا —— "اور کیا تم یہ گھر یاد رکھ سکتی ہو؟ —— اور کیا تم کسی روز مجھ سے ملنے آؤ گی؟۔

جیسے تم اپنے اور بہت سے دوستوں سے ملنے جاتی ہو؟؟ ——"

اور میں نے کہا۔ "میں ضرور آؤں گی۔ لیکن تم بھی ہمارے ہاں آنا۔"

اور تب لیٹن کوارٹرز (LATIN QUARTERS) میں سرجی کے سٹوڈیو کے سامنے اس

نے گاڑی روکی۔

"وہ اُوپر کا فلیٹ سرجی کا ہے" —— میں نے اسے بتایا۔

"ہاں تم اُوپر پہونچ کر دریچہ کھول کر ہاتھ ہلا دینا۔ تاکہ مجھے معلوم ہو جائے کہ تم خیریت سے

پہنچ گئی ہو۔ پھر میں اطمینان سے چلا جاؤں گا۔"

"آندرے اچھا آدمی ہے" —— ناشتے پر سرجی نے میری پیالی میں کافی انڈیلتے

ہوئے کہا۔

"آندرے! ـــــ وہ کون ہے پارٹنر؟"

"وہی جس نے تمہیں گھر پہونچایا تھا۔"

ارے تو اس کا نام آندرے ہے۔ میں نے اپنا بیگ کھول کر ڈھونڈ ڈھانڈ کر اس کا کارڈ نکالا ـــــ ارے ہاں۔ ٹھیک۔ تو ہے ـــــ ظاہر ہے اس کا کوئی نام تو ہونا ہی چاہیئے تھا۔

"اچھا تو تم اُسے جانتے ہو؟"

"بس اتنا ہی کہ وہ آرٹ ہسٹورین ہے اور وی آنا کی یونیورسٹی میں آرٹ کی تاریخ پڑھاتا ہے" ـــــ سرجی نے کہا۔

دریائے سین کے ساتھ ساتھ ٹہلتے ٹہلتے میں سینٹ مائیکل برج کے قریب آ پہونچی ہوں۔ یہاں بہت سے ہسپانوی طالب علم اپنے رُک سیک لئے بیٹھے ہیں۔ اب انہوں نے اپنے سینڈوچ نکال کر کھانا شروع کر دیے۔

میں دریا کے قریب ایک پتھر پر بیٹھ گئی ہوں۔ ایک طالبعلم میرے قریب آیا۔"سینوریتا کیا تم سینڈوچ کھاؤ گی؟"

"نہیں" ـــــ میں نے ہنستے ہوے کہا ـــــ "لیکن مجھے اپنا گٹار دو۔ میں تمہیں ایک گیت سناؤں گی۔"

ہسپانوی لوک گیت کے ختم ہوتے ہی انہوں نے خوشی سے اور حیرت سے نعرے لگائے۔

"میں خود بھی کچھ ذرا سی ہسپانوی ہوں" ـــــ میں نے کہا۔ "اس لئے تم کو حیرت نہ ہونی چاہیے۔"

تب ایک آواز آہستہ سے آئی: "یہ بہت خوبصورت گیت تھا۔"

اور میں نے پلٹ کر دیکھا۔ یہ وہی حسین ۔ افسردہ چہرہ تھا

"اوہ ہیلو ـــــــــ!"

تب میں نے ہاتھ ہلاکر ہسپانوی طالب علموں کو خدا حافظ کہا۔ اور اس خوبصورت شخص سے کہا ـــــــ "میں سیر کرنے جا رہی ہوں۔ کیا تم چلو گے ؟"

تب زرد پتوں کو روندتے ہوئے ہم دور تک چلے گئے۔ اور ہم نے کتنی بہت سی باتیں کیں ـــــــ دکھ کی ـــــــ اور سکھ کی ـــــــ میں نے اسے اپنے خواب بتلائے۔ اور بتایا کہ زندگی سے میں کیا چاہتی ہوں ـــــــ اس نے بڑے تحمل سے یہ سب کچھ سنا۔ اور ایک بار پھر حیرت سے میں نے سوچا کہ میں کیوں اس سے اتنی باتیں کر رہی ہوں ؟ میں کیوں اس سے بڑے تکلف سے سیدھی سادھی چھوٹی چھوٹی باتیں نہیں کرتی ؟ ـــــــ

تب سین کے کنارے جھک کر اس نے مجھے پیار کیا اور کہا "تم بہت حسین ہو۔ اور بہت دلچسپ ـــــــ اور تم مجھے بہت یاد آتی ہو ـــــــ اور مجھے تمہارا پہلا نام تک یاد نہیں"

"نندیتا" ـــــــ میں نے اسے بتایا۔

اور میرے بال اس کے چہرے پر بکھر گئے۔ اور اس نے کہا ـــــــ "نندیتا یہ بال کیسے میری راہ میں حائل ہو جاتے ہیں"

میں نے ہنستے ہوئے اپنے بالوں کو سمیٹنے کی کوشش کی۔

"میں شکایت تو نہیں کر رہا نندیتا" ـــــــ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تم ہمیشہ ہنستے رہا کرو۔ جب تم ہنستے ہو تو بہت اچھے لگتے ہو۔"

تب اس کا ہاتھ تھامے تھامے میں سرجی کے فلیٹ تک آئی۔ اور میں نے تحیر سے سوچا ـــــ اس ہاتھ کو تھام کر مجھے کتنی طمانیت محسوس ہوئی ـــــــ جیسے دنیا میں مکمل امن ہو اور کوئی دکھ نہ ہوں۔

اور ایک دم وہ رکا اور اس نے کہا ـــــــ "سنو نندیتا ـــــــ یہ کیسی عجیب بات ہے

کہ ہم ایک غیر زبان میں گفتگو کر رہے ہیں اور اس کے باوجود اتنی بہت سی باتیں کر سکتے ہیں
مجھے ابھی ابھی یہ خیال آیا —— " اس کے چہرے پر بچوں کی سی خوشی تھی اور بچوں کی
سی حیرت ۔

"کل ہم پھر سیر کرتے جائیں گے —— ہے نا ؟ —— اس نے کہا ۔

ہم زرد پتوں کے فرش پر بیٹھ گئے ۔ اس نے اپنے بازو میری طرف بڑھائے اور میں نے
اپنا سر اس کے شانے پر رکھ دیا ۔ اور ہزارویں دفعہ میں نے حیرت سے سوچا ——
یہاں کتنا امن ہے —— اور کس قدر تحفظ کا احساس —— جیسے اب کوئی دکھ ہم تک نہیں
نہیں پہنچ سکتا —— جیسے رنج والم اب ہماری زندگی کو چھو تک نہیں سکتے ——

" شاید بالآخر مجھے عشق ہو گیا ہے ۔" میں نے اس سے کہا ۔

اس کے خوبصورت چہرے پر پریشانی ہے اور الجھن ہے اور افسردگی ہے ——
اور اس کے بالوں میں چاندی کے تار ہیں —— اور دو آنسو اس کی پلکوں سے نکل کر میرے
بالوں میں اُلجھ گئے ہیں ۔

" تم اتنے پریشان کیوں ہو ؟"

" تمہارے لئے ۔"

" اور تم رو کیوں رہے ہو ؟"

" جب میں بہت خوش ہوں تو رو دیتا ہوں ۔" اور اس نے ہنستے ہوئے اپنی آنکھیں
پونچھ ڈالیں

" کیا ہم آج شام کا کھانا ساتھ کھائیں گے ؟"

تب شمعوں کی روشنی میں میرے گلاس میں وائن انڈیلتے ہوئے اس نے کہا ۔ یہ سونڈ تیا ۔
کیا تم مجھ سے شادی کرو گی ؟"

" کیوں نہیں !"

"میں تم سے بہت بڑا ہوں نا —— پورے تیس سال۔"

اس سے کیا ہوتا ہے۔ تم مجھے اتنے اچھے لگتے ہو کہ میں تمہیں بتا بھی نہیں سکتی۔"

"تم فکر مت کرنا نندیتا۔ میں مروں گا نہیں —— میں سو سال تک زندہ رہوں گا اور میں ہمیشہ تمہارا خیال رکھوں گا۔ اور یہ کتنی اچھی بات ہوگی نندیتا۔ کہ جب بھی میری آنکھ کھلے تو تم قریب موجود ہو۔"

ہاں یہ اچھی بات ہوگی۔ کہ جب بھی میری آنکھ کھلے —— کسی بھی وقت —— تو تم قریب موجود ہو —— بالکل قریب۔"

مجھے عشق ہو گیا ہے" —— اگلی صبح میں نے اپنے بھائیوں کے سامنے اعلان کیا —— سرجی بہت زور سے ہنسا۔ اروِن نے بُرا سامنہ بنایا۔ صرف ارجن خاموشی سے اپنا پائپ بھرتا رہا۔

"وہ کون بد قسمت ہے؟ —— اسے یہاں لاؤ بی بی" —— سرجی نے تارپین کے تیل سے برش صاف کرتے ہوئے کہا۔

"میں سب جانتا ہوں۔ یہ وہ آرٹ ہسٹورین ہے" —— اروِن نے خفگی سے کہا

"اروِن میرے بھائی۔ تم اس قدر خفا کیوں ہو۔ میں بہر حال اس سے شادی کر رہی ہوں اور آج شام کا کھانا ہم یہاں کھائیں گے۔"

"بیگم صاحبہ، آپ شاید یہ بھول گئیں کہ آپ انڈر گریجویٹ ہیں اور جب تک آپ اپنی ڈگری ختم نہیں کر لیتیں، آپ کو شادی کی اجازت نہیں مل سکتی —— قاعدے سے آپ کو اپنی منگنی تک کی اطلاع پرنسپل کو دینا چاہیے ——" اروِن مستقل خفا تھا۔

"تو کیا ہوا۔ ہم اگلے موسم بہار میں شادی کر لیں گے" —— میں نے اپنا ٹائپ رائٹر اور گٹار اٹھاتے ہوئے کہا۔

"یہ اپنی چیزیں تم کہاں لئے جا رہی ہو؟ ——"

اروِن خوفزدہ تھا۔ وہ مجھے خوب پہچانتا تھا۔ یہ میری کل متاع تھی ـــــ جب میں اپنا ٹائپ رائٹر اور گٹار اٹھاؤں تو بس میں گئی

" نندتیا ـــــ نندتیا ـــــ تمہیں بہت دکھ پہونچے گا ـــــ یہ لوگ جو ہم سے عمر میں بڑے ہوتے ہیں نا۔ ان کے پاس ہمارے لئے کچھ نہیں ہوتا۔ یہ صرف دکھ پہونچاتے ہیں۔ یہ ہمیں نہیں سمجھ سکتے۔ کیونکہ یہ زیادہ سمجھدار ہوتے ہیں۔"

اروِن بہت دہشت زدہ تھا۔ اس نے دراصل خود اپنے ٹیوٹر کی بیوی سے بہت زوروں سے عشق کیا تھا۔ اور بقول اپنے بہت دکھ اٹھایا تھا۔

" اروِن ـــــ نندتیا کو اپنے فیصلے خود کرنے دو" ـــــ سرجی نے کہا۔

" اسے جانے دو اروِن" ـــــ ارجن نے پائپ پر سے نظریں اٹھا کر کہا۔

" نہیں ـــــ میں کوئی دکھ نہیں اٹھاؤں گی ـــــ آندرے نے کہا تھا وہ ہمیشہ میرا خیال رکھے گا۔ وہ سو سال تک زندہ رہے گا۔"

ہنستے ہوئے میں نے زینہ طے کیا۔ اور اپنی چیزیں دیوان پر پٹخ دیں۔ ڈیسک پہ کاغذ بکھرے پڑے تھے۔ اور وہ کچھ لکھ رہا تھا۔ اس کے قریب پہنچ کر میں نے اپنے بازو پھیلائے ـــــ اور کہا ـــــ " ہم کو پیار کرو آندرے۔"

اس کے چہرے پہ بڑی پریشانی تھی: " آدھ گھنٹے بعد کانفرنس شروع ہو رہی ہے اور مجھے آج یہ مقالہ پڑھنا ہے نندتیا۔"

" تو کیا ہوا تم مجھے ایک منٹ کے لئے پیار تو کر سکتے ہو۔"

" تمہیں معلوم ہے۔ ایک منٹ کتنا طویل ہو جاتا ہے۔ تم بہت خطرناک ہو۔ میں پہلے بھی ایک سیشن پہ نہیں پہونچ سکا تھا۔ پلیز نندتیا۔ پریشان مت کرو۔"

اور پھر اس نے جھنجھلا کر کہا۔ میں صرف خوشی پہ تو زندہ نہیں رہ سکتا۔ میرا کام بھی تو ہے نندتیا ـــــ اور بچوں کی طرح ضد مت کرو۔"

وہ بہت دکھ بھرا لمحہ تھا۔ اور اس دکھ بھرے لمحے میں میں اپنی چیزیں اٹھا کر لوٹ آئی۔
پھر سین کے کنارے بیٹھ کر میں پھوٹ پھوٹ کر روئی۔

ہاں کام بہت اہم ہے کام سے عزت ملتی ہے۔ اور شہرت ملتی ہے ـــــ اور پیار کیا ہے۔
اس میں صرف دکھ ہیں۔ رنج والم ہیں ـــــ شاید پیار بہت حقیر چیز ہے ـــــ
شاید جو پیار کرتا ہے، وہی حقیر ہے ـــــ

اور اس شام میں نے نیا اعلان کیا۔
اب ہم کبھی عشق نہیں کریں گے۔
سرجی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں ـــــ "بہت جلد یہ فیصلہ کر لیا تم نے۔"
اورن نے غصے سے پیر پٹخے ـــــ "وہی ہوا جس سے میں ڈرتا تھا۔"
اور ارجن حسب معمول اپنا پائپ صاف کرتا رہا۔
اور پھر میرے تینوں بھائیوں نے ایئرپورٹ پر کھڑے ہو کر ہاتھ ہلایا۔ اور اب وہ نظر سے اوجھل ہو گئے ہیں ـــــ پیرس پیچھے رہ گیا ہے ـــــ غسل خانے میں جا کر میں نے واش بیسن پر اپنا سر رکھ دیا ہے۔ بہت دیر کے رکے ہوئے آنسو ٹپ ٹپ کر کے گرتے رہے۔

میں سو سال تک زندہ رہوں گا نندتیا ـــــ
میں ہمیشہ تمہارا خیال رکھوں گا نندتیا ـــــ
خدمت کرو نندتیا ـــــ

یہ کیسا جنم جنم کا غم تھا جو میں نے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ کس لئے انسان اتنے دکھ سے گزرتا ہے ـــــ کس لئے ہم ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، جبکہ لمحے اتنے مختصر ہیں ـــــ اور جاننا اتنا دشوار ہے ـــــ

ـــــ ـــــ ـــــ

میں آندرے ہوں۔ اور اس کے کالج کی لاج میں جا کر میں نے پورٹر سے پوچھا ہے۔

"کیا میں پشوپتی رانا سے مل سکتا ہوں ؟"

اس نے نوٹس بورڈ پر لگے ہوئے ایک پلین کی طرف اشارہ کیا۔" لائیبریری سٹیرکیس ——

کمرہ ۱۲ —— کیا آپ رستہ تلاش کر لیجئے گا ؟" —— اور وہ لاج سے باہر نکل آیا۔ "وہ دیکھئے

پاپلر (POPLAR) کے درختوں کے قریب —— صدر دروازے سے اندر جا کر اگر آپ دائیں

ہاتھ گھوم جائیے تو غلام گردش کے آخر میں آپ کو زینہ نظر آئے گا۔ وہاں سے پہلی منزل پر ——

کمرہ ۱۲ —— کوریڈور کے آخر میں ہے —— دریا کی سمت —— کمرے پر نام کا کارڈ

لگا ہوگا —— یہ ہمارے کالج کا سب سے خوبصورت سٹیرکیس ہے" —— پورٹر نے فخر سے

سر ہلایا۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔

"آجاؤ"

وہ دیوان پر لیٹی ہے۔ اپنا لبادہ اوڑھے ہوئے —— اس کا بھائی اردن اس کے قریب

بیٹھا ہے۔ اردن نے مجھے کبھی پسند نہیں کیا —— اور اب وہ اٹھ کر باہر چلا گیا ہے۔ "میرا خیال

ہے میں ذرا دریا تک ہو آؤں۔"

ایک لمحے کے لئے نندتیا کے چہرے پر حیرت کی جھلک آئی۔ مسکراہٹ اس کے چہرے

پر بکھر گئی ہے اور اس نے کہا۔ "آؤ۔ آؤ ہر پروفیسر —— تم کہاں گھوم رہے ہو —— میرے خیال میں

تم وہ آتشدان کے قریب والی کرسی لے لو۔ وہ سب سے آرام دہ ہے۔ اب بتاؤ تمہاری کیا خاطر

کریں —— کافی پیو گے ؟ —— اچھا شیری سہی ؟ —— اور یہ بتاؤ تم انگلستان میں کیا

کر رہے ہو ؟ اچھا تو تم رائل اکیڈمی کی دعوت پر آئے ہو —— ؟" —— اس نے معنی خیز

طریقے سے سر ہلایا —— "تب تو، پارٹنر، تم کو بہت مصروفیت ہوگی۔ ناحق تم نے ایک دن آکسفورڈ

پر برباد کر دیا —— تمہارے کام کا بہت حرج ہوگا۔"

میں نے غور سے اُسے دیکھا ہے۔ نہیں —— اس جملے میں کوئی طنز نہیں ——

یہ سیدھا سادا بیانیہ جملہ ہے۔

اس کے سیدھے دراز بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوتے ہیں۔ اس کی پیشانی اور گردن پر ذرا سا پسینہ ہے اور چند بال وہاں چپک گئے ہیں۔

"میرے خیال میں اگر تمہیں تکلیف نہ ہو۔ تو ذرا یہ آگ بجھا دو۔ آج کل سنٹرل ہیٹنگ پوری شدت سے چل رہی ہے۔"

میں نے بجلی کی آگ کا بٹن بند کر دیا ہے۔ میں نے اپنے رومال سے اس کا پسینہ خشک کیا۔ اور اس نے آہستہ سے کہا۔ "شکریہ۔"

تب میں نے اپنا چہرہ اس کے بالوں میں چھپا لیا ہے ——— اور کہا ——— "نندتیا ——— نندتیا ——— تم مجھے بہت یاد آتی ہو۔"

ایک لمحے کے لئے اس کی انگلیاں میرے بالوں پر رکیں۔ ان انگلیوں میں وہی پرانی ملائمت تھی۔ میرے ماتھے پر گرے ہوئے بال اس نے پہلے پیار سے پیچھے ہٹا دیے۔ پھر ایک دم وہ انگلیاں مضطرب ہو گئیں ——— یہ ہاتھ بھی عجیب چیز ہیں ——— یہ کچھ نہ کہتے ہوئے بھی سب کچھ کہہ جاتے ہیں۔

"کیا میں تمہیں پیار کر سکتا ہوں نندتیا؟"

"اگر تمہارا جی چاہے ——— لیکن مجھے فلو ہے، کہیں تمہیں نہ ہو جائے ———"

اور اس نے نرمی سے اپنا سر ہٹا لیا۔

"تم کیسے وقت یہاں آئے۔ جبکہ میں ذرا بیمار ہوں۔ اور فلو تو اڑ کر لگنے والی چیز ہے اور پھر آج شام کو میری ٹیوٹر نے مجھے شیری پہ بلا رکھا ہے۔ یہ آکسفورڈ دراصل بہت بے ہنگم جگہ ہے۔ جب کوئی طالب علم بیمار ہو جائے تو اسے تنہا نہیں چھوڑا جاتا ——— دراصل یہاں ہماری بہت دیکھ بھال کی جاتی ہے ——— لیکن کوئی بات نہیں۔ اروِن یہاں ہے۔ آج شام وہ ہمارے کالج میں کانسرٹ دے رہا ہے جس کی آمدنی ہمارے کالج کے بلڈنگ فنڈ میں جائے گی۔ وہ تمہیں آکسفورڈ دکھا دے گا وہ تمہیں کانسرٹ پر بھی لے جائے گا۔ پھر شام کا کھانا ہم سب ساتھ کھائیں گے

تم کہاں کھانا پسند کرو گے ؟"

اس نے گویا میری زندگی کا سارا پروگرام طے کر کے رکھ دیا

"اور تم کہاں ٹھہرے ہو ؟ —— ارے ناحق تم نے ہوٹل میں کمرہ لیا —— تم اردن کے پاس ٹھہر سکتے تھے ۔ وہ جب بھی آئے ماڈلین میں ٹھہرتا ہے یہ اس کا پرانا کالج ہے اور اکیڈمی نے تمہیں کس سلسلے میں بلایا ہے ؟ ظاہر ہے کوئی دلچسپ کام ہوگا —— اچھا تم نمائش کا افتتاح بھی کر رہے ہو ! کیسی عمدہ بات —— اگر میری طبیعت ٹھیک ہوتی تو میں ضرور آتی"

وہ اس پُر تکلف مہذب لہجہ میں مجھ سے باتیں کر رہی تھی ، جس کا ذکر اس نے خود بہت دفعہ ہنس ہنس کر پیرس میں کیا تھا ۔

"سنو آندرے یہ رسمی قسم کے ریسپشن بھی خوب ہوتے ہیں ۔ مجھے ہر ٹرم میں کم سے کم چھ پر جانا پڑتا ہے ۔ بہت تفریح رہتی ہے —— اوہ ۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کس کالج کے کس ہال میں ہے ۔ ان سب میں وڈ پینیلنگ (WOOD PANELLING) ہوتی ہے —— اور گہرے آتشیں رنگ کے قالین —— اور جھاڑ فانوس —— اور دیواروں پر روغنی تصویریں —— اور ان مخملیں قالینوں پر چلتے ہوئے شیری یا وائن کا گلاس ہاتھ میں لئے ہوئے —— ساری کا پلّو بڑے انداز میں بائیں شانے پر گرائے ہوئے —— میں —— سندیتا پشوپتی رانا —— اپنی ڈپلومیٹک مسکراہٹ بکھیرتی ہوں ۔ "ہیلو مسٹر بلوغ ! پچھلی چھٹیوں میں آپ کا مشرق وسطیٰ کا دورہ کیسا رہا ؟" —— "ہیلو سر رائے ! کیا کامن مارکیٹ میں برطانیہ کے شامل ہونے کے بارے میں اب بھی آپ کی وہی رائے ہے جو پہلے تھی یا بدل گئی ؟ —— میں نے سنا ہے اگلی ٹرم میں آپ کرنسی اور کریڈٹ پر لیکچر دے رہے ہیں —— کاش کہ یہ میرا مضمون ہوتا" —— "ہیلو سر ولیم ! آپ روس سے کب لوٹے ؟ —— آپ کا ٹرپ کیسا رہا ؟" —— "اوہ ہیلو لیڈی ہیٹر ! آپ کا لباس کتنا خوبصورت ہے ۔ لیکن آپ اس لباس سے بھی زیادہ خوبصورت ہیں" —— "ہیلو مسٹر ادیبی ! میں نے آپ کی نئی کتاب دیکھی ۔ بہت اچھی ہے —— اگر

لیبر اس دفعہ انتخابات جیت گئی تو کیا آپ حکومت کے ایڈوائزر بن کر چلے جایئے گا ؟ اور اگر چلے جایئے گا تو پھر آکسفورڈ کا کیا ہوگا ؟"۔۔۔ "ہیلو مسٹر کرنٹش ! آپکا کل کا لیکچر بہت دلچسپ تھا۔ لیکن جب آپ نے کہا کہ کچھ لوگ تو بس ہر وقت پلٹ پلٹ کر تتلیوں کو دیکھتے رہتے ہیں، یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ہاتھ نہ آنے والی چیز ہیں، تو اگلی قطار میں بیٹھے ہوئے بعض لڑکے بہت شرمائے"

۔۔۔ "ہیلو مسٹر روجرز ! میں نے سنا ہے۔ جب آپ کے پاس آل سولز کی فیلو شپ تھی۔ تو آپ مستقل پانچ برس تک جاسوسی ناول پڑھتے رہے ۔۔۔ !"

میرا جی چاہا۔ میں چیخ پڑوں اور کہوں ۔۔۔ نندیتا ۔۔۔ نندیتا ۔۔۔ تم مجھ سے صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ میں چلا جاؤں ۔۔۔ یا شاید یہ غیر مہذب حرکت ہوگی۔

۔۔۔ ہاں وہ مجھ سے مستقل اسی ٹون میں باتیں کر رہی تھی جیسے یہ اس کا کمرہ نہیں، کسی کالج کا ہال ہے اور یہ کوئی بڑا بھاری قسم کا ریسپشن تھا اور اسی قسم کی کسی تقریب پر ہم پہلے مل چکے تھے ۔۔۔ اور اُسے معلوم تھا کہ میں کیا کرتا ہوں۔ اور میری دلچسپیاں کیا ہیں ۔۔۔ اور میں نے ابھی حال ہی میں کیا کیا ہے اور مجھ سے کس قسم کی گفتگو کرنا چاہیئے۔

جیسے ہم پہلے سچ مچ کبھی نہیں ملے ۔۔۔ جیسے ہم نے مستقبل کے کسی خاکے میں کبھی رنگ نہیں بھرے ۔۔۔ اور کبھی اس نے مجھ سے لپٹ کر یہ نہیں کہا تھا ۔۔۔ "آندرے ہم کو پیار کرو"

اور اب اس نے آکسفورڈ کے بارے میں ایک گائیڈ بک نکالی ہے اور مجھے بتا رہی ہے کہ کون کون سی جگہیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ لیکن اس نے ایک بار بھی یہ نہیں کہا۔ یہاں مَاڈلین ٹاور ہے۔ جہاں ہم یکم مئی کو حمد گا کر بہار کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ اس سے پہلی رات اکثر لوگ دریا پر گذارتے ہیں۔ گذشتہ برس رات بھر بارش ہوتی رہی ۔۔۔ ہم لوگ الاؤ جلاتے اور وہ بجھ بجھ جاتا ...... رات بھر ہم کمبلوں میں لپٹے ٹھٹھرتے رہے ۔۔۔ تم اگلی مئی کو ضرور یہاں آنا ہم شام دریا پر گذاریں گے ۔۔۔ ہم صبح کو ماڈلین ٹاور پر ساتھ جائیں گے ۔۔۔ اس کے بعد کالج میں ناشتہ کریں گے ۔۔۔ اور پھر ہائی سٹریٹ میں موریس ناچ دیکھیں گے ۔۔۔

"کیا میں اگلے موسم بہار میں یہاں آؤں گا نندتیا؟" ——— میں نے اس سے پوچھا۔

"اگر تمہارا جی چاہے ——— " ——— اس نے سادگی سے کہا۔

——— اس نے ایک بار بھی یہ نہیں کہا: "تم اگلے موسم بہار میں آکسفورڈ ضرور آنا ——— ہم سپرنگ بال پر جائیں گے ——— اور ہم کومیمورلیشن بال پر جائیں گے۔ یہ ہمارے ہاں کی پرانی روایات ہیں ——— یہ بہت آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے رقص ہوتے ہیں ——— مدھم مدھم روشنیاں ——— اور آرکسٹرا ——— مختلف کمروں میں مختلف قسم کی موسیقی ——— عام طور پر لائبریری میں سب سے اچھی موسیقی ہوتی ہے ——— اور تم بہت اچھا رقص کرتے ہو ——— اور تمہارے ساتھ جا کر مجھے بہت خوشی ہوگی ——— عام طور پر میں اپنے بھائیوں اور ان کے دوستوں کے ساتھ جاتی ہوں ——— اب تک میں کسی کے ساتھ تنہا نہیں گئی ——— دراصل مجھے کوئی اچھا آدمی ملا ہی نہیں ——— جب یہاں میرا پہلا سال تھا تو میرے پاس چھ دعوت نامے آئے لیکن وہ سب کے سب بہت بور لوگ تھے ——— ایک کی ناک بہت لمبی تھی ——— دوسرے کا چہرہ بہت چپٹا اور سر بہت چھوٹا تھا ——— تیسرا ہر وقت اپنے بورڈنگ سکول کا ذکر کرتا رہتا تھا ——— اور باقی تین بھی ایسے ہی گڑبڑ تھے ———

تب میں بہت روئی۔ اور میں نے اپنے بھائی اروِن سے کہا ——— "اروِن، آدھ گھنٹے تک تو خیریت ہے لیکن کسی کے ساتھ تو گھنٹے تک کیسے رقص کیا جا سکتا ہے، جب تک وہ شخص بہت ——— بہت زیادہ پسند نہ ہو۔" ——— اروِن مجھے روتے دیکھ کر بہت گھبرایا اور پھر وہ مجھے رقص پر لے گیا ——— لیکن تمہارے ساتھ جانا بہت اچھا رہے گا۔ ہے نا ؟ تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو ——— ٹھہرو میں کون سا لباس پہنوں گی! میرا خیال ہے۔ میں ہندوستان سے چند نئی ساریاں منگواؤں گی۔ اور پھر تم مجھے بتانا کہ میں کونسی پہنوں ——— اور اب وہ مجھے بتا رہی ہے کہ کس کالج کی چیپل میں کیا خوبی ہے۔

"نندتیا ——— کیا میں اگلے موسم بہار میں یہاں آؤں گا ——— ؟ ——— کیا ہم بہار

کے رقص پر ساتھ جائیں گے ؟؟"

اس نے تکیئے سے سر اٹھا کر مجھے دیکھا " شاید —— لیکن اگلا موسم بہار تو ابھی بہت دور ہے —— ابھی تو یہ خزاں کی ٹرم ہے ۔"

میں نے ایک آخری DESPERATE کوشش اور کی ہے —— " نندتیا —— کبھی ہم نے عشق کیا تھا بہت بھرپور —— بہت شدید —— کیا اب وہ سب باتیں بے معنی ہو کر رہ گئیں ؟ —— وہ چار ہفتے ہی سہی لیکن کیا چار ہفتوں کو زندگی سے کاٹ کر یوں دور پھینکا جا سکتا ہے ؟"

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی ہے —— " سنو آندرے —— وہ جو چار ہفتے تھے ، ان میں میں نے بے پناہ خوشی دیکھی —— لیکن ہم ان کا ذکر نہیں کریں گے —— اس کے بعد تیرہ ہفتے اور بھی گزر چکے ہیں —— اور عشق کیا ہے ؟ یہ مجھے نہیں معلوم —— شاید ہم سب خوفزدہ ہیں —— اور تنہا ہیں —— اور اس خوف سے گھبرا کر عشق کر ڈالتے ہیں ۔ شاید تم نے ایک بار ٹھیک کہا تھا کہ میں تم سے عشق نہیں کرتی —— یا شاید جذبے کو کسی دوسرے تک پہونچانا بے حد مشکل کام —— یہاں نہ الفاظ کام آتے ہیں نہ لمس ۔ ہم سب کی VOCABULARY مختلف ہے —— خواہ وہ الفاظ کی ہو جسم و جاں کی اس VOCABULARY میں ہمارا ماضی شامل ہوتا ہے اور ہمارے مستقبل کے خواب —— لیکن شاید یہ بھی بڑی بات ہے کہ کوئی شخص زندگی میں ہر اعتراف سے دامن بچاتے ہوئے گزرتا چلا جائے —— ملکوں ملکوں گھومتا رہے —— جنم جنم بھٹکتا پھرے —— اور پھر کہیں ایک لمحے کے لئے ہی سہی ، لیکن کسی سے اپنے وجود کی پوری شدت کے ساتھ یہ کہہ سکے —— " ہاں ہمیں تم سے عشق ہے ۔" یہ اپنی ذات سے دیانت برتنے کا مسئلہ ہے ۔ جسم و جاں کے خلوص کا سوال ہے ۔ کسی سے یہ کہنا کہ تم ہمیں بہت اچھے لگتے ہو ۔ اتنا ہی دشوار ہے ۔ جیسے جب کوئی اچھا نہ لگتا ہو اور وہ کہے تم ہمیں بہت اچھی لگتی ہو ۔ اور ہم ہنس کر ٹال جائیں اور کہیں

شکریہ —— کسی سے یہ کہنا، ہمیں پیار کرو پلیز —— اتنا ہی دشوار ہے جیسے جب کوئی ہمیں
پیار کرنا چاہے تو ہم پریشان ہو کر اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیں اور کہیں، تم ہمارا ہاتھ چوم سکتے ہو۔ بس
—— لوگ ایک دوسرے کی انجانے میں کتنی تحقیر کرتے ہیں۔ تحقیر وہ انڈر گریجوایٹس بھی
کرتے ہیں جو جھک کر پوچھتے ہیں تم ہم سے پیار کرتی ہو۔ ہے نا؟ — اور وہ بھی اتنی ہی تحقیر کرتے ہیں
—— جو یہ کہیں —— نہیں تم ہم سے پیار نہیں کرتیں —— ہماری ذات کی
دیانت دونوں صورتوں میں مجروح ہوتی ہے۔ ہمیں کیا حق پہنچتا ہے کہ ہم کسی کے جذبے کی تحقیر کریں
—— عشق کی اہمیت بس اتنی ہی ہے ہر پروفیسر کہ وہ ہمیں اپنی ذات سے دیانت برتنا
سکھا دیتا ہے —— اس سے زیادہ کی خواہش اگر کوئی کرتا ہے تو وہ اس کی حماقت ہے
اور سادگی ہے —— اور بچپنا ہے۔"

وہ تھک کر لیٹ گئی

"پلیز آندرے —— ہم ان باتوں کا ذکر نہیں کریں گے۔"

میرے دل پر ایک چوٹ سی پڑی ہے۔ یہ وہ نندتیا نہیں —— اس نے ایک
بار بھی بچوں کی طرح اپنے بازو میری طرف نہیں پھیلائے۔ اور یہ نہیں کہا:
کیا تم ہم کو پیار نہیں کرو گے آندرے!

میں ارجن ہوں۔ نندتیا کا سب سے بڑا بھائی۔

میں ابھی ابھی آکسفورڈ پہونچا ہوں۔ وہ مجھے اپنے کالج کے زینے پر ملی۔

"اوہ۔ ہیلو۔ ارجن ——" اس نے سادگی سے کہا۔ وہ خوشی سے چیخ کر میرے گلے
سے نہیں لپٹی ——

"تم کمرے میں چلو۔ میں یہ خط ڈال کر آئی۔"

کمرے میں اوپر تلے بہت سے بکس پڑے ہیں۔ ایک طرف کارڈبورڈ کے بکسوں کا

ڈھیر لگا ہے ـــــ وارڈ روب خالی ہے اور کپڑے پلنگ پر اور کرسیوں پر پڑے ہیں ہیں نے بیٹھنے کے لئے جگہ تلاش کی ہے۔

چھٹیوں کے شروع میں ہمیشہ اس کمرے کا یہی حشر ہوتا ہے۔ صرف ایک فرق ہے یہاں ہمیشہ اس کمرے میں بہت سے لوگ مل کر پیکنگ کیا کرتے تھے۔ آج نندیتا تنہا ہے۔ آج اسکے دوست یہاں نہیں ہیں ـــــ ہمیشہ وہ ٹرم کے خاتمے پر بہت غل مچاتی ـــــ اوہ کس قدر کام ہے۔ مجھے بہت سے کارڈ بورڈ بکس چاہیئں ـــــ اور پھر سب لوگ ہنستے' غل مچاتے، کالج کے باغ میں جاکر باغبان سے اس کا دستی ٹھیلہ مانگتے اور اسے دھکیلتے ہوئے مختلف شراب خانوں میں جاتے ـــــ آس پاس کے سب شراب خانوں کے مالک اس کو پہچان گئے تھے اور اس کے پہنچتے ہی خالی بکس نکالنا شروع کر دیتے۔

اس لدے ہوئے ٹھیلے کو لے کر وہ کالج پہونچتے ـــــ اور ہر شخص اپنا اپنا کام شروع کر دیتا۔ ایک صاحب نازک چیزیں پیک کرنے کے ماہر تھے۔ وہ گڑیاں، مجسمے، نوادر اور شیری کے گلاس پیک کرتے ـــــ ایک اور حضرت زیادہ سے زیادہ کپڑے چھوٹے سے چھوٹے بکس میں ٹھونس دینے میں کمال رکھتے تھے۔ تیسرے کی خصوصیت کتابیں پیک کرنا تھی۔

وہ آرام سے ٹیبل پر بیٹھ جاتی "تم یہ سب کام کرو۔ میں کچھ خطوں کے جواب لکھ لوں۔ ورنہ وہ چھٹیوں بھر پڑے رہیں گے۔"

جب سب لوگ کام ختم کر کے پسینہ پونچھتے ہوئے اس کے قریب آتے تو وہ مسکراتی۔ "اوہ کام ختم ہو گیا! اچھا اب میں تم لوگوں کو کافی پلاؤں گی" ـــــ جیسے اس سارے کام کی تلافی صرف ایک پیالی کافی تھی۔

ارون بہت خفا ہوتا "نندیتا یہ بہت بری بات ہے۔ تمہیں اپنا سب کام خود کرنا چاہیئے۔"

"لیکن میرے پیارے بھائی۔ تمہیں نہیں معلوم وہ سب اس کام کو کس شوق سے کرتے ہیں"

"اوہ مجھے سب معلوم ہے" —— وہ چڑ کر کہتا۔ "تم —— تم لوگوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتی ہو —— یہ استحصال ہے۔ قطعی جذباتی استحصال" —— وہ موٹے موٹے لفظ استعمال کرتا۔

اور آج وہ تنہا پیکنگ کر رہی تھی —— اور بھاری بھاری چیزیں اٹھا رہی تھی۔

—— مدت سے ہم سب یہ چاہتے چلے آئے تھے کہ وہ اپنا کام خود کرنا سیکھے —— برس ہا برس سے ہم چاہتے چلے آئے تھے کہ اس میں متانت آجائے اور تحمل آجائے —— ہاں اس میں متانت آگئی اور تحمل آگیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اور کتنا بہت کچھ آگیا اس میں بردباری آگئی اور RESIGNATION بھی آگئی —— ہم نے یہ سب تو نہیں چاہا تھا۔

اس نے اپنی ساریاں تہہ کر کے بکس میں رکھیں۔

"نندتیا —— تمہارے سب دوست کدھر ہیں آج ؟" میں نے پوچھا۔

"ارجن —— میں نے سوچا تو اردن کی بات ٹھیک معلوم ہوئی —— یہ جذباتی استحصال ہے —— اور یہ غلط بات ہے ——" بکس کا ڈھکنا بند کرتے ہوئے اس نے سر اٹھا کر ہنستے ہوئے کہا۔ "انسان دراصل تنہا ہے —— بالکل تنہا —— ہے نا ارجن !" یہ اس نے ایسے ہی کہا۔ جیسے بیسیوں بار اس نے کہا تھا: "ہم کو آئس کریم کھلانے لے چلو گے ہے نا ارجن !" یا جیسے کوئی اچھا ڈرامہ یا بیلے دیکھنے کے بعد وہ کہا کرتی: "کیسی خوبصورت شام تھی —— ہے نا ارجن !" یا موسم بہار کی کسی چمکیلی روشن صبح وہ سبزے پہ لوٹے لگاتی اور کہتی: "زندگی بہت خوبصورت ہے —— ہے نا ارجن"۔ انسان کی تنہائی کا ذکر بھی اس نے اسی سادگی سے کیا۔ صرف اس کے ہونٹ اپنے خم کے قریب ذرا سا کپکپائے تھے ——

"اردن حسب معمول ماڈلین میں ٹھہرا ہے —— سرجی رینڈولف میں ہے۔ کیونکہ اسکی

موجودہ محبوبہ بھی آئی ہے۔ شاید یہ اس کی گیارہویں یا تیرہویں محبوبہ ہے —— اس کی محبوبائیں اس قدر جلد بدلتی ہیں کہ میں تو دراصل نمبروں کا گھپلا کر جاتی ہوں۔ کل ہم سب رقص پہ گئے تھے —— ہمارے پاس آج کی شام بھی ہے —— پھر میں چھ ہفتوں کے لئے چلی جاؤں گی، کیسی عجیب بات ہے ارجن کہ آکسفورڈ میں آدمی ہفتوں کے حساب سے سوچتا ہے —— دو ہفتے —— چار ہفتے —— آٹھ ہفتے —— جبکہ زندگی دراصل لمحوں سے عبارت ہے —— اور صبحوں سے —— اور شاموں سے۔ شاید یہ یہاں کا اکیڈیمک ماحول ہے جس میں ٹرم آٹھ ہفتے کی ہے —— اور ٹرم کے ہر ہفتے میں دو مقالے لکھنا پڑتے ہیں —— تم نے ہماری اس ٹرم کی رپورٹس نہیں سنیں ارجن —— بہت خراب ہیں —— میرے ٹیوٹرز کا کہنا ہے کہ میرا کام اس ٹرم میں بہت مایوس کن رہا ہے —— یہ لوگ ایسے الفاظ کیوں استعمال کرتے ہیں "مایوس کن" —— جیسے میرے کام سے بھی ان کی آرزوئیں لپٹی ہوتی ہوں۔ شاید میری کلاس صرف میری ذات متاثر نہیں ہوگی بلکہ ان کا بھی اس چمک دمک میں حصہ ہوگا —— دنیا میں کیسی افراتفری ہے —— ہے نا ارجن —— اور دنیا اتنی بڑی بھی ہے —— مجھے کبھی کبھی اس وسعت سے، اس ہنگامے سے بہت خوف محسوس ہوتا ہے۔ جی چاہتا ہے یہاں کوئی گوشہ، کوئی مختصر سا گوشہ صرف اپنا بھی ہوتا جہاں زرد پتے بکھرے رہتے —— خودرو جنگلی پھول ہوتے —— اور سبز گھاس پہ لیٹ کر میں آنکھیں بند کر سکتی۔ اور دھرتی سے لپٹ کر صرف اتنا پوچھ سکتی —— میں کون ہوں؟ —— میں کیا ہوں —— اور میں کیا چاہتی ہوں —— مجھے دراصل اپنے آپ سے بہت خوف محسوس ہوتا ہے۔ کل میں پورٹ میڈو گئی تھی اور وہاں گھاس پہ لیٹ کر میں نے یہی پوچھنا چاہا تھا —— لیکن پھر ایک دم ایک تیز درد سے میری آنکھیں کھل گئیں —— وہاں ایک عجیب قسم کی جنگلی بوٹی تھی اور اس نے میرے بازو پہ کاٹ لیا تھا" ——

وہ جلدی جلدی پیکنگ کر رہی تھی۔ اور آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔

"کیا میں تمہاری کوئی مدد کروں؟" ——

"نہیں ارجن۔ اب تو بس کام ختم سمجھو —— اور تم یہاں کیوں بیٹھے ہو۔ کیوں نہیں تم ٹرف ٹیورن چلے جاتے۔ سرجی اور ارون دونوں وہاں ہیں —— میں بھی آدھ گھنٹے تک وہاں آجاؤں گی۔ پھر ہم سائیڈ پہ پیئیں گے۔"

"نندیتا —— تم اسپین جا رہی ہو —— یہ چیک رکھ لو۔ شاید تمہیں وہاں ضرورت پڑے ——"

وہ چونکی جیسے اسے پھر بچھو بوٹی نے کاٹ لیا ہو "ارے نہیں ارجن —— میرے پاس کافی پیسے ہیں —— تم یہ رکھو۔ تمہیں خود بھی کہیں ضرورت پڑ سکتی ہے۔"

یہ ہماری بہن تھی۔ اس نے کبھی کچھ لینے سے انکار نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ تو خود کہتی —— اسے میرے تین بھائی ہیں لیکن آج کل میں کس قدر کنگال ہوں —— وہ ہمیشہ ہی کنگال رہتی اور پھر بہت آرام سے وہ چیک جو اس کو دیتے جاتے، ہنس کر اپنے بیگ میں ڈال لیتی۔

اور پھر ہم نے اُسے خدا حافظ کہا۔ اس کے ایک ہاتھ میں اس کے کپڑوں کا کیس تھا اور دوسرے میں گٹار اور ٹائپ رائٹر۔

"لاؤ۔ میں تمہاری چیزیں اٹھا لوں۔ نندیتا" —— ارون ہمیشہ اس کا سامان اٹھاتا تھا۔

"ارے نہیں ارون —— یہ سب سامان مجھے سارے سفر میں خود ہی اٹھانا ہے۔ اچھا ہے عادت پڑ جائے۔"

"نندیتا کیا تم چاہو گی کہ ہم میں سے کوئی تمہارے ساتھ چلے؟ تم چاہو تو ہم سب چل سکتے ہیں" —— سرجی بہت گیلنٹ تھا۔

"ارے نہیں سرجی۔ پھر تمہاری تیرھویں محبوبہ کا کیا ہو گا —— اور ارون کی پہلی اور اکلوتی محبوبہ کے غم کا کیا بنے گا۔

اور ارجن کی سائنس کانفرنس کا کیا حشر ہو گا ——" وہ بہت زور سے ہنسی۔

اس نے سیٹ پر اپنی چیزیں رکھیں۔ ایک اطالوی نے اس کے قریب آ کر کہا "سینورا کیا

میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں ؟"

"شوق سے ــــ" اور اس نے ارون کو آنکھ ماری۔

اور پلیٹ فارم سے نکلتے ہوئے ارون نے کسی کو دیکھ کر خوفزدہ ہو کر کہا ــــ "ارے یہ تو وہ آرٹ ہسٹورین ہے"

ہاں وہ آندرے ہی تھا۔

"ہیلو آندرے ــــ کیا تم نندیتا سے ملنے آئے ہو ؟ ــــ ہم ابھی ابھی اسے خدا حافظ کہہ کر آئے ہیں۔ وہ اسپین گئی ہے۔ لوک گیتوں کی دھنیں جمع کرنے ــــ لیکن ابھی ہم یہیں ہیں اس لئے آج کی شام تم ہمارے ساتھ گزارو۔ یعنی اگر تم کچھ اور نہیں کر رہے ہو" ــــ سرجی نے شفقت سے مسکرا کر کہا۔

اس خوبصورت انسان کے چہرے پر افراتفری کی قسم کی کوئی پریشانی نہیں تھی۔ صرف ایک بادل سا آیا اور چھٹ گیا ــــ اس نے ٹکٹ چیکر کی طرف اپنا ٹکٹ بڑھایا ــــ اور ہمارے ساتھ چل پڑا۔

تب شام کو ہم ماڈلین برج کی سیڑھیاں اتر کر بوٹ ہاؤس تک گئے اور دریا کے قریب بیٹھ گئے ــــ روشنیوں کا عکس دریا میں پڑ رہا تھا۔ اور جگنو سے چمک رہے تھے۔

"یہ بوٹ ہاؤس میرے اور نندیتا کے کالج کا مشترک ہے ــــ یہ ہمارے کالج کے چپو ہیں" ــــ ارون نے قریب پڑے ہوئے چپو کی طرف اشارہ کیا ــــ "اور وہ نندیتا کے کالج کے ــــ وہ نیلی اور سفید دھاری والے ــــ کیا تم دریا کی سیر کرو گے ؟" ارون نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ملائمت سے پوچھا ــــ شاید اسے افسوس ہو رہا تھا اور آندرے سے ہمدردی ــــ ارون میں دوسروں کا دکھ سمجھنے کی بڑی صلاحیت تھی۔

"تم مجھ سے بہت خفا ہو نا ؟" ــــ آندرے نے سر اٹھا کر کہا۔

"نہیں تو۔ میں تم سے خفا نہیں ہوں۔ صرف میں نے اس کو دکھ سے بچانا چاہا تھا۔ وہ ہماری

بہت لاڈلی بہن تھی ـــــ اور اس کو اتنا دکھ پہنچا"

"اروِن پشتو پتی رانا ـــــ شاید ایسا چاہتے وقت تم یہ بھول گئے تھے۔ کہ ہم میں سے کوئی کسی کو دکھ سے نہیں بچا سکتا ـــــ چاہنے کے باوجود بھی نہیں ـــــ" سرجی نے ایک کنکر کو ٹھوکر مار کر دریا میں پھینک دیا۔

"کیا تم ٹہلنا پسند کرو گے ؟" ـــــ سرجی نے اس کے قریب جھک کر اور گھاس کا وہ تنکا جو اس کے بالوں میں اٹک سا گیا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر نرمی سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

اب سرجی اور اروِن ٹہلتے ہوئے دریا کے ساتھ ساتھ چلے گئے ـــــ میں نے اس کو غور سے دیکھا۔ ہاں یہ واقعی بہت حسین شخص تھا ـــــ بہت نفیس ـــــ اور بہت اداس بھی ـــــ

"تم چاہو تو نندتیا کے بارے میں گفتگو کر سکتے ہو" ـــــ میں نے اس سے کہا۔ ـــــ

"ہم پیرس میں ملے تھے۔ وہ موسم خزاں کی آمد آمد تھی ـــــ اور تب ہم نے اگلے موسم بہار میں یہاں ملنے کا وعدہ کیا تھا ـــــ پھر وہ کیوں چلی گئی ـــــ ؟" اس نے سر اٹھا کر کہا

دریا کا پانی آہستہ آہستہ بہہ رہا تھا ـــــ یہ دریا کا پانی ہے نا ـــــ یہ صدیوں سے یونہی بہتا چلا آ رہا ہے۔ لیکن کیا یہ وہی پانی ہے جو گذشتہ سال تھا یا اس سے پہلے تھا!ـــ تو یہ موسم بہار کیا وہی ہے جس کے بارے میں اس نے چند مہینے پہلے سوچا تھا! یا یہ کوئی اور سا موسم بہار ہے ـــــ کون کہہ سکتا ہے۔ کون جان سکتا ہے !!!

ہاں تم شاید اسے چاہتے ہو لیکن کیا اس نے تمہیں نہیں چاہا۔

وہ کس قدر خوش تھی ہنستے ہوئے آ کر اس نے کہا ـــــ "سوزمیں عشق ہو گیا ہے ـــــ" اس کا بس چلتا تو وہ قلابازیاں کھاتی اور ناچتے ناچتے دنیا بھر کو بتاتی۔ اس جذبہ میں کتنا تحیر شامل تھا ـــــ اپنی ذات کے بارے میں کتنے انکشافات شامل تھے ـــــ

وہ تمہارے ساتھ تیرنے کے لئے گئی۔ اور پھر سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی واپس پہونچی — اور میرے قریب آکر بولی ۔" ہماری گردن کے خم کے قریب جو یہ تل ہے، یہ بہت خوبصورت ہے — ہے نا ارجن —!"

پھر اس نے دستی آئینہ اٹھا کر اپنے بازو کو گھما پھرا کر دیکھا اور خفا ہو کر ارون کی طرف پلٹی ۔" ارون تم کیسے نکمے بھائی ہو ۔ ہم تم اتنی بار تیرنے گئے لیکن تم نے ہمیں کبھی نہ بتایا کہ ہمارے بائیں شانے پر نیچے کی سمت ایک تل ہے ۔"

پھر ایک روز اس نے کہا —" میرے بال بہت خوبصورت ہیں — ہے نا ارون — یہ دنیا کے حسین ترین بال ہیں ۔"

ارون دریچے سے باہر دیکھ رہا تھا ۔ چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح وہ پلٹا۔ وہ تم سے بہت جلتا تھا ۔" یقیناً یہ پہلا موقعہ نہیں ہے ۔ کہ کسی نے تم سے یہ کہا ۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے میرے بھائی — یقیناً یہ پہلا موقعہ ہے کہ مجھے یہ بات اتنی اچھی لگی ۔"

ہاں اس کی آنکھوں میں ستارے جھلکتے رہتے ۔ اور اس کے چہرے پر خواب بکھرے رہتے۔ اور ایک روز جب شاید تم لوگ ورسائی جا رہے تھے اور وہ ناچ ناچ کر گنگناتے ہوئے تیار ہو رہی تھی، سرجی بے خبری میں اس سے ٹکرا گیا۔

"ہیں — ہیں — سرجی ۔ دیکھ کر چلو بھائی ۔ ہماری شان میں یہ گستاخی — ہم آبگینوں سے بھی زیادہ نازک ہیں — کہیں ٹھیس نہ لگ جائے "— اس نے مصنوعی خفگی سے کہا

" یہ بات ہے — ہیں بی بی ؟"— سرجی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور ہنس پڑا —

" قطعی یہی بات ہے "— وہ ہنستے ہوئے اس کے گلے سے لپٹ گئی "سرجی ہم مونا لیزا کی مسکراہٹ ہیں ۔ ہم رینو آئر کی پینٹنگ ہیں ۔"

سرجی نے اسے اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا ــــــ " اتنی خوشی سنبھال سکو گی ؟

ــــــ کیوں بی بی ؟ ؟ " ــــــ

" سرجی ایک بات بتاؤ ۔ اپنے ایمان سے ــــــ تمہاری اتنی محبوبائیں ہیں ۔ ہے کوئی ہم جیسی ؟ " اس نے چیلنج کیا ۔

" ارے نہیں بی بی ــــــ تمہاری برابری کوئی کر سکتا ہے بھلا ؟ " ــــــ سرجی نے فوراً ہار مان لی ۔

" ایک بات اور بتاؤ سرجی ــــــ سچ سچ ــــــ کبھی کسی نے تم کو اتنا چاہا کہ وہ پریشان ہو ہو جائے ۔ بس جیسے اس کی زندگی درہم برہم ہو کر رہ جائے ۔ جبکہ وہ آدمی بہت ــــــ بہت زیادہ سمجھدار بھی ہو ۔ "

سرجی نے فکر مندی سے سر کھجایا ۔ " نہیں بی بی ہم سے کبھی کسی نے ایسا پیار نہیں کیا ۔ "

" ارون ، اب کبھی جو تم دوبارہ عشق کرو تو کسی ہم جیسی لڑکی سے کرنا ۔ " اس نے اپنی گردن پر انگلی رکھ کر 'ہم' پر زور دیتے ہوئے کہا ۔ " پھر تم بہت خوش رہو گے ۔ اور اب ایک بہت ہی پیارے بھائی کی طرح ہمارے بلاوز کے بٹن بند کر دو ۔ یہ ہمارا ہاتھ پیچھے نہیں پہنچتا ۔ "

ارون نے خاموشی سے اس کے بلاؤز کے بٹن بند کر دیے ۔

وہ میرے قریب آئی ۔ " ارجن ہم بہت حسین ہیں یعنی ہم یہاں بھی حسین ہیں ۔ " اس نے اپنے سر پر انگلی رکھ کر کہا ۔

" اور ہم میں بہت زندگی ہے ۔ ہم DYNAMIC ہیں ــــــ ایک دم DYNAMIC اور جہاں ہم ہوں ۔ وہ جگہ جگمگا اٹھتی ہے ــــــ ہے نا ارجن ! "

" ہاں بی بی " ــــــ میں نے پائپ پیتے ہوئے کہا ۔

" ارے بی بی ۔ تم جہاں سے گزر جاؤ ۔ وہ رستہ جگمگا اٹھتا ہے " ــــــ سرجی نے ہنستے ہوئے کہا ۔

"اور ارجن، وہ بہت اچھا ہے۔ وہ بہت حسین ہے۔ اور بہت نفیس ہے۔ اور وہ بہت اداس رہتا ہے۔ لیکن جب وہ مسکراتا ہے تو اس کا چہرہ جگمگا اٹھتا ہے۔ تب وہ اور بھی اچھا لگتا ہے ـــــ اور بھی حسین ـــــ اس کو ذرا سا اور ہنسنا چاہیئے۔" اس نے فکرمندی سے کہا۔

"ہاں اس کو یقیناً بہت خوش رہنا چاہیئے۔ وہ بہت اچھا ہے نا؟ ـــــ اور اچھے لوگوں کو بہت سی خوشی ملنی چاہیئے۔ ارجن ـــــ دنیا میں اتنے اچھے لوگ ہیں ـــــ اس کی تو مجھے خبر ہی نہ تھی ـــــ" ـــــ اس کی آواز میں بہت حیرت تھی۔

"یعنی وہ ایک دم ایلفا ایلفا قسم کا آدمی ہے" ـــــ یہ بہت بڑا خراج تحسین تھا جو اس نے تمہیں ادا کیا۔

"ارجن ہم اتنی باتیں کرتے ہیں۔ اتنی بے تحاشا باتیں ـــــ اس سے باتیں کرنا اتنا آسان ہے کہ میں بتا نہیں سکتی۔ اور اس کے ساتھ خاموش بیٹھے رہنا بھی بہت آسان ہے۔ یعنی باتیں نہ کرتے ہوئے بھی یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ہم باتیں کر رہے ہیں۔ ارجن، اس نے زندگی بھر کبھی کسی سے اتنی باتیں نہیں کیں۔ دراصل وہ تو بہت خاموش سا آدمی ہے ـــــ"
پھر اس نے اپنی باہیں میرے گلے میں ڈال دیں ـــــ "ارجن جب تم عشق کرو گے نا، تو کسی ہم جیسی لڑکی سے کرنا۔ پھر تم بھی بہت سی باتیں کیا کرو گے"۔

"اچھا بی بی۔"

جب وہ چلی گئی۔ تو اردن جو دریچے میں سے باہر جھانک رہا تھا۔ پلٹ کر غصے سے دانت بھینچ کر بولا "تم لوگ اسے خوب بگاڑ رہے ہو۔ جی بھر کے ـــــ جو کمی اس احمق ہسٹورین نے چھوڑی ہے۔ وہ تم پوری کر رہے ہو۔ تم کو کیا ہو گیا ہے؟" ـــــ اس نے سرجی کو غصے سے گھورا ـــــ "اور ارجن ـــــ تم بھی ـــــ" اس کے لہجے میں بڑی شکایت تھی جیسے وہ بروٹس سے مخاطب ہو۔

"ارون۔ میرے بھائی ـــــ" سرجی نے نرمی سے کہا۔ "اسے تنہا چھوڑ دو۔ یہ جو تم اس کی زندگی کے بارے میں اس قدر پریشان رہتے ہو اور منصوبہ بندی کی کوشش کرتے ہو، تو بند کرو اس خرافات کو ـــــ یہ تم کوئی اس پر احسان نہیں کر رہے۔ اور اس کے لئے وہ تمہاری کبھی ممنون بھی نہ ہو گی۔"

"تاکہ اسے دُکھ پہنچے" ـــــ ارون نے خفگی سے کہا۔

"یہ دکھ دکھ کی رٹ کیا لگا رکھی ہے تم نے ارون؟ ـــــ کیونکہ یہ دنیا صرف حسین ہی نہیں، اس میں بہت دکھ بھی ہیں ـــــ کیونکہ زندگی کی مسکراہٹوں کے پیچھے ایک بہت بڑا المیہ چھپا ہوا ہے ـــــ کیونکہ دنیا ہمارے خوابوں کو قدموں تلے روند ڈالتی ہے ـــــ اس لئے ہمیں چاہیئے کہ ہم پہلے ہی اس کو ان خوابوں کی قدر و قیمت بتا دیں ـــــ بلکہ تمہارے حسابوں تو ہمیں یہ چاہیئے کہ ہم اس کو خواب دیکھنے بھی نہ دیں ـــــ کیا خوب منطق ہے بھائی ـــــ اور تم یہ کیوں سمجھتے ہو کہ صرف تمہیں اس کو چاہتے ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ میں اور ارجن اسے نہیں چاہتے؟ اس کو اپنے خواب دیکھنے دو ارون ـــــ اس دنیا میں جتنی بھی خوبصورتی اور جتنی بھی بدصورتی ہے، اسے خود ہی اس کی تلاش کرنے دو ـــــ ابھی اس نے زندگی کا حسن پایا ہے۔ کسی روز وہ اس کے حزن اور اس کے المیہ کو بھی پا جائے گی ـــــ لیکن اپنے وقت پہ ارون ـــــ زندگی کی رفتار کو تیز مت کرو میرے بھائی ـــــ ابھی سے اسے یہ نہ بتاؤ۔ کہ یہ دنیا بہت اداس بھی ہے ـــــ یہاں بہت دکھ بھی ہیں ـــــ یہاں دل ٹوٹ بھی جاتے ہیں" ـــــ سرجی پنجرے میں بند شیر کی طرح سٹوڈیو میں گھوم رہا تھا۔ بہت دن کے بعد میں نے اسے اس موڈ میں دیکھا تھا۔ "اسے تنہا چھوڑ دو ارون بالکل تنہا ـــــ"

"آج کل تو تم ہمیں لفٹ ہی نہیں دیتیں نند تیا" ـــــ ایک روز ارون نے اس کے قریب جا کر بڑے درد سے کہا۔

"ہاں اردن ـــــ مجھے خود بھی یہ خیال آیا ہے ـــــ شاید یہ عشق کچھ چیز ہی ایسی ہے۔ لیکن نہیں، شاید یہ غلط بات ہے کیونکہ تم لوگ تو جب بہت دل توڑ دینے والا عشق کرتے ہو، تب بھی مجھے نظر انداز نہیں کرتے ـــــ پر کیا بتائیں بھائی، وقت ہی نہیں ملتا"ـــــ

"کیا تم اس فانوس کو چھونا پسند کرو گی! ـــــ" اردن نے اسے اُٹھا کر چھت کی طرف اشارہ کیا۔

"اوں ـــــ فانوس! ـــــ" اس نے ناک چڑھائی: "تم کس قدر بچے ہو اردن میں تو آج کل چاند تاروں کو چھو رہی ہوں ـــــ چاند تاروں کو ـــــ اور ایک بات بتاؤ اردن ـــــ جب تم نے عشق کیا تھا تو کیا ایسا ہوا تھا کہ ہر رات تم اپنی محبوبہ کے بارے میں سوچتے سوچتے سو جاؤ اور صبح کو اٹھتے ہی سب سے پہلا خیال ـــــ سب سے پہلی یاد اس کی آئے ـــــ بس یوں سمجھو جیسے ہر وقت کوئی آنکھوں میں لہرا تا رہے ـــــ کیا تم نے بھی ایسا ہی عشق کیا تھا؟ ـــــ کیوں یار ٹسٹر؟ ـــــ" اردن نے ایک آہ بھری اور اُسے نیچے اتار دیا۔

پھر اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر آویزے پہننے کی کوشش کی ـــــ "میں کیسی لگ رہی ہوں اردن؟"

"بہت اچھی بی بی ـــــ"

"اوں ہوں ـــــ اچھا کچھ ایسا مناسب لفظ نہیں ـــــ دراصل ابھی تک کوئی ایسا لفظ تخلیق ہی نہیں ہوا جو یہ بتا سکے کہ دراصل میں کیسی ہوں۔"

ہاں وہ ہر وقت تمہاری کہی ہوئی باتیں دہراتی ـــــ یہ باتیں وہ یوں کرتی جیسے یہ اس کی اپنی دریافت ہوں۔ اور پھر ہم سے ان کی تائید چاہتی۔ وہ چلتی بھی یوں جیسے ہوا میں تیر رہی ہو۔ وہ ہنستی ہوئی سو جاتی اور ہنستی ہوئی اٹھتی ـــــ وہ سوتے میں بھی مسکراتی رہتی

وہ جو بہت دیر سے اٹھنے کی عادی تھی، صبح بہت جلد اُٹھ بیٹھتی ــــ ہا ــــ ایک اور خوبصورت دن طلوع ہوا ــــ آج ہم کیا کریں گے؟ ــــ اور وہ پلنگ پر پیر لٹکا کر بیٹھ جاتی ــــ اس سوال کی مخاطب وہ خود ہوتی۔

"سرجی" ــــ ایک روز اس نے کہا۔"میں سال ہا سال سے ہر سال اس موسم میں پیرس آتی ہوں اور وہ بھی ہر سال کانفرنس میں آتا ہے، لیکن کیسی عجیب بات ہے کہ ہم پہلے کبھی نہیں ملے ــــ اور سنو پچھلے سال میں روم گئی تھی نا اگست میں ــــ تو وہ بھی وہیں تھا۔ لیکن ہم نہیں ملے ــــ" اس کے چہرے پر بڑی حیرت تھی۔ جیسے زندگی کو ہرگز ہرگز یہ حق نہیں پہونچتا تھا کہ وہ اتنے عرصے تک تم دونوں کو ملنے نہ دے۔

ایک روز صبح ہی صبح وہ ہنستے ہوئے اٹھی اور اس نے خوب غل مچایا۔ آکسفورڈ کے بارے میں جتنی کتابیں ہیں سب مجھے دیدو اور سب تصویریں بھی ــــ آج ہم تصویروں کو دیکھیں گے اور کتابیں پڑھیں گے ــــ یہ کیسی عجیب بات ہے سرجی کہ یہ شخص دنیا بھر میں گھوما ہے۔ اس نے اتنی دور دراز کی جگہیں دیکھی ہیں لیکن اگر نہیں دیکھا تو آکسفورڈ ــــ ہاں اسے تم سے یہ شکایت تھی۔

کیسی عجیب بات ہے ارجن کہ جب کسی سے عشق ہوتا ہے تو جی چاہتا ہے اس کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دو ــــ یعنی صرف اپنے ہی بارے میں نہیں، اپنے پیاروں کے بارے میں بھی ــــ ایک ایک بات ــــ ہم کیسے بڑے ہوئے ــــ ہم نے کہاں کہاں پڑھا ــــ ہم اب تک کیسے رہے ــــ ہم نے اب تک کیا کیا ــــ ہم کہاں کہاں گھومے ــــ اور ہم نے کیا کیا سوچا ــــ

ہاں وہ بہت خوش رہتی۔ وہ اس قسم کی خوشی تھی جس سے سرجی کا سٹوڈیو بھی مہکا رہتا ــــ چپکے چپکے مسکراتا رہتا جیسے اس نے اپنی مسرتیں فضا میں بکھیر دی ہوں ــــ ہاں شاید محبت کبھی محدود نہیں رہ سکتی۔ وہ تو جیسے سارے ماحول میں بکھر بکھر جاتی ہے ــــ

پھر ایک روز وہ میرے قریب آکر کشن پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔

"ارجن" —— اس نے کہا —— "دنیا بھر کے لوگ آپ کو چاہیں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرا مطلب ہے انسان خوش ہوتا ہے۔ اس کی انا کی تسکین ہوتی ہے لیکن وہ دراصل خوش نہیں ہوتا —— یعنی سچ مچ نہیں —— خوش تو ہم جب ہوتے ہیں جب ہم بھی کسی کو چاہیں —— پھر جب کوئی کہتا ہے، تمہاری آنکھیں ستاروں کی طرح جگمگاتی ہیں اور تمہارے بالوں کا آبشار یوں بکھر بکھر جاتا ہے —— تو دنیا بہت حسین ہو جاتی ہے —— اور کیا ہوتا ہے سرجی کہ ہم اتنے بہت سے لوگوں کے ساتھ رقص کرتے ہیں۔ لیکن پھر کوئی فرد ایسا آتا ہے جس کے بازوؤں میں رقص کرتے ہوئے ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ ہماری جگہ ہے —— ہماری اپنی جگہ —— اتنی بڑی —— اتنی وسیع و عریض دنیا میں یہ ہمارا مقام ہے۔ اور ہماری منزل ——"

"ارون ہماری جلد دیکھو ——" اس نے اپنے بازو ارون کی طرف پھیلائے —— "دیکھو یہ کتنی براؤن ہے۔ دنیا بھر کی سن بیدنگ بھی کسی سفید جلد کو اتنا براؤن نہیں کر سکتی —— براؤن جلد بہت خوبصورت ہوتی ہے —— ہے نا؟"

پھر ایک روز وہ دوڑتی ہوئی میرے پاس آئی۔ اور اس نے کہا —— "ارجن —— دیکھو ہمارے پاس کیا ہے —— اس نے ہمیں یہ بریسلٹ دیا ہے۔ یہ اس نے دہی آنا سے منگوایا ہے۔ خاص ہمارے لئے" —— پھر وہ فکر مند ہو گئی —— "ارجن میں بھی اس کو کوئی تحفہ دینا چاہتی ہوں۔ کوئی بہت اچھی سی چیز ——"

یہ بڑی عجیب سی بات تھی —— نندتیا بھی کسی کو تحفہ دینا چاہتی تھی۔ کمال ہے بھئی —— وہ تو تحفے وصول بھی یوں کرتی جیسے کسی پہ احسان کر رہی ہو۔

"شاید اُسے سچ مچ عشق ہو گیا ہے" سرجی نے فکر مندی سے سر ہلایا۔ اور پینٹ کرنے میں مشغول ہو گیا۔

ہاں اُسے عشق ہو گیا تھا —— بقول اس کے —— بالآخر ——

پھر وہ شام آئی ۔ وہ اداس غمگین شام ــــــ وہ ضدی بچوں کی طرح منہ تھتھائے بیٹھی رہی رات کو اس نے کہا" ارجن مجھے ڈر لگ رہا ہے ۔ کیا میں تمہارے پاس آجاؤں ؟" ــــــ اور وہ میرے پاس آکر لیٹ گئی ــــــ یہ اس کی بہت پرانی عادت تھی ۔ جب بھی اسے ڈر لگتا وہ ہم میں سے کسی کے گلے سے لگ کر سو جاتی ۔ لیکن اس رات وہ سوئی نہیں ۔ رات بھر وہ روتی رہی اور دن اس کے لیئے بار لیکس لایا ۔ اور اس نے کہا" میرے پیارے بھائی کیوں نہیں تم مجھ کو ایک لیکچر پلاتے "میں نہ کہتا تھا" کی قسم کا کوئی لیکچر مصیبت یہ ہے کہ تم ہمیشہ سچ کہتے ہو ۔ تم سب لوگ مجھ سے زیادہ ــــــ بہت زیادہ عقلمند ہو ــــــ میں کیا ہوں ــــــ صرف ایک احمق سی لڑکی" ــــــ وہ ضدی بچوں کی طرح پیر پٹختی رہی ۔

" کیا تم برانڈی پیو گی ؟ ــــــ اس سے تمہیں نیند آجائے گی " ــــــ سرجی نے پیار سے کہا ۔

" نہیں سرجی ۔ تم مجھے صرف یہ بتا دو ۔ کہ کام کیوں اتنا اہم ہے ؟ "

" تم جیسی لڑکیوں کے لیئے ــــــ جب تک دنیا میں تم جیسی لڑکیاں موجود ہیں ۔ ہم جیسے احمق مرد کام کرتے رہیں گے ۔" ــــــ سرجی نے گویا قطعی فیصلہ دے دیا ۔

ہاں وہ رات بھر میرے گلے سے لپٹی روتی رہی ۔ اور اس نے کہا ــــــ" ارجن ، کیوں انسان اتنے دکھ سہتا ہے ــــــ "

میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا ۔

اور پھر چند ہفتوں کے بعد ہم یہاں آئے ــــــ اور اب جیسے اس نے زندگی سے سمجھوتا کر لیا تھا ۔ اپنے حسابوں مکمل سمجھوتا ۔ اب جیسے اس نے یہ طے کر لیا تھا کہ زندگی سے کچھ چاہنا بیکار ہے ــــــ خواہشیں بیکار ہیں ۔ اور آرزوئیں بیکار ہیں ــــــ جیسے سارے خواب بکھر کر رہ جائیں ــــــ زندگی پہ جو مان ہو وہ ٹوٹ جائے ــــــ سوال بے معنی ہو کر رہ جائیں ــــــ اور جواب جاننے کی کوئی خواہش دل میں باقی نہ رہ جائے ــــــ سمجھنے کی کوشش

بیکار ہے ـــــ اور جاننے کی خواہش بے معنی ـــــ انسان بالآخر تنہا ہے !

دریا کا پانی اسی طرح گمبھیرتا سے بہے چلا جا رہا ہے اور آندرے نے سر اٹھا کر کہا ـــ گیگن میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں۔ کیوں اس نے مجھ سے انصاف نہیں کیا؟"

کون کس سے انصاف کر سکا ہے ! ہر پروفیسر ـــــ ہم سب اپنی اپنی ذات کے زنداں میں قید ہیں ـــــ ہم سب ـــــ ایکو ایک ـــــ اور ایک بات کہوں ـــــ یہ بات میں اس کا بھائی ہونے کے ناطے نہیں کہہ رہا۔ یہ ویسی بات نہیں جو اردن نے کی ـــــ کیا تم اپنے آپ سے خوفزدہ نہیں تھے؟ پندرہ برس سے یا بیس برس سے زندگی کے دروازے تم نے اپنے اوپر بند کر رکھے تھے ـــــ تم نے کوئی دکھ سہا اور اس کے بعد ایک قلعہ اپنے اردگرد تعمیر کر لیا ـــــ یہ تمہارا کام تھا جس میں صرف چین ہی چین تھا کام جس میں سکھ ہی سکھ تھا۔ جس میں دکھ نہیں تھے ـــــ پھر ایک فرد آیا اور اس نے تمہارے دل کے دروازے پر دستک دی اور تم نے بے خبری میں دریچہ ذرا سا وا کیا۔ یہ بہار کا پہلا جھونکا تھا۔ صبح کی پہلی کرن تھی۔ یہ کتنی بڑی مسرت تھی جو انجانے میں تمہیں ملی ـــــ حیرت سے تم نے اپنی آنکھیں ملیں اور بہت خوش ہوئے اور ایسا کرتے میں تم اپنے دریچے کی صلیبوں کو بھول گئے ـــــ لیکن تمہارے قلعے کی فصیل میں شگاف پڑنے لگے۔ اور پھر بے خبری ہی میں تم خوفزدہ ہوئے ـــــ اور ایک اور لمحہ آیا ـــــ اور یہ دکھ بھرا لمحہ تھا۔ جس میں تم ایک دوسرے کو سمجھ نہیں سکے ـــــ تم دونوں کے دریچے کی صلیبیں راہ میں حائل ہوئیں۔ اس میں کس کی خطا ہے۔ اردن کہے گا۔ تمہاری ـــــ تم نے اسے نہیں سمجھا ـــــ تم یہ نہیں جان سکے کہ اس کے لئے اس ایک لمحہ کا پیار کتنا اہم تھا۔ سرجی کہے گا۔ اس کی ـــــ اس نے ایک مرد کے کام کی اہمیت کو نہیں سمجھا ـــــ کام جو عقلمند مرد خوبصورت لڑکیوں کے لئے کرتے ہیں۔ میں کہوں گا۔ شاید کسی کی بھی نہیں ـــــ نہ تمہاری ـــــ نہ اس کی ـــــ نہ اس لمحہ کی ـــــ یہ ٹریجڈی تو شاید انسان کی ذات کی ہے۔

میں نے اپنا پائپ سنبھالا ــــ چلو ہم سرجی اور اروِن کو تلاش کریں۔ پھر ہم سب کہیں کھانا کھائیں گے ــــ اور تم بہت اچھے آدمی ہو ــــ اور مجھے بہت افسوس ہے۔ دریا اسی طرح بہے چلا جا رہا ہے ــــ صدیوں سے ــــ ماڈلین ٹاور اسی طرح اپنی جگہ پر ہے ــــ پندرہویں صدی سے ــــ یہاں پہلی مئی کو گیت گا کر طالب علم موسمِ بہار کو خوش آمدید کہتے ہیں ــــ لیکن دنیا کتنی بڑی ہے ــــ کس قدر بے تحاشا بڑی ــــ اور انسان کے اندر کتنی تنہائی ہے ــــ ازلی و ابدی تنہائی!

منزلیں دار کی

" باہر بارش ہو رہی ہے "۔۔۔۔ لامنٹ نے آہستہ سے کہا۔۔۔ وہ ہمیشہ سے اسی طرح آہستگی اور ملائمت سے بات کرنے کا عادی تھا۔

"ہاں۔ لیکن یہاں تو ہمیشہ ہی بارش ہوتی رہتی ہے۔"۔۔۔ میں نے افسردگی سے جواب دیا۔" اور موسم خزاں میں یہ بارش ذرا زیادہ ہی ہوتی ہے لیکن موسم خزاں مجھے ہمیشہ سے پسند رہا ہے۔ اس موسم میں ہم گرانسٹ چرچ میڈو میں گھومنے جایا کرتے تھے ہمارے قدموں تلے خزاں رسیدہ پتوں کا فرش بچھا رہتا تھا۔"

"لیکن تم موسم بہار کو بھول گئیں جب بلیو بیلز کا قالین سا بچھ جاتا تھا اور ہم لوگ ٹراؤٹ ان (TROUTINN) سے اُٹھ کر اس نیلے مخملیں قالین کے قریب اپنے سائیڈر کے گلاس لے کر نیم دراز ہو جایا کرتے تھے۔ اور واپس تمہارے کمرے میں پہنچ کر ہم وہ ریکارڈ بجایا کرتے تھے۔ کیا نام تھا اس کا۔۔۔؟ ہاں۔ وِوالی کا فور سیزنز۔"

"تم ان باتوں کو کیوں اتنا یاد کرتے ہو؟"

"اس لئے کہ میرے پاس صرف یادیں ہی رہ گئی ہیں، وہ بھی ماضی بعید کی۔۔۔ کیا زندگی تھی۔

— لیکچر سنے۔ ٹیوٹوریل کے لئے چلے گئے — شام کو کیمسٹری کی لیب میں گھس گئے، تجربہ سیٹ کیا، پھر تمہارے ہاں کوئین الزبیتھ ہاؤس چلے آئے — کروکے کھیلا۔ کافی پی — واپس لیب پہنچے۔ تجربہ کی فائنڈنگز نوٹ کیں اور واپس نیو کالج — گاؤن پہنا اور کھانے کے کمرے کی طرف چلے گئے — واپس کمرے میں آئے اور کتابیں لے کر بیٹھ گئے اور جب میرا گریجویشن کا تیسرا سال تھا اور امتحان ہونے والا تھا، یہاں لیکچر بلڈنگ کے بالکل سامنے والے باغ میں ڈرامہ کی ریہرسل جاری تھی۔ بڑا غل مچتا۔ تب میں دعائیں مانگتا کہ اتنی بارش ہو کہ ریہرسل نہ ہو سکے۔ اور تمہیں میرا چوتھا سال یاد ہے جب مجھے تھیسس داخل کرنا تھا؟ تب اگر اینڈریو نہ ہوتا تو میں برباد ہی ہو گیا ہوتا۔ آخری ہفتے میں وہی تھا جس نے میرے الجھے ہوئے کاغذ سنبھالے اور نہ جانے کس طرح میں وہ تھیسس وقت پر داخل کر سکا۔ ہاں اینڈریو کا کیا حال ہے؟"

"اینڈریو —؟ اینڈریو ٹھیک ہے۔ صرف سرطان اسے آہستہ آہستہ کھائے چلا جا رہا ہے میں آج بھی اس کے کمرے میں اسے دیکھنے گئی تھی، لیکن اُسے مارفیا لگایا جا چکا تھا۔"

اینڈریو جس نے کبھی سگرٹ کو ہاتھ تک نہیں لگایا تو پھر اُسے پھیپھڑوں کا سرطان کیوں ہوا؟ اور میں جس نے چمنی کی طرح سگریٹ پیئے۔ بالکل ٹھیک ہوں۔ بے چارہ اینڈریو — زندگی سے اس کے کتنے کم مطالبات تھے۔"

"نینا۔ کیا تمہاری سٹڈی میں سے بھی اولڈ سٹی وال نظر آتی ہے؟"

"ہاں لامنٹ تم بھول گئے۔ ہم اس کمرے میں ایک دفعہ ساتھ آئے تھے۔ تب یہ کمرہ کرسٹوفر کا تھا — اس نے ہمیں شیری پر بلایا تھا۔"

"ہاں مجھے یاد آیا۔ اس کے ساتھ خواب گاہ ہے اور اس کے ساتھ غسل خانہ۔"

"ہاں، تمہاری یادداشت بہت اچھی ہے۔"

"لیکن بہت سی باتیں ہیں نینا، جنہیں میں بھول جانا چاہتا ہوں۔ تم نے مجھ سے کبھی یہ

نہیں پوچھا کہ میری آنکھوں کی بینائی کیسے گئی۔" اس نے اپنے گہرے رنگ کے شیشوں والی عینک کو چھوا اور۔ "تمہیں معلوم ہے نا کہ میری دونوں آنکھیں کھو گئی ہیں ـــــ لیکن شاید آنکھوں کے کھونے سے پہلے ہی میں بہت کچھ کھو چکا تھا، شاید اسی لئے میں ماضی بعید کو یاد رکھنا چاہتا ہوں اور ماضی قریب کو بھول جانا چاہتا ہوں۔ میں نے آکسفرڈ میں سات سال گزارے۔ چار سال میں میں نے گریجویشن کی اور تین سال میں نے ریسرچ کی اور پھر میں برما واپس چلا گیا۔ لیکن میں رنگون یونیورسٹی میں دو سال سے زیادہ نہ رک سکا۔ میری نوکری جاتی رہی، لیکن مجھے اس کا اتنا غم نہیں ہوا اصل غم مجھے اس وقت پہنچا جب میرے باپ کو، جو چیف سیکرٹری تھا، میری وجہ سے وقت سے پہلے ریٹائر کر دیا گیا۔ ہم اصولوں کی بات کرتے تھے اور معاشرے کی بات کرتے تھے، یہ عالم شباب کی ARROGANCE تھی، ہم سمجھتے تھے کہ بس ہم یونیورسٹی سے ایک دفعہ فارغ ہو جائیں۔ پھر ہم برس دو برس میں دنیا کو بدل کر رکھ سکتے ہیں، شباب کتنا پُر امید ہوتا ہے ـــــ لیکن جب ہماری وجہ سے ہمارے پیاروں کو دکھ پہنچتا ہے تو ہمارے خواب کس طرح خاک میں مل جاتے ہیں۔ ہے نا ـــــ؟ مصیبت یہ ہے کہ سفید اور سیاہ کوئی واضح رنگ نہیں ہیں، یہ ملگجے ہیں دنیا میں شیڈز آف گرے ہیں ان میں کوئی سچ تلاش کرے تو میں جانوں اور میری انا کو کہاں کہاں سے ٹھوکر لگی ۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں۔ میں اپنے بڑے بھائی کے گھر میں تھا اور اس کی بیوی رتنا نے مجھ سے کہا، "منٹ تم جلدی سے کھانا کھا لو۔ پھر مہمان آجائیں گے" ـــــ اور میں نے اپنے کپڑوں کو دیکھا۔ میری پتلون کتنی بوسیدہ لگ رہی تھی۔ میری قمیض میلی تھی۔ اس کے کف بالکل گھسے ہوئے تھے اور میرا کوٹ بھی بہت پرانا تھا ـــــ اور میں نے سوچا، میں بھی کتنا احمق ہوں ریسپشن میں شامل ہونے کی اُمید لئے بیٹھا تھا ـــــ بھلا میں کیسے اتنی اونچی سوسائٹی میں گھوم سکتا ہوں۔ وہاں لوگ سوٹ میں ملبوس آئیں گے۔ خواتین نے قوس وقزاح کے رنگوں کے لباس پہنے ہوں گے اور ان کے کانوں میں ہیرے جگمگا رہے ہوں گے ـــــ ایسے میں رتنا مجھے کیسے وہاں موجود دیکھ سکے گی۔ تب میں نے رتنا سے کہا۔ "رتنا میں کچن میں بھی کھانا کھا سکتا

ہوں۔" اور یہ کہہ کر کچن میں چلا گیا۔ رتنا نے فاتحانہ مسکراہٹ سے میرے بھائی کو دیکھا۔ اور ایک گلدان لاکر طویل میز کے بیچوں بیچ رکھ دیا۔ لیکن میں بھی کتنا احمق ہوں۔ تمہیں بھلا ان باتوں سے کیا دلچسپی ہوگی۔"

"نہیں تم کہو۔ میں سن رہی ہوں۔"

"تمہیں نیو کالج میں رہنے کا بہت شوق تھا نا۔ کس طرح تم ہر وقت ہم سب سے لڑتی تھیں۔ یہاں لڑکیوں کو بھی داخلہ دلوا دو نا —— تم یہاں انڈر گریجویٹ تو نہ ہو سکیں، لیکن فیلو بن کر آنا مبارک ہو نینا۔"

"ہاں لیکن اس دوران تو بہت کچھ ہوگیا میں نے زندگی میں بہت دفعہ فصل گل کا ماتم کیا۔ لا منٹ —— مجھے تو اب شمار بھی یاد نہیں —— جبر کا چہرہ کتنا خوفناک ہے۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے —— اس چہرے کا رنگ خواہ سفید ہو۔ یا سرخ ۔ یا زرد ۔ اور یا گندمی۔ شاید سب سے بھیانک رنگ گندمی ہے۔ ان سب پہ خدا کی لعنت —— میں نے تیرہ سال سنگین سلاخوں اور آہنی دروازوں کے پیچھے گزارے۔ باہر جیپ آکر رکی تھی۔ تو رات کے ڈھائی بجے تھے "کیا میں چند کپڑے اور ضرورت کی باقی چیزیں رکھ لوں" —— میں نے پوچھا "ہم صرف پندرہ منٹ دے سکتے ہیں۔" جواب ملا۔ میں نے جلدی جلدی چیزیں رکھنا شروع کیں۔ اور میرے بھائی عامر نے میری مدد کی "تمہارے پاس صرف دو منٹ باقی ہیں۔" مجھے اطلاع دی گئی۔ اس شور و غل سے نسرین کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ ہماری چھوٹی سی ملازمہ تھی اور اس کی عمر صرف گیارہ سال تھی "آپ کہیں جا رہی ہیں بی بی؟" —— "ہاں —— "میں بھی چلوں گی!" مگر پیشتر اس کے کہ میں کچھ کہوں، میرے دوسرے بھائی عمر نے اسے ڈانٹا۔ نسرین کو تو کبھی کسی نے کچھ نہیں کہا تھا ۔ میں نے حیرت سے سوچا ۔ اور عمر میں تو بلا کا تحمل تھا ۔ عامر نے میرا چھوٹا سا اٹیچی کیس سنبھالا اور ہم دونوں باہر نکلے ۔ نسرین ہاتھ میں کچھ چیزیں لئے دوڑتی ہوئی میرے پیچھے پیچھے آئی ۔ "بی بی آپ اپنا ہیر ڈرائیر بھول گئیں ۔ اور اپنے چاندی کے برش بھی ——"

میں نے پیار سے نسرین کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ میں نے اسے کیسے سمجھائی کہ جہاں میں جا رہی تھی۔ وہاں ان چیزوں کی ضرورت نہیں تھی۔ ہاں یہ چاندی کے برتن مجھے بہت پیارے تھے۔ یہ ایک دوست کا تحفہ تھے نا۔"

"نینا تمہارے پاس موتیوں کا ایک ہار تھا، جو تمہاری مرحوم دادی کی نشانی تھا" لامنٹ نے ماضی کو کریدا۔ ـــــ

"جب آندھیاں چلتی ہیں لامنٹ۔ تو سب نشانیاں مٹ جاتی ہیں۔ وہ سچے موتی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گئے اور میرے پاس ان کا ایک ریزہ تک بھی نہیں ـــــ جب ہم اندر جاتے ہیں نا ـــــ تو سب، قیمتی اور خطرناک چیزیں جمع کروانا پڑتی ہیں۔ اور پھر وہ کبھی واپس نہیں ملتیں۔ تم کتنا عرصہ اپنے بھائی کے پاس رہے ؟"

ـــــ "میں دو برس رہا نینا۔ اس عرصے میں کتنی بار میری عزت نفس مجروح ہوئی۔ تم اس کا خیال بھی نہیں کر سکتیں میں بالکل کاٹھ کباڑ کی طرح دو سال ایک چھوٹے سے کمرے میں پڑا رہا ـــــ رتنا اور میرا بھائی ہی نہیں، ملازم تک مجھے نظر انداز کر دیتے تھے۔ اور بعض دفعہ مجھے بہت غصہ آتا۔"

"لیکن تم تو کبھی غصہ نہیں کیا کرتے تھے۔"

"ہاں میں بیسویں صدی کا گوتم بدھ بننا چاہتا تھا۔ لیکن نینا، گوتم بدھ بننا تو بڑی بات ہے، میں تو ایک اچھا بدھسٹ بھی نہیں بن سکا۔ تمہیں یاد ہے یہاں پر جب تم لوگ پارٹیوں میں شیری کا گلاس میرے ہاتھ میں دیکھتے تو مجھے چھیڑا کرتے تھے، "کیا بدھ مت میں اس کی اجازت ہے ؟" ـــــ اور میرا ایک ہی جواب ہوتا "قطعی ہے۔ ہاں اچھا بدھسٹ وہ ہے۔ جو لالچ سے نہ پیئے۔" لیکن میں جو طالب علمی کے زمانہ میں ناوس (NOVICE) بن کر بھکشوؤں کے ساتھ رہا تھا۔ بہت لالچ سے کھانے پینے لگا۔ اگر دو دن کھانا نہ کھایا ہو تو چھری کانٹا تو بڑی چیز ہے، انسان اپنی انگلیوں کا استعمال تک بھول جاتا ہے۔ رتنا مجھے

کھانے تک سے تنگ رکھتی تھی —— لیکن میں نے اپنے بھائی سے کبھی اس کی شکایت نہیں کی اور شاید میں کرتا تو وہ سنتا بھی نہیں۔ آسودہ حالی اور غربت کا دراصل کوئی رشتہ نہیں ہوتا نینا —— جب افلاس کی آندھیاں چلتی ہیں تو خون کے رشتے بھی بہہ جاتے ہیں۔ اکثر اوقات میرے پاس سگرٹوں تک کے لئے پیسے نہ ہوتے —— میں بے قرار ہو کر کمرے میں ٹہلتا۔ ایک روز میرا ایک دوست مجھ سے ملنے کے لئے آیا۔ میری یہ مجال نہیں تھی کہ میں اپنے دوستوں کو ڈرائینگ روم میں یا ٹی وی لاؤنج میں بٹھا سکتا۔ میں تو ان سے اپنے کمرے ہی میں مل لیتا تھا جہاں صرف ایک پلنگ تھا اور ایک ٹوٹی ہوئی کرسی اور میز —— شروع شروع میں وہاں ایک بجلی کی انگیٹھی اور کیتلی بھی تھی جس پر میں چائے اور کافی بنا لیا کرتا تھا۔ لیکن پھر رتنا نے یہ کہہ کر کہ بجلی بہت خرچ ہوتی ہے، وہ چیزیں اٹھوالی تھیں۔ میرے دوست نے مجھے سگریٹ دیا۔ اور جب میں نے اس کا پہلا کش لیا۔ تو مجھے کتنی طمانیت محسوس ہوئی۔ تم اندازہ بھی نہیں کر سکتیں۔ جاتے وقت وہ اپنے سگریٹ اور ماچس بغیر کچھ کہے میز پر چھوڑ گیا —— میں سمجھ گیا کہ وہ بھولا نہیں تھا۔ اسی روز رتنا کے بیگ میں سے کچھ پیسے چوری ہو گئے سب کے ساتھ میں بھی ڈھونڈتا رہا۔ تب رتنا نے میرے بھائی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "یہی ملازم تھے۔ لیکن لامنٹ کے آنے سے پہلے کبھی چوری نہیں ہوئی تھی۔" اس نے ایک نظر مجھے دیکھا اور پھر اس کی نظر میرے ہاتھ میں تھامی ہوئی سگریٹ کی ڈبیا کی طرف اٹھ گئی اور اس نے کہا۔ "اگر تمہیں سگرٹوں کے لئے پیسوں کی ضرورت تھی۔ تو تم نے مانگ کیوں نہ لئے لامنٹ؟" ایک نیزے کی انی تھی جو میرے دل میں اتر گئی —— تو گویا میں چور ہوں۔ نینا کیا تم یقین کر سکتی ہو۔ کہ رتنا نے مجھے چور سمجھا!

"افلاس اور چوری کا بہت پرانا رشتہ ہے لامنٹ" میں نے آہستہ سے کہا۔ اب سورج ڈوب گیا تھا۔ میں نے کھڑکی کے پردے برابر کئے جنگلی گلاب کا ایک پھول ابھی تک ڈیک پر پڑا تھا۔ یہ منٹ لایا تھا۔ اسے ابھی تک جنگلی گلاب کی بیل یاد تھی جس کے قریب بیٹھ کر ہم گھنٹوں دکھ سکھ کی اور اپنے خوابوں کی باتیں کرتے تھے۔

"اور پھر نینا! میں نے اپنے بھائی کا گھر چھوڑ دیا۔ میں اپنی سب سے چھوٹی بہن کے گھر چلا

گیا اور کتنی عجیب بات ہے کہ وہاں بھی چوری ہوئی میری بہن نے ذکر نہیں کیا کہ چوری ہوئی ——
وہ صرف روتی رہی —— میں حیران و ششدر اسے دیکھتا رہا —— وہ کیوں رو رہی ہے! میری
سمجھ میں نہ آسکا۔ اور میں نے پوچھا، "تم کیوں رو رہی ہو؟" اور اس نے کہا۔ "کومنٹ کوئی خاص بات
نہیں" —— وہ میری چھوٹی بہن تھی نا۔ اور ہمیشہ سے مجھے کومنٹ کہتی چلی آئی تھی۔ اور اگلے دن
مجھے پتہ چلا، کہ اس کے پیسے چوری ہوگئے ہیں اور سونے کے بٹن بھی —— تب مجھے خیال آیا،
ریٹا نے بھی مجھے چور سمجھا، رتنا نے غالباً اس سے بات کی ہوگی۔ میرے دل کو بہت تکلیف پہنچی،
لیکن میں نے اس سے ایک لفظ اپنی صفائی میں نہیں کہا۔ یہ میری بہت پیاری بہن تھی۔ بچپن میں جب
یہ اسکول جایا کرتی تھی تو میں اس کے بال برش کر کے اُسے بھیجتا تھا۔ کیونکہ اس کے اسکول کی پرنسپل
نے شکایت کی تھی کہ اس کے بال بہت اُلجھے ہوتے اور بے ترتیب رہتے ہیں اور اس شکایت کے
آنے کے بعد پہلے دن جب میں اس کے بالوں میں برش کرنے کی کوشش کر رہا تھا اس نے بہت
غل مچایا میرے بڑے بھائی نے کہا، "ریٹا کو تنہا چھوڑ دو۔ اسے تنگ مت کرو۔" میرے باپ نے
مسکرا کر کہا، "وہ منٹ کی بھی بہن ہے۔" اور اب وہ رو رہی تھی، مجھے معلوم تھا۔ وہ کیوں رو
رہی ہے۔ اگر اُسے کسی ملازم پر شبہ ہوتا تو وہ چند ٹکوں کے لئے کبھی نہ روتی —— ملازم تبدیل کئے
جا سکتے ہیں —— میں سمجھ گیا، کہ اسے کیا خیال کھائے جا رہا ہے۔ اس کا بھائی چور ہے —— یہ خیال
اس کے لئے سوہان روح تھا۔ پھر میں نے چپ چاپ اپنے چند کپڑے اپنے بکس میں رکھے اور جنگلوں
کو نکل گیا —— لیکن مجھے کہیں چین نہ ملا۔ رہ رہ کر ایک پھانس سی تھی جو روح میں اتر جاتی تھی۔ مجھے
سب نے چور سمجھا۔"

"ہاں اگر تم نے ٹھکانے سے کوئی کام کیا ہوتا، تمہارے پاس تین چار کاریں ہوتیں، ڈھنگ کے
کپڑے ہوتے۔ اور تم ہر وقت کریون اے پی سکتے۔ تو تمہیں کوئی چور نہ سمجھتا ——"

اگر اپنے پاس کار ہو اور ہم خود پیدل چل رہے ہوں تو جہاں کہیں شناسا چہرہ کار میں بیٹھا نظر
آتا ہے تو لوگ رک کر پوچھتے ہیں کہاں جانا ہے؟ —— اور ہم کتنے اطمینان سے کہہ دیتے ہیں،

ہمیں ذرا فلاں جگہ پہنچا دو۔ لیکن اگر ہمارے پاس کار نہ ہو تو کوئی کار نہیں رکتی، ہم کسی سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہم پیدل ہی چلتے رہتے ہیں اگر جیب میں پیسے ہوں تو ہم دوستوں سے کہہ سکتے ہیں، ہمیں چائے پلاؤ۔ لیکن اگر ہمارے پاس پیسے نہ ہوں تو اگر کوئی پوچھے بھی تو جب بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمیں چائے پلاؤ بلکہ ہمیں یہ ظاہر کرنا پڑتا ہے کہ ہم بہت آسودہ ہیں، ہم نے ابھی ابھی چائے پی ہے۔

"یہ سب کچھ مجھ پہ بیتا ہے ـــــ یہ سب کچھ میں نے سہا ہے لامنٹ۔ ہم صرف مسکراہٹوں ہی کے شریک نہ تھے ـــــ ہمارے رنج والم بھی ایک سے ہیں، صرف جزئیات میں تھوڑا بہت فرق ہے ـــــ مگر ہاں، پھر تم نے جنگلوں میں کیا کیا؟"

"میں گیارہ سال برما کے جنگلوں میں رہا اور ایک دن میں اور میرا ایک ساتھی ایک قریبی گاؤں سے کھانا مانگ کر لا رہے تھے کہ ایک بارودی سرنگ پھٹ گئی۔ ایک لمحہ پہلے میرا ساتھی مسکرا رہا تھا، ہنس رہا تھا اور دوسرے لمحے اس کے جسم کے پرخچے اڑ گئے ـــــ مجھے یہی بتایا گیا تھا۔ کیونکہ میری تو آنکھیں ہی چلی گئی تھیں، ہاں میری دونوں آنکھیں کھو گئیں ـــــ ہماری نسل کتنی بدنصیب تھی، بینا، ہمیں عزت نہیں ملی، شہرت نہیں ملی ہم صرف دکھ سہتے ہیں اور دکھ کا ورثہ ہی آگے پہنچا دیتے ہیں، اگر ہم ذرا پہلے پیدا ہوتے اور کسی جنگ عظیم میں کام آتے تو کم سے کم ہمارے ناموں کی تختیاں یونیورسٹی کالج کی چیپل میں لگی ہوتیں۔ لیکن ہم سے تو کچھ بھی نہ ہو سکا۔ لیکن تم ـــــ تم نے اپنے بارے میں کچھ نہ بتایا بینا۔"

"بتانے کے لئے رہ کیا گیا ہے لامنٹ ـــــ تم نے دو برس در بدر بھٹکتے ہوئے گزارے اور پھر گیارہ سال جنگلوں میں ـــــ اور میں ـــــ میں نے تیرہ برس آہنی سلاخوں کے پیچھے گزارے۔ میں سورج کی ایک کرن کو ـــــ ہوا کے ایک جھونکے کو ـــــ اور رات کے وقت چاند کو ایک نظر دیکھنے کو ترس گئی۔ کبھی کبھار مجھے ان لوگوں پر رشک آتا جن کی وفاداریاں راتوں رات بدل جاتی ہیں ان کے جان محفوظ رہتے ہیں اور بہت کچھ محفوظ رہتا ہے۔ جب کہ ہم سب کی قسمت میں دربدر بھٹکنا لکھا تھا۔ میں نے تین تین روز بھوک برداشت کی۔ تم بھی بھوکے رہ چکے ہو۔ تم تو اس دکھ سے آشنا ہو۔ ہمیں پانی تک نہیں ملتا تھا کہ ہم اسی سے پیٹ بھر لیتے اور میرے ہاتھوں اور پیروں کے ناخنوں

پر بھیھوندی جم گئی ایک قیامت تھی جو دل پر گزرتی تھی۔ ہم اخبار، قلم، دوات، کاغذ، ہر چیز سے محروم تھے۔ لیکن جو خبریں وہ پہنچانا چاہتے تھے وہ بہت آسانی سے پہنچا دیتے تھے میری کوٹھڑی کے ساتھ اخلاقی قیدیوں کی کوٹھڑیاں تھیں ــــ دراصل وہاں اخلاقی اور سیاسی میں کوئی تمیز نہیں تھی۔ اور جب وہ مجھے لے گئے تو تین مہینے بعد عامر کا برین ہیمریج ہوگیا وہ تیرہ دن بیہوش زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہا۔ اور تیرھویں دن اپنے پیدا کرنے والے سے جاملا۔ اور تب مجھے بلایا گیا اور جب میں دفتر پہنچی تو وہاں میرا دوسرا بھائی عمر کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کاغذ تھا اور اس کی آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی تھیں ــــ وہ یقیناً غسلخانہ میں چھپ کر رویا ہوگا ــــ یہ اس کی بہت پرانی عادت تھی ــــ اس نے کاغذ میرے سامنے کیا۔ "اس پر دستخط کردو"، یہ پیرول پر رہا ہونے کی درخواست تھی۔ میں نے دستخط نہیں کئے۔ کاغذ اس کو واپس کر دیا۔ اس نے پوچھا۔ کیا تمہارا پرائڈ تمہارے رستہ میں حائل ہے۔!"

نہیں یہ پرائڈ کا سوال نہیں تھا۔ یہ اصولوں کی بات بھی نہیں تھی۔ یہ صرف اپنی ذات کے ساتھ زندہ رہنے کا سوال تھا۔

انٹرویو ختم ہوگیا۔ وہ خاموش کھڑا رہا۔ اور میں چپ چاپ واپس چلی آئی۔

میرے دل کے نہاں خانوں میں چھپا ہوا غم کون دیکھ سکتا تھا! ــــ نہیں مجھے عامر کو خاموش اور ساکت دیکھنے کی کوئی خواہش نہیں ــــ میں اس کو اسی طرح یاد رکھنا چاہتی ہوں۔ وہی اداس چہرہ ــــ اور وہی خوبصورت نرم ونازک ہاتھ ــــ جو تین مہینہ پہلے جلدی جلدی میری چیزیں سمیٹ سمیٹ کر چھوٹے سے بکس میں رکھ رہے تھے۔

عمر بھر میں نے اپنے اردگرد اداس چہرے دیکھے ہیں۔

عامر کا چہرہ اس وقت معمول سے بھی زیادہ اداس تھا۔

"تمہاری ضرورت کی کوئی چیز رہ تو نہیں گئی ؟"

"تمہاری سب چیزیں پوری ہیں"

رات بھر میں جاگتی رہی۔ اس کا خوبصورت جگمگاتا ہوا چہرہ اور روشن شربتی آنکھیں مجھے یاد آتی ہیں۔

پچھواڑے کے لان میں میت سج رہی ہو گی ۔ اس پر ڈھیروں پھول ڈالے گئے ہونگے۔ اس کے کتے سائمن کو کسی کمرے میں بند کر دیا گیا ہو گا ۔ وہ پنجوں سے دروازہ کھرید رہا ہو گا، وہ بے قرار ہو گا کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے ۔ عامر کیوں خاموش اور ساکت لیٹا ہوا ہے وہ کیوں اس کو تھپکی دے کر پیار نہیں کرتا وہ صرف ایک کتا ہی ہے نا ـــــ اس کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آ سکتیں۔

اور بوڑھے باپ نے ستر برس کی عمر میں کڑیل جوان بیٹے کی میت کو کندھا دیا ہو گا ـــــ اُسے گھر کے قریب والے قبرستان میں دفن کر دیا گیا ہو گا ۔ دادی اماں کے پہلو ـــــ وہ ان کا بہت لاڈلا پوتا تھا نا ـــــ

جب دادی اماں کا انتقال ہوا تھا اور قبر کھدی تھی تو اس نے قبر میں لیٹ کر دیکھا تھا کہ وہ آرام دہ ہے یا نہیں ـــــ اس کی قبر کے بارے میں کسی نے فکر کی یا نہیں ـــــ؟

تین دن اور تین راتیں میں جاگتی رہی ـــــ وہ روشن اداس چہرہ خاک میں مل کر خاک ہو جائے گا ۔

چوتھے دن میٹرن نے جو ادھیڑ عمر کی ایک بدصورت سی عورت تھی۔ آہستہ سے میری کوٹھڑی میں ایک اخبار رکھ دیا ـــــ چھوٹی سی خبر تھی ۔ اس کے سفرِ آخر کی ـــــ وہ کوئی سالار نہیں تھا ـــــ وہ بادشاہ وقت بھی نہیں تھا ـــــ وہ تو موقع پرست دانشور بھی نہیں تھا کہ اس کی یاد میں ٹیلیویژن سے پروگرام ہی نشر ہو جاتا ۔

نہ بگل بجا ۔ اور نہ اکیس توپوں کی سلامی دی گئی ـــــ بس شام کے دھندلکے میں چپ چاپ ان سب نے اسے لحد میں اتار دیا ـــــ اور اب وہاں وہ آسودۂ خواب ہے ۔

اس کی بھی تمام زندگی سوز و سازِ رومی اور پیچ و تاب رازی میں گزری، شاید اسے وہاں وہ ذہنی قرار مل گیا ہو جو اسے زندگی میں کبھی نہ مل سکا ۔ وہ بھی ایک بھٹکی ہوئی روح تھی ۔

اس کے کمروں کے دروازے بند کر دیئے گئے ہونگے ـــــ ان کمروں کی روشنیاں گل کر دی گئی ہونگی ـــــ وہ کمرے خاموش ہو گئے ـــــ شاید ابا نے ٹیلیفون کے محکمہ کو خط لکھ دیا ہو گا کہ اب

اس ونگ میں ٹیلیفون کی ضرورت نہیں رہی ۔

وہ تمام وقت ایئر کنڈیشنر چلائے رکھتا تھا اُسے گرمی بہت لگتی تھی نا — میں نے محسوس کرنا چاہا کہ قبر ٹھنڈی ہوگی یا نہیں ۔

اور بہت دفعہ میں نے سوچا۔ کیا میں اس کی موت کی ذمہ دار ہوں۔ کیا میں نے اتنی نروس ٹینشن (NERVOUS TENSION) پیدا کی کہ وہ اس کی تاب نہ لا سکا ۔

لیکن کیا میں خدا ہوں جسے زندگی اور موت پر اختیار ہے۔ کیا میں یسوع مسیح ہوں جس نے ساری دنیا کے گناہ اپنے ذمہ لے لئے تھے۔ اور دوسروں کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لئے وہ دار پر چڑھ گیا تھا۔

میرے پاس عامر کی کوئی تصویر تک نہیں ۔ یہاں پیٹر کی میز پر ایک تصویر ہے جس میں عامر اور وہ دونوں ہنس رہے ہیں ۔ اور اب عمر تنہا ہے، کیا میں نے ایک بھائی سے اس کا بھائی چھین لیا ؟ بازوئے برادر کٹ گیا !

اور اینڈریو کے پاس بھی ایک تصویر ہے جس میں عامر اپنے کمرے کے دریچے کے پاس ڈیسک سے لگا ہوا باہر جھانک رہا ہے ۔

اینڈریو مجھے بہت دفعہ کہہ چکا ہے نینا یہ تصویر تم لے لو۔ اینڈریو جس نے کبھی کسی کو دکھ نہیں دیا تھا۔ وہ کس جرم کی سزا بھگت رہا ہے ۔

اور ایک روز جب میں اس سے ملنے گئی تھی ، اس نے کہا تھا۔ نینا تمہیں وہ گاؤں یاد ہے نارتھ ییلچ جہاں ہم BRASS RUBBINGS کرنے جایا کرتے تھے اگر ہو سکے تو میں وہیں دفن ہونا پسند کروں گا تمہیں یاد ہے۔ TWENTY MILES AROUND OXFORD ہاتھ میں تھامے ہم لوگ گاؤں گاؤں گرجا گھروں میں گھومتے تھے اور ایک روز لیزلی ہولڈن نے کہا تھا۔ "BRASS RUBBINGS تو ہم نے بہت کر ڈالیں۔ اب ہمیں BRASS STEALING پر آجانا چاہیے۔" اور سبھی لوگ ہنس دیے تھے۔

کیسے ہم لوگ بات بے بات ہنسا کرتے تھے۔ لیکن اب ـــــ اب زندگی میں کتنی کم ہنسی ہے۔ شاید لینزلی ہنستا ہو۔ وہ امریکہ کی کسی یونیورسٹی میں پڑھا رہا ہے ہر کرسمس پر اس کا کارڈ آجاتا ہے۔ لیکن تم لامنٹ، تمہاری زندگی میں آنسو ہیں، اپنے سارے دکھ مجھے دے دو اپنے سارے آنسو مجھے دے دو۔ میں ان سب کو اپنی ساری کے آنچل میں سمیٹ لوں گی۔

اور تیرہ سال بعد مجھے اس قید تنہائی سے نجات ملی۔ میرے بھائی کا ایک دوست مجھے باہر ملا۔ میرا بھائی نہیں آیا ـــــ وہ اُب تک مجھ سے خفا تھا ـــــ اور میرے بھائی کے دوست نے ایک پاسپورٹ میرے ہاتھ میں دے دیا ـــــ وہ پاسپورٹ کیسے حاصل کیا گیا تھا مجھے نہیں معلوم ـــــ نہ میں نے پوچھا، اور نہ اس نے مجھے بتایا ـــــ وہ سیدھا مجھے ایئرپورٹ لے گیا۔ وہاں جب گاڑی کار پارک میں رو کی گئی تو میں نے بہت سی بڑی بڑی موٹریں دیکھیں ـــــ ان میں بہت سے شناسا چہرے تھے۔ میں نے پہچان لیے لیکن مجھے کسی نے نہیں پہچانا۔ ہاں ان میں کون وزیر تھا، کون سفیر، اور کون مشیر ـــــ یہ البتہ مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ وہ سب وی۔آئی۔پی لاؤنج کی طرف چلے گئے شاید کوئی بہت بڑی غیر ملکی شخصیت آرہی ہو گی ـــــ تب میں نے خود سے پوچھا ـــــ کس کس نے سمجھوتا کیا اور کون کون لوگ تاریک راہوں میں مارے گئے ـــــ کس کس نے ماں باپ اور بہن بھائیوں کا دکھ دیکھا ـــــ کس کس نے چوری کے الزام سہے اور کس کس کو بین الاقوامی انعامات و اعزازات ملے۔ کس کس نے ہار پھول پہنے اور کس کس نے درآمد برآمد کے پرمٹ لیے اور کس کس نے اشکوں کی مالا پروئی ـــــ اور تب میں نے سوچا۔ میں نے جو کچھ کتابوں میں پڑھا سب غلط تھا اور میرے ٹیوٹرز نے مجھے جو کچھ پڑھایا وہ بھی سب غلط تھا۔ تب میں نے THEORY OF THE SURVIVAL OF THE FITTEST کے بارے میں سوچا۔ اور مجھے خیال آیا۔ کہ سروائیو وہی لوگ کرتے ہیں جو چالاک ہوتے ہیں جو اسکیمیں بنا سکتے ہیں اور ڈیزائن بنا سکتے ہیں ـــــ وہی FITTEST ہوتے ہیں ـــــ یہاں جنگل کا قانون ہے۔ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے ـــــ ہم جو تھوڑا بہت احساس رکھتے تھے ہم دراصل

سرو ائیز کرنے کے لئے موزوں نہیں تھے ۔ ہمارے ساتھ جو کچھ بیتا ہم اسی کے مستحق تھے ـــــ یہی ہوتا چلا آرہا ہے اور یہی ہوتا رہے گا۔

اپنے وطن کو ایسے وقتوں میں چھوڑنا بھی دشوار ہے اور میں تو دکھ اور کرب لے کر اس سرزمین کو الوداع کہہ رہی تھی۔

اور لامنٹ ، جب میں ہوائی جہاز میں بیٹھی تو میں نے تیرہ برس میں پہلی دفعہ اتنا بہت سا کھانا دیکھا۔ میں نے کھانا شروع کیا لیکن بہت جلد مجھے غسل خانہ کی طرف بھاگنا پڑا۔ جسم وجاں اس کھانے کی تاب نہیں لا سکتے تھے ۔

اور پھر میں یہاں آگئی۔ آکسفرڈ نے مجھے پناہ دی۔ بہت سے لوگ مر چکے تھے اور بہت سے لوگ بوڑھے ہو گئے تھے۔ تمہیں نکلس یاد ہے ؟ وہ کب کا آٹھ فیٹ مٹی کے نیچے پہنچ چکا تھا۔ سر ولیم اور لیڈی پیٹر ریٹائر ہو کر آکسفرڈ کے پاس ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ ان کی بیٹی ٹیریزا کی دو بیٹیاں ہیں۔ تمہیں ٹیریزا یاد ہے ؟۔ ان کی اکلوتی بیٹی ! جو اتنی باغی تھی کہ اپنے ماں باپ کے دیے ہوئے ریسپشن میں کبھی شریک نہیں ہوتی تھی۔ اُٹھ کر لندن چلی جایا کرتی تھی۔ لیکن جو نیو کالج کے کرسمس کارڈز کے لئے پینٹنگز بنایا کرتی تھی۔

پھر روجر اوپی ملا۔ وہ کتنا سمارٹ ہوا کرتا تھا لیکن اب وہ موٹا ہو گیا تھا اور زندگی سے بہت مطمئن نظر آتا تھا میں نے پوچھا ـــــ "کیا آپ خوش ہیں مسٹر اوپی ؟"

"ہاں میں آج کل لیبر گورنمنٹ کا ایڈوائزر بھی ہوں لیکن خوش ؟ خوش ہونا کیا ہے ـــــ یہ تو اضافی سی بات ہے نینا ـــــ بس مطمئن ہونا کافی ہے اور میرے پاس اطمینان ہے ـــــ میں معاشیات پڑھاتا ہوں اور گرمیوں کی چھٹیوں میں اپنے چند ذہین طالبعلموں کو لے کر لکسمبرگ سمر کورس کے لئے چلا جاتا ہوں اور جب وہ وہاں سے امتیازی طور پر امتحان پاس کر کے میرے ساتھ لوٹتے ہیں تو میں مطمئن ہو جاتا ہوں ۔ عامر بھی تو ایک بار گیا تھا۔"

عامر کا ذکر وہ بے دھیانی میں کر گئے تھے۔ انہوں نے میرے بدلتے ہوئے رنگ کو دیکھا

اور ایک دم اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ یہاں عام طور پر پرانے دوست عامر کا ذکر میرے سامنے نہیں کرتے۔ عامر ـــــ ہاں ـــــ عامر بھی گیا تھا ـــــ شاید وہ یہیں کہیں ہو۔ اور ابھی بیریلرز سے اورنج جوس کے دو گلاس ہاتھ میں تھامے آتا نظر آئے۔

لیکن اب وہ کیا نظر آئے گا ـــــ وہ تو کب کا مٹی میں مل چکا۔ خاک خاک میں مل گئی ـــــ وہ روشن آنکھیں ـــــ ان کا کیا حشر ہوا ہو گا۔

تب مجھے وہ شخص یاد آیا، جس کو دفن کرنے کے ایک مہینہ بعد قبر سے نکالا گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کی جگہ دو گڑھے تھے اور ناک بیٹھ چکی تھی۔ اس کے بازوؤں کا گوشت ختم ہو چکا تھا صرف ہڈیاں رہ گئیں تھیں تب میں تین مہینہ بیمار رہی تھی اور پھر میں مری چلی گئی تھی۔ وہاں تین مہینہ بعد میں نے ایک کہانی لکھی۔ اور مجھے کوئی سننے والا نہ ملا، سوائے وہاں کی لائبریری کے لائبریرین کے ' ـــــ اس نے مجھے کھانا کھلایا جو اس کی بیوی نے پکا کر لائبریری بھیج دیا تھا ـــــ اور اس نے بڑے تحمل سے کہانی سنی اور آہستہ آہستہ اپنا سر ہلاتا رہا۔

لیکن یہ تو بہت پرانی بات ہے، تم تو ابھی حال کی بابت پوچھ رہے تھے۔ لامنٹ ـــــ دراصل میرے ذہن میں ماضی، حال اور مستقبل سب گڈمڈ رہتے ہیں۔

بعض دفعہ مجھے وہ جرنلسٹ یاد آجاتا ہے جس نے ایک زمانہ میں ٹیکسی چلانی شروع کر دی تھی اور اس کا انٹرویو ایک اخبار میں شائع ہوا تھا۔ اس نے کہا تھا ـــــ میں بہت خوش ہوں۔ دراصل اب تک میں نے جھک ماری تھی جرنلزم میں کیا رکھا ہے؟ ـــــ اور میں نے سوچا، اتنے عرصے سے میں نے ڈرائیونگ نہیں کی۔ اگر میں کر سکتی۔ تو کم سے کم رکشہ ہی چلانا شروع کر دیتی۔

اور پھر یہاں آن کر مجھے بہت سی پرانی اور بہت سی نئی کتابیں پڑھنا پڑیں۔ لیکن میرے ذہن میں ایک جنگ جاری تھی۔ وہ باتیں جو میں انڈر گریجویٹ ہوتے ہوئے بڑے وثوق سے کہتی تھی۔ اب وہاں شبہات پیدا ہو گئے تھے۔

جب میں اپنے طالب علموں کے ٹیوٹوریلز سنتی ہوں تو بعض دفعہ میں بہت پریشان ہو جاتی ہوں۔ اور

جب پریشانی مجھے زیادہ ہی گھیرے تو گھبرا کر اس طالب علم سے پوچھتی ہوں " کافی چلے گی یا شیری ؟"

اور تب مجھے خیال آتا ہے۔ کہ جب میرے ٹیوٹرز مجھ سے یہی سوال کرتے تھے تب وہ بھی شاید اتنے ہی پریشان ہوتے تھے۔

اور قضا و قدر اور جبر و اختیار کا مسئلہ بالکل میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اور اخلاقیات کے سارے فلسفہ کی بنیاد اسی پر ہے — تب میں ٹہلنے چلی جاتی ہوں اور واپس آکر پھر سوچنا شروع کر دیتی ہوں ۔ اور جب میں پہلے دن ڈائیننگ ہال میں ہائی ٹیبل پر بیٹھی تو میں اتنا بہت سا کھانا دیکھ کر حیران رہ گئی۔ سوپ، بیف سٹیک، پڈنگ، پنیر اور بسکٹ اور پھل اور آخر میں کافی —! خدایا اتنا کھانا لوگ کیسے کھا جاتے ہیں جب کہ تیرہ برس تک ہمیں تیسرے دن پتلی سی دال اور ایک چپاتی ملتی تھی۔ اس میں بھی دھول اور کنکر ملے رہتے تھے۔

ان تیرہ برس میں صرف ایک روشن ہفتہ ہے جب مجھے ہسپتال پہنچایا گیا وہاں میں اکیلی ایک کمرے میں تھی — یہ نہیں کہ مجھے اے کلاس مل گئی تھی — یہ تو صرف میری روح کو کچلنے کی ایک اور کوشش تھی۔

تب مجھے ریڈکلف انفرمری بہت یاد آئی جہاں میں ایک دفعہ بیمار ہو کر پہنچی تھی۔ وہ جنرل وارڈ تھا اور صبح ہی صبح دو بوڑھے مریض میل وارڈ سے چائے کی ٹرالی دھکیلتے ہوئے آتے اور ایک شریر بوڑھا مجھے چائے کی پیالی دیتے ہوئے کہتا — "پیاری لڑکی تمہارے لئے ایک پیالی چائے اور بھی ہے۔" — اور میں ہنس دیتی — اس طرح کی چیٹنگ ہمیشہ روا رہی ہے۔

ہاں میو ہسپتال کے اس کمرے میں تنہا لیٹے ہوئے مجھے بہت سی باتیں یاد آئیں۔ تم سب لوگ یاد آئے جو غل مچاتے ہوئے شام کے وقت مجھے دیکھنے کے لئے آیا کرتے تھے اور مجھے عامر یاد آتا لیکن — وہ چہرہ اب دھندلاتا جا رہا تھا — اور میں اس نفیس مہربان ڈاکٹر کے بارے میں سوچتی جو کبھی کبھار اپنے سگرٹ میرے کمرے میں "بھول" جاتا اور مجھے وہ دوست یاد آتے جو آس پاس کے قہوہ خانوں میں چائے پی رہے ہوں گے۔

اور لامنٹ نوبل پرائز تو بہت بڑا اعزاز ہے — تمہیں تو کوئی چھوٹا موٹا انعام بھی نہیں ملے گا۔ ہم جیسے لوگوں کو کوئی اعزاز نہیں ملتا — ہم صرف دکھ سہتے ہیں اور دکھ ورثے میں دے جاتے ہیں۔

ہاتھ جو قلم تھامنے کے عادی تھے بھدے ہو گئے ہیں اور ناخنوں کی پھپھوندی کسی طور نہیں جا رہی۔

لیکن میں یہ سب باتیں کیوں کر رہی ہوں، یہ ماضی ہے — آؤ ہم اپنی میتیں دفن کر دیں اور پھر کبھی ان کا ذکر نہ کریں —

" لیکن میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں نینا — مانتا ہوں گلاب کے پھول بہت خوبصورت ہوتے ہیں اور ٹیولپس بھی — اور کارنیشن بھی — لیکن کیا سنو ڈراپس اور کروکسز میں کوئی حسن نہیں ہوتا ؟"

ہم "ہاٹ ہاؤس پلانٹس" نہیں تھے لیکن کیا خودرو پھولوں کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں؟ کیا ہم اسی سلوک کے مستحق تھے جو زندگی نے ہمارے ساتھ کیا؟"

لامنٹ — ہم آبلہ پا تھے۔ ہم سے پہلے بھی بہت سے آبلہ پا آئے — اور ہمارے بعد بھی آئیں گے۔

اور لامنٹ یہ پیار کی منزلیں ہیں — اور یہ دار کی منزلیں ہیں — اور ہمیں اپنے دوش پر اپنی اپنی صلیب اٹھا کر چلنا ہے۔

چاند کو گل کریں تو ہم جانیں!

کیسی نمناک صبح تھی۔ رات بھر بارش رہی تھی۔ صرف صبح دس بجے کے قریب بادل ذرا چھٹے۔ اور ہلکی سی دھوپ نکل آئی۔ رات بھر مجھے نیند نہیں آئی تھی —— گلاب کی بیل جو دیوار پر پھیلی ہوئی تھی۔ اسکی ٹہنیاں ہوا اور بارش کی وجہ سے بار بار دریچہ کے شیشوں کے ساتھ ٹکراتی رہی تھیں —— صبح کے وقت میں نے دبیز پردے ہٹا کر دریچے میں سے باہر جھانکا —— ہوا میں موسم سرما کے پھولوں کی بھی بھینی بھینی سی مدھم خوشبو تھی —— اور ہلکی سی خنکی —— چائے پی کر گیلری میں سے گزرتے ہوئے میں نے ابا کے کمرے میں جھانکا۔ اندر اسلم بھائی جو ابا کے فرسٹ کزن تھے۔ نین تارا سے کسی بحث میں الجھے ہوئے تھے۔

اور نین تارا کہہ رہی تھی۔

"مجھے اس سے کوئی بحث نہیں۔ کہ ملک میں کونسا نظام آتا ہے۔ ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے میں تو صرف اتنا جانتی ہوں۔ کہ ہسپتال میں بیمار بچوں کو دودھ ملنا چاہیئے۔ اور مریضوں کا راشن چوری نہیں ہونا چاہیئے —— ایک روز بچے رو رہے تھے۔ اور دودھ کو منہ نہیں لگا رہے تھے۔ جب میں نے دودھ چکھا۔ تو وہ پھیکا تھا —— اس میں بالکل برائے نام چینی تھی۔ معلوم ہوا کہ چینی ختم ہے

___ اس چینی میں اتنے حصہ دار ہیں ___ کہ بچے بھوک کے مر جاتے ہیں۔

ٹی بی کے مریضوں کے لئے سی ڈائیٹ (DIET C) ہوتی ہے۔ جس میں ناشتہ میں تین انڈے دیے جاتے ہیں۔ اور کھانے میں مرغی ___ لیکن کبھی کسی مریض کو ایک انڈے سے زیادہ نہیں ملتا ___ اور مرغی کا صرف پتلا سا شوربہ ___ میں ڈاکٹر ہوں۔ کھانے کہاں تک چیک کروں۔

جب میں نے ڈانٹ ڈپٹ کی ___ تو جونیر سٹاف نے منہ لٹکا لیا۔ اور پھر ناظر جو ٹی روم کا انچارج ہے۔ اور جسے میں نے اپنے گھر میں کوارٹر دے رکھا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ کرنل صاحب جب راشن آتا ہے۔ تو آدھا راشن تو افسروں میں بٹ جاتا ہے۔ اس کے بعد صوبیداروں وغیرہ کا نمبر آتا ہے۔ آخر انہوں نے کیا قصور کیا ہے ___ ان حصے بخروں کے بعد جو بچ جاتا ہے وہ مریضوں کو مل جاتا ہے ___ سکویش کی بوتلیں تک جو مریضوں کے لئے آتی ہیں۔ آدھی افسروں کے گھر چلی جاتی ہیں ___۔

نین تارا کی بہت چمکتی ہوئی ہنستی ہوئی آنکھیں تھیں۔ لیکن اس وقت ان آنکھوں میں اداسی جھلک رہی تھی ___

" تم لوگ اتنی صبح ناشتہ کر رہے ہو ! " میں نے بات کو پلٹنے کی خاطر کہا۔

" یہ صبح ہے۔ " اسلم بھائی ہنسے " ساڑھے دس بج رہے ہیں۔ "

" تم چائے پیو گی۔ ؟ " ___ نین تارا نے میرے لئے چائے بناتے ہوئے پوچھا۔

" پی چکی ہوں ۔ لیکن اور مل جائے تو کوئی مضائقہ نہیں " ___

" لیکن میں یہ کہہ رہا تھا " ___ اسلم بھائی موضوع کو ترک کر دینے پر آمادہ نہیں تھے " کہ یہ جن باتوں کا تم ذکر کر رہی ہو۔ یہ دنیاوی فائدے ہیں۔ ایک دوسری زندگی بھی ہے ___ جہاں عذاب وثواب اور جزا و سزا ہے " ___

" جہنم میں جائے دوسری زندگی ___ یعنی اس دنیا میں لوگ بھوک سے مر رہے ہیں۔ اور آپ

انھیں دوسری زندگی کے فائدے سے گنوا رہے ہیں ——— وہ زندگی جب آئے گی۔ تب دیکھا جائیگا۔"

یہ بحث جاری رہے گی ——— میں نے سوچا ——— ابا آرام سے بستر میں ناشتہ کر رہے تھے ——— میں پیالی لے کر باغ میں چلی گئی ——— دور سے مجھے چراغ صاحب آتے ہوئے نظر پڑے ——— وہ کتنی مدت کے بعد آئے تھے۔

"آیئے ——— آیئے۔ چراغ صاحب۔ چائے پیجئے"——— میں نے پیالی ان کیطرف بڑھائی۔

"اس میں شکر نہیں ہے۔ میں آپ کے لیے منگواتی ہوں"———

"شکریہ بی بی۔ آپ ہمیشہ بہت تکلیف کرتی ہیں"——— چراغ صاحب بنچ پر بیٹھ گئے۔

وہ ابا کے دفتر میں ہیڈ کلرک تھے ——— اور دفتر کے کاموں کی جنرل نگرانی کرتے تھے ——— برس ہا برس انہوں نے ابا کو اپنی نہ ٹوٹنے والی وفاداری اور انتھک محنت دی تھی۔ ابا بھی ان کا بہت لحاظ کرتے تھے ——— لیکن ابا کے جونیئر جو دفتر میں تھے۔ ان سے چراغ صاحب کبیدہ خاطر رہتے تھے۔———

چار برس جب دل کے مرض کی وجہ سے ابا بستر پہ لیٹے رہے ——— وہ ہفتہ میں چھ دن دفتر کا کام نمٹا کر باقاعدگی سے گھر آتے۔ اور دو گھنٹے کے قریب گھر پر بھی کام کرتے ——— ابا بستر میں لیٹے لیٹے انھیں ہدایات دیتے۔ وہ نوٹس لیتے رہتے۔ اور پھر ابا کا جو آفس گھر میں تھا، اس میں بیٹھ کر فائلوں پر جھک جاتے۔ اگر موسم اچھا ہوتا۔ تو وہ باہر باغ میں بیٹھ جاتے ان کے لئے وہیں میز کرسی لگا دی جاتی۔

مالی امور میں وہ مہارت رکھتے تھے چیکوں کا ایسا ٹریک رکھتے۔ کہ بس ——— کس فرم یا کمپنی یا بنک نے چیک بھیج دیا۔ اور کس کی طرف کب سے حساب نکلتا ہے۔ اور کون کون سا بل ابھی وصول نہیں ہوا ——— اس قسم کی باتیں انھیں ازبر رہتی تھیں ———

ایک روز جب میں ابا کے کمرے میں گئی۔ تو وہ سر ہلا کر کہہ رہے تھے۔

جناب صرف نیشنل بنک —— داؤد ہرکولیس —— لارنس پور —— ٹی آئی پی (TIP) اور پیکجز والے اپنا حساب صاف رکھتے ہیں۔ ریٹینرفی RETAINER FEE کے چیک تین تاریخ تک پہنچ جاتے ہیں۔ مقدموں کے بل جب بھیجیں فوراً ایک ہفتے کے اندر چیک آجاتے ہیں —— باقی سب تو ریمائنڈر REMINDER کا انتظار کرتے ہیں۔ اور روٹی کارپوریشن کا تو صاحب یہ حال ہے۔ کہ ان کا چیک اکثر بنک سے واپس آجاتا ہے۔ اکاؤنٹ میں پیسے ہی نہیں ہوتے۔"

—— ایک روز بڑے دکھ سے انہوں نے ابا سے کہا تھا۔

"چوہدری صاحب اب آپ مجھے چھٹی دیدیجئے —— میں تھک گیا ہوں —— اب میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔" ——

"آپ کو کوئی شکایت ہے۔ چراغ صاحب؟" —— ابا کو معلوم تھا۔ کہ دفتر میں زبردست قسم کی (INTRIGUES) انٹریگز چل رہی تھیں ——

"جی نہیں چوہدری صاحب —— میں تو آپ کے ساتھ بہت خوش رہا ہوں۔ آپ نے مجھے چراغ سے چراغ صاحب بنا دیا ——" یہ کہتے وقت ان کی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی تھی۔

—— اس وقت میں نے چراغ صاحب کو غور سے دیکھا —— ان کے چہرے کی لکیریں اور گہری ہو گئیں تھیں —— بال ذرا زیادہ سفید ہو گئے تھے —— اور وہ بہت تھکے ہوئے نظر آرہے تھے ——

"کیسے تکلیف کی چراغ صاحب؟" —— میں نے پھولوں پر سے نظر اٹھا کر پوچھا میرے اور ان کے درمیان ایک گملہ تھا۔ جس میں نیلی مخملیں پتیوں والے پھول تھے

"کچھ نہیں بی بی —— میں نے سوچا۔ کل نیا سال شروع ہو رہا ہے۔ آپ لوگوں کو مبارک باد دے آؤں۔ دوسرے ایک ذاتی مقدمہ بھی آن پڑا ہے۔ دفتر میں تو وقت ہی نہیں ملتا —— چوہدری صاحب سے یہیں مشورہ لے لوں گا۔" ——

اباکو اطلاع دے کر جب میں واپس باغ کی طرف آئی ۔ تو بلا میرے پیچھے پیچھے آئی ۔ بلا اپنی بہن کے ساتھ جو ٹوسٹنگ کرنے آیا کرتی تھی ۔ اکثر آتی ـــــ ہر وزٹ (Visit) کی میں اسے چونی دیا کرتی تھی ـــــ جو وہ اپنے گلے میں ڈال لیتی تھی ـــــ اس وقت اس کے ہاتھ میں پھول کاٹنے کی قینچی تھی ـــــ

" ـــــ چلئے بی بی ۔ پھول لے آئیں ـــــ "

" چلو ـــــ "

" بی بی کل میں نے اپنا گلہ توڑا ۔ تو یہ ڈھیر سارے پیسے نکلے ـــــ "

" تم نے گلہ کیوں توڑا ؟ کیا بھر گیا تھا ؟؟ ـــــ " میں نے بے دھیانی سے پوچھا ۔

" نہیں بی بی ـــــ گھر میں آٹا نہیں تھا ۔ اس لئے توڑ ڈالا ـــــ پھر جو چونیاں نکلیں ـــــ ان کا ہم آٹا لے آئے ـــــ بی بی چونیاں جمع کرتے رہو ۔ تو وہ بھی بہت سے روپئے بن جاتی ہیں ـــــ "

کرب کی ایک لہر میرے دل میں دوڑ گئی ـــــ یہ آٹھ نو سال کی بچی ـــــ اُسے روپیہ کی اہمیت کا احساس نہیں ہونا چاہیے ـــــ اُسے آٹے کی فکر نہیں کرنا چاہیئے ـــــ اُسے گلہ توڑنے کی ضرورت نہیں پڑنی چاہیئے ۔

ـــــ میں نے نظر بھر کر اس کی طرف دیکھا ـــــ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا ۔ یہ پیسے وہ اپنی گڑیا کی شادی کے لئے جمع کر رہی تھی ـــــ اب اس کی گڑیا کی شادی خاصی طویل مدت کے لئے ملتوی ہو جائے گی ـــــ یا شاید کبھی نہ ہو سکے گی ـــــ کیونکہ پھر کسی دن آٹا ختم ہو جائے گا ۔

دکھ سے میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں ـــــ میرے ہر طرف دکھوں کے ورق بکھرے پڑے ہیں ۔

ـــــ اباکے کمرے میں اسلم بھائی کہہ رہے تھے ۔

"لیکن تم دنیاوی آسودگی کی بات کر رہی ہو۔"

"اس لئے کہ میں کسی اور آسودگی کو نہیں جانتی۔" ___ نین تارا نے چمک کر کہا۔

"آپ اپنی دوسری دنیا کے وعدے وعید اپنے پاس رکھئے اسلم بھائی ___ میرے مریض غذا کی کمی کے باعث صحت سے محروم رہتے ہیں۔ اور میں کچھ نہیں کر سکتی ___ جس ہسپتال سے انھیں ہنستے کھیلتے گھر جانا چاہیئے۔ وہاں سے اکثر ایمبولنس میں ان کی میتیں جاتی ہیں ___ یہ کیسی اندوہناک بات ہے۔ لیکن میرے پاس اس کا کوئی مداوا نہیں ___ میں دوائیاں دے سکتی ہوں۔ لیکن ہر وقت ان کی غذا کی چیکنگ نہیں کر سکتی ___" ___ وہ دونوں ابھی تک بحث کر رہے تھے۔

ابا ناشتہ ختم کر کے آنکھیں موندے لیٹے ہوتے تھے ___

___ رات کو ساڑھے دس بجے وقار نے میرے کمرے میں جھانکا۔

"چلو تمہیں سیر کرا لائیں۔ آج نیو ایئر ایو ہے۔ کیا تم بھول گئیں؟" ___

ارے یہ سچ ہی تو کہہ رہے ہیں۔ آج واقعی نیو ایئر ایو ہے۔ دنیا بھر میں لوگ اس روز جشن مناتے ہیں ___ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر رقص کرتے ہیں۔ اور جب بارہ بجتے ہیں۔ تو اجنبیوں کو پیار کرتے ہیں ___ ایک ہنگامہ ہوتا ہے۔

___ ایک زمانہ تھا۔ ہم کیسے اہتمام سے نیو ایئر ایو منایا کرتے تھے ___ میں نے نرم اداسی سے یادوں کے شفیق ہاتھ کو جھٹکنے کی کوشش کی ___ اور لحاف اور اوپر کر لیا۔

"نہیں بھئی میں ریلیکس RELAX کر رہی ہوں۔ تم اور نین تارا جاؤ ___"

"چلو تم بھی چلو ___" نین تارا نے میرا لحاف کھینچتے ہوئے کہا ___

"بھئی میں اب چینج CHANGE کر چکی ہوں۔"

___ نین تارا نے میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا ___

میں گڈو سے کہتی ہوں۔ تمہارے کپڑے نکال دے گی ___ چلو تمہیں گو گو (GOGO)

میں کافی پلائیں گے ——"

گوگو پہونچ کر وتارنے گاڑی روکی —— میں ٹھٹک گئی "ٹھہرو —— ذرا ٹھہر کر کافی پیئیں گے ۔"——

بک سنٹر میں کیسٹ بج رہا تھا ۔ اور اس کے سامنے چار نوجوان لڑکے رقص کر رہے تھے وہ خوشی سے بادلے ہوئے جارہے تھے ۔ اور بڑے انداز اور سلیقہ سے موسیقی کی دھن اور ردھم پر رقص کر رہے تھے ۔ رفتہ رفتہ ان چار لڑکوں کے ساتھ اور لڑکے آن کر رقص کرنے لگے ۔ دیکھنے والوں کا مجمع بھی بڑھتا جارہا تھا ۔

—— مین تارا کی ساڑھے تین سال کی بیٹی دوڑ کر ان کی طرف چلی گئی ۔ ایک لڑکے نے اُسے کندھوں پر بٹھا لیا ۔ اور اسی طرح رقص کرتا رہا —— بچی تالیاں بجاتی رہی ——

یہ سب ٹین ایجرز TEEN AGERS تھے ۔ مشکل سے فرسٹ یا سیکنڈ ایئر کے طالب علم —— خوشی ان کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی —— اور مسرت سے ان کے چہرے دمک رہے تھے ——

مجمع بھی خوش تھا ۔ بک سنٹر کا مالک کیسٹ پر کیسٹ بدل رہا تھا ۔

میں بک سنٹر کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی ۔ اور لمبا سانس لیا —— لوگ زندہ ہیں —— سب کچھ سہنے کے باوجود زندہ ہیں ——

پھر اچانک وہاں رکی ہوئی موٹروں کے ہارن بجنے لگے —— سڑک پر سے گزرتی ہوئی موٹروں نے بھی زور زور سے ہارن بجائے —— میں نے اپنی کلائی کی طرف نظر دوڑائی بارہ بج گئے تھے —— اور لوگ نئے سال کو خوش آمدید کہہ رہے تھے ۔ لوگ خوش ہیں —— سارے دکھوں اور ساری محرومیوں کے باوجود —— لوگ زندہ ہیں —— لوگوں کا احساس ابھی جاگ رہا ہے ۔

میں نے حیرت اور مسرت سے آنکھیں جھپکیں ——

ــــ کافی پی کر وقار نے کہا ــــ

" بھوک لگی ہے ۔ ایک جگہ بڑے اچھے پائے ملتے ہیں، چلو وہاں چلیں ــــ "

مال روڈ پہ پہنچ کر اس نے گاڑی تیز کر دی ۔ جب وہ راوی روڈ کی طرف مڑا ۔

تو میں نے حیرت سے پوچھا ــــ " یہ آخر آپ جا کہاں رہے ہیں ۔ کیا پایوں کی دکان

اللہ میاں کے پچھواڑے ہے ؟"

" بھئی دراصل وہ اس بازار میں ہے ۔ تم وہاں کبھی گئی ہو ؟"

" نہیں ــــ " میں نے کہا ــــ آج سے پہلے تو کسی میں اتنی ہمت نہ پیدا ہوئی تھی

کہ مجھے وہاں لے جاتا ۔ آج پہلا موقعہ ہے ۔

" اس بازار " میں پہنچ کر میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی ۔ بہت ٹیڑھی میڑھی تنگ و

تاریک گلیاں تھیں ۔ اور بہت شکستہ مکانات ــــ

" میرا خیال تھا ۔ یہاں بہت عالیشان مکان ہونگے ۔"

" اندر سے بہت سجے رہتے ہیں ۔" ــــ وقار نے اطلاع دی ــــ اکثر دروازے

کھلے تھے ۔ قالین بچھے تھے ۔ اور ان پر چاندنی ــــ رقاصائیں فرش پر بیٹھیں تھیں ــــ

کسی کسی نیم وا دروازے میں سے صوفے بھی نظر آ رہے تھے ۔ اکثر گھروں کے دروازے پر موٹی

موٹی بے ہنگم نائیکہ کھڑی تھیں ۔

" باجی گانا ہوگا ؟"

وقار نے ایک جگہ موٹر کی رفتار جو پہلے ہی کم تھی ۔ اور کم کر کے پوچھا

" ضرور ہوگا ــــ اندر تشریف لائیں ــــ "

" ابھی آیا ۔ ذرا بیبیوں کو چھوڑ آؤں ۔" ــــ وقار نے بہت سنجیدگی سے کہا ــــ

اور ہماری طرف دیکھ کر ہنسا ۔

ایک جگہ کھڑکی میں سے سر نکال کر اس نے پوچھا ــــ

"کونسا گانا آتا ہے۔ آپ کو ؟"——

وہ کوئی جلے دل کی تھی۔ غصے سے بولی۔ "آپ کی ڈنلی کا——"

وقار نے کان دبا کر گاڑی آگے بڑھا دی——

کہیں کہیں دروازہ بند تھا اور اندر سے طبلے کی تھاپ اور گھنگھروں کی جھنکار آ رہی تھی۔

یہ کیسی معصوم صورت اور کمسن ہے—— ایک کھلے دروازے کی طرف نظر دوڑاتے ہوئے میں نے سوچا۔

اور پھر ایسی کتنی ہی صورتیں نظر آئیں، لیکن سب پر ایک چھاپ تھی۔ ایک مہر تھی جو کسی صورت مٹ نہیں سکتی تھی۔ سب نے بہت شوخ رنگ کے لباس پہن رکھے تھے اور بہت تیز میک اپ کر رکھا تھا۔

—— شاید یہ یہیں پیدا ہوئیں —— پیدائش بھی تو ایک حادثہ ہے ——

یا شاید یہ یہاں پہونچ گئیں —— یا شاید انھیں بچپن میں کسی نے اغوا کر لیا —— اور پھر انھیں دنیا کے قدیم ترین پروفیشن کو اپنانا پڑا۔

—— زندگی حادثات سے عبارت ہے۔

—— میں اس خاک آلود لمحہ میں مقید ہوں —— غم سے میری آواز گلوگیر ہو گئی۔

مجھے ایک اور دکھ بھرا لمحہ یاد آیا——

شادی کی اس محفل میں ایک کمسن رقاصہ گا رہی تھی۔ اور رقص کر رہی تھی۔ بعد میں اس نے سب کو پان پیش کئے۔ ایک صاحب نے پان کو دیکھ کر سر ہلایا۔

"جی نہیں —— یوں نہیں۔ ہمارے منہ میں دیجئے۔ اپنے نازک ہاتھوں سے۔"

اور اس معصوم بھولی بھالی صورت نے میکانکی انداز سے پان ان کے منہ کی طرف بڑھا دیا——

پان منہ میں لیتے وقت ان حضرت نے آہستہ سے اس کی انگلی کو دانتوں میں دبا لیا ——

خالص تماشبینوں کے انداز میں ——

—— اس دلگر حرکت کو دیکھ کر میں نے سوچا تھا ——

اس شخص کے ہاتھوں لوگوں کی تقدیر کے فیصلے ہوتے ہیں۔ عدل و انصاف کی ترازو اس کے ہاتھ میں ہے ۔

خداوندا —— خداوندا —— مجھ میں یہ سب کچھ سہنے کی صلاحیت پیدا کر دے ۔

—— آج ایک بار پھر مجھے محسوس ہوا ، کہ میں گدلے پانی کے جوہڑ میں ڈوب رہی ہوں اور غلیظ پانی میری آنکھوں میں بھر گیا ہے ——

" وقار واپس چلو "

" کیوں ؟ " ——

" مجھے یاد آیا ۔ گھر میں پائے پکے رکھے ہیں ۔ ڈیپ فریزر میں —— آپ وہ گرم کروا کر کھا لیجئے گا —— "

" پہلے کیوں نہ بتایا —— ؟ "

" وہ بتا بھی دیتی تو کیا ہوتا " —— نین تارا نے کہا —— " آپ کی ٹھرک کیسے پوری ہوتی ۔ ٹھرک تو جھاڑنا ہی تھی نا ۔ " ——

وقار نے ہنستے ہوئے گاڑی گھر کی طرف موڑی ——

" تم نے آج کے اخبار میں نیا ضابطہ پڑھا " ؟ —— وقار نے مجھ سے پوچھا ۔

" ہاں " —— میں نے کہا ۔

" کل رات کو میں گھر جا رہا تھا ۔ تو پولیس نے میری گاڑی روک لی ۔ اور ڈگی کی تلاشی لی ۔ پھر کہنے لگے ۔ آپ کو ہمارے ساتھ پولیس چوکی چلنا ہوگا ۔ آپ نے پی رکھی ہے —— میں نے بہتیری قسمیں کھائیں —— کہ میں بہت پکا مسلمان ہوں ۔ اور میں نے کبھی چکھی بھی نہیں —— لیکن وہ نہ مانے —— میں دو سو روپیہ دے کر چھوٹا —— آج کل ریٹ بڑھ گئے ہیں " —— وہ ہنسا ۔

بہت جلد ایک ضابطہ نکلے گا۔ کہ مغرب کے بعد سڑکوں پر خاص اجازت نامے کے بغیر نکلنا ممنوع ہے ——

پھر دوسرا ضابطہ نکلے گا۔ کہ خدا کی اس وسیع و عریض آزاد دنیا میں کھلی فضا میں سانس لینا منع ہے —— بغیر خاص اجازت نامہ کے —— اور وہ بھی ہفتہ میں صرف ایک دفعہ —— ایک گھنٹہ کے لئے ——

کیا یہ کرام ویل کا دور ہے۔ جہاں ولیج گرین VILLAGE GREEN پر رقص کرنا ممنوع تھا —— جہاں میلے ٹھیلے بند کر دیے گئے تھے —— جہاں روشنیوں پر پابندی تھی —— اور زندگی خشک اور پژمردہ ہو کر رہ گئی تھی ——

میرے مجروح دل نے سوچا ——

—— صبح کتنی خوشگوار نرم و گداز خنکی لے کر آئی تھی —— پھول سرسرا رہے تھے۔ اور چڑیاں چہچہا رہی تھیں —— باغ کے درخت بارش میں دھل کر نکھر گئے تھے ——

—— لیکن اب کتنی گھٹن ہے —— کتنا حبس ہے ——

مجھے ایسا لگا جیسے مٹی سے میرے ہاتھ اور سارا بدن لتھڑ گیا ہو۔

—— شاید گھر جا کر مجھے بہت تیز گرم پانی سے غسل کرنا چاہیئے —— ڈھیروں باتھ سالٹس BATH SALTS ڈال کر ——

لیکن نین تارا نے ایک بار کہا تھا۔

"تمہاری روح ہی غلیظ ہے۔"

—— پھر میری سوچ کی لہر مجھے گلبرگ میں لبرٹی مارکیٹ کے چوک کی طرف لے گئی ——

—— وہ لڑکے کتنے خوش تھے۔ اور ان کی خوشی کس طرح دیکھنے والوں تک پہونچ رہی تھی —— شاید جس طرح غم لہروں پہ تیرتا ہوا دوسروں تک پہونچ جاتا ہے، اسی طرح مسرت بھی اپنے تک محدود نہیں رہتی۔

مسرت کا بادل لہرا لہرا کر آس پاس کے لوگوں کو بھی اپنی آغوش میں لے لیتا ہے —
ان ٹین ایجرز کے تھرکتے ہوئے پیر — لہراتے ہوئے بازو اور دمکتے ہوئے چہرے
مجھے پھر سے یاد آ گئے — میں نے ان لمحوں کو اپنی گرفت میں لینا چاہا۔

دنیا میں بہت کم خوشیاں ہیں۔ بہت زیادہ دکھ ہیں۔ بہت محرومیاں ہیں۔
اے نیک دل لڑکو خدا کرے۔ تم ایک طویل مدت تک خوش رہو۔
اسی طرح آنے والے برسوں میں نئے سال کو خوش آمدید کہتے رہو۔
آج تم نے کتنے لوگوں کو خوش کیا۔
— ابھی لوگوں کی خوش رہنے کی صلاحیت زندہ ہے۔
دل کی خوشی پر کوئی ضابطہ کوئی پابندی نہیں لگا سکتا۔
اور میرے دوست ہیں، جو اکثر شام میں جمع ہوتے ہیں اور کہتے ہیں۔
حالات بدلیں گے — ضرور بدلیں گے — ۔
اور واماندگیٔ شوق کا یہ عالم ہے۔ کہ میں نے کبھی یہ نہیں پوچھا۔
کب ؟ —
آخر کب ؟؟ —

یہ موسم سرما ہے۔ لیکن کیا بہار بہت دور ہے — !
شمعیں بجھائی جا سکتی ہیں۔
لیکن چاند کو کون گل کر سکا ہے۔ !!

ہم سہل طلب .....

——کسی زمانہ میں ایک شہزادہ تھا۔ جو کسی شہزادی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ چاہتا تھا کہ وہ سچ مچ کی شہزادی ہو۔ ایسی ویسی کوئی بنی ہوئی شہزادی نہ ہو——

کسی نے دروازے پر آہستہ سے انگلیاں بجائیں——

"آجائیے——" میں نے کہا۔

دتار نے دروازہ کھولا۔

"باہر بہت گرمی ہے——" اس نے جیب سے رومال نکالا۔ اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔

"ذرا ایئر کنڈیشنر میکسیمم پر کر دوں"——اس نے پوچھا——

——وہ پہلے ہی میکسیمم پر تھا۔

"تم کیا پڑھ رہی ہو؟" وہ سیٹی پر نیم دراز ہوگیا۔

"میں ہینس اینڈرسن کی پریوں کی کہانیاں پڑھ رہی ہوں۔"

——شہزادے نے دنیا بھر میں گھوم پھر کر تلاش کیا، لیکن ہر شہزادی میں کوئی نہ کوئی خامی

ہوتی۔ بعض دفعہ تو یہ بھی پتہ نہ چلتا کہ وہ واقعی شہزادی ہے بھی یا نہیں ——

میں نے کہانی کا سلسلہ جہاں سے ٹوٹا تھا، وہیں سے پھر جوڑنے کی کوشش کی۔

"یہ ادب بھی دراصل ایک قسم کی افیم ہے اور پریوں کی کہانیاں تو زہر قاتل ہیں۔ زہر قاتل —
یہ جو تم ہر وقت لیٹی ہوئی پڑھتی رہتی ہو۔ یہی تمہاری ان ڈوئنگ (UNDOING) ہے"

"اب تم دونوں کی لڑائی ہو جائے گی ——" نین تارا نے قالین پہ بیٹھتے ہوئے کہا۔

"یہاں گھر کے سامنے فلتھ ڈپو بن رہا ہے —— ؟" نین تارا نے پوچھا ——

"ہاں خاں صاحب کچھ کہہ تو رہے تھے۔" —— مجھے یاد آیا کہ تین چار روز پہلے خاں صاحب مجھے واپس لے کر آ رہے تھے۔ تو انہوں نے گیٹ پہ گاڑی روک کر باؤنڈری وال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

"صاحب یہاں ایک فلتھ ڈپو بن رہا ہے۔ میں نے ٹھیکیدار سے کہا تھا کہ یہاں نہ بنائے لیکن وہ کہنے لگا کہ اس نے چوہدری صاحب سے اجازت لے لی ہے۔"

"تم نے ابا سے بات نہیں کی کہ وہ ٹھیکیدار کو منع کریں کہ وہ یہاں نہ بنائے ——" نین تارا نے سوال کیا۔

شرم اور ندامت کی ایک لہر سی میرے بدن میں دوڑ گئی۔

"ہاں میں نے سوچا تو تھا کہ ابا سے بات کروں گی۔ لیکن پھر میں دراصل بھول ہی گئی ——" میں نے معذرت کے لہجے میں جواب دیا۔

"میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ اس ادب کے چکر نے تمہیں کسی کام کا نہیں رکھا۔ غضب خدا کا چار روز سے تمہیں علم ہے اور تم نے بات تک نہیں کی۔ وہاں گڑھا بھی کھد گیا ہے، ابا تو خیر بیمار ہیں۔ لیکن تم۔"

"پائپ ڈاؤن ——" میری آواز میں تیزی آگئی۔

"دراصل بات میرے ذہن سے بالکل اتر گئی۔ میں اب بات کرتی ہوں۔"

"اب میں نے بات کر لی ہے۔ انہوں نے ٹھیکیدار کو بلایا ہے۔ —— " نین تارا نے کہا۔

وقار سیٹی پر اور بھی آرام سے لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

میں اباکے کمرے میں پہنچی ——

وہ تکیوں پر سر رکھے لیٹے تھے۔

" چوہدری صاحب مستری آیا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ ٹھیکیدار تو نہیں ہے۔"

—— مینا نے دروازہ میں سے جھانک کر کہا۔

" اسے اندر بلاؤ۔"

" مستری جی " —— ابا تکیوں کے سہارے بیٹھ گئے اور دھیمے انداز میں جس میں وہ ہمیشہ گفتگو کرنے کے عادی تھے۔ بات شروع کی ——

" مجھ سے تو ٹھیکیدار نے فلتھ ڈپو کی بات نہیں کی تھی۔ صرف یہ کہا تھا کہ پتے وتے ڈالنے کیلئے جگہ بنانا ہے اور میں نے کہا تھا کہ گھر سے ذرا دور بنالیں۔ یہ آپ نے کیا کیا۔ بالکل گیٹ کے سامنے بنا رہے ہیں ——"

" صاحب جی۔ مجھے تو کچھ پتہ نہیں —— اور جی ٹھیکیدار نماز پڑھنے گیا ہے۔"

" اچھا وہ آئے۔ تو اس سے کہنا کہ مجھ سے بات کرے۔"

ابا نے اپنا سر پھر تکیوں پر رکھ لیا۔ وہ بہت بری طرح سے ڈرگڈ تھے۔ انھیں ہسپتال سے گھر آئے ابھی دو دن گزرے تھے۔

" آپ نے انھیں پتوں کے لئے بھی کیوں اجازت دی ؟" —— امی نے سوال کیا۔

ابا کے پیٹریشن PATRICIAN چہرے پر مسکراہٹ کی ایک لہر سی آئی۔ مسکراہٹ جس نے غم سے جنم لیا تھا۔ ان کی آنکھوں میں تحیر آمیز دکھ تھا۔

ان کی طبیعت اتنی خراب تھی کہ ایک چھوڑ دس فلتھ ڈپو بھی بن جاتے۔ تو انھیں کچھ پتہ نہ چلتا۔

زندگی کے کتنے محاذوں پر وہ تنہا تھے —— میں نے دکھ سے سوچا۔

آج کل وہ اپنے کمرے میں یلٹے ہوئے اپنے بیمار دل کو لئے کیا کیا سوچتے رہتے ہونگے۔

میں نے ان کے چہرے سے دل کا حال پڑھنے کی کوشش کی۔

ابا نے کبھی آفٹرشیو لوشن نہیں لگایا۔ کبھی یو۔ ڈی۔ کلون کا سپرے نہیں کیا۔ لیکن ان میں ہمیشہ ایک اُجلاپن ـــــ ایک نکھار رہتا ہے ـــــ ان کے پاس بیٹھے ہوئے لوگ ہمیشہ کچھ میلے میلے نظر آتے ہیں۔

انہوں نے آنکھیں پھر بند کر لیں ـــــ

آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میں واپس پہنچی

کمرے میں خوشگوار قسم کی بے ترتیبی تھی اور پھولوں کی مہک تھی۔ میں نے ایک نظر گلاب اور موتیے کے پھولوں کو دیکھا، جو ایک بہت بڑے گلدان میں ایک ساتھ لگے تھے۔

گلاب کا یہ شیڈ کتنا خوبصورت ہے ـــــ میں نے آہستہ سے ایک پھول کو چھوا شاید اسی کو شاعر لوگ لب دلدار کا رنگ کہتے ہیں ـــــ

لیکن میرے ایک دوست کا کہنا تھا کہ اب لب دلدار کے رنگ کا تعین کرنا بھی مشکل ہے کیونکہ لپ اسٹک کے بہت سے شیڈز ہیں۔

میں نے کمرے پہ اچٹتی سی نظر ڈالی ـــــ وتار نے سگریٹ سلگایا ـــــ اور ماچس کی جلی ہوئی تیلی آتش دان کی طرف پھینکی۔

اُسے اپنی نشانہ بازی پہ بڑا گھمنڈ تھا۔ لیکن اس وقت وہ تیلی آتش دان سے باہر ہی گری۔

"چھوٹی بیگم یونیفارم تو میں نے تیار کر دی پیس کونسے بلاؤز کو لگانا ہیں؟" ـــــ تازو نے دروازہ کھٹاک سے کھول کر پوچھا

"کسی کو لگا دو" ـــــ مین تارا نے جھنجلا کر کہا۔

"جی آدھی آستینوں والے کو ـــــ یا پوری آستینوں والے کو؟ ـــــ" تازو کو بے موقعہ، بے تکے قسم کے سوال پوچھنے کی عادت تھی۔

نین تارا نے اُسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

"جس کو تمہارا جی چاہے۔"

اس مختصر سی زندگی میں کیا کیا مسائل ہیں۔ کون بلا ئنڈز ——— کیسی آستینیں۔ میں نے سوچا۔

وقار کو ایک دم یاد آگیا کہ نین تارا افسر ہے ———

"تم ایس۔ ایچ۔ او سے بات کیوں نہیں کرتیں ——— ؟ ——— تم لیفٹیننٹ کرنل ہو یا کہیں استانی لگی ہو!!!" ———

ایک بار وقار نے کہا تھا۔ پولیس اسٹیشن تمہارے گھر سے اس قدر قریب ہے۔ کبھی کبھی ایس ایچ۔ او کو مرغیاں ورغیاں کھلا دینی چاہئیں ——— پولیس سے ہمیشہ بنا کر رکھنا چاہیئے۔ کبھی کام پڑ ہی جاتا ہے۔

اس پر ہم سب لوگوں نے بہت بُرا مانا تھا۔

لیکن جب ہمارے ایک ملازم حنیفو کو رات کے دو بجے سینما سے واپس آتے ہوئے پولیس آوارہ گردی میں پکڑ کر لے گئی اور وہ ایک رات مار کھاتا رہا اور اگلے روز اس نے خدا جانے کس طرح ایک کانسٹیبل کی منت سماجت کر کے گھر ٹیلیفون کروایا۔ تو ہمیں وقار کا یہ زریں مشورہ بہت یاد آیا ——— ابا نے اپنے ایک دوست کو ٹیلیفون کیا۔ جو آئی۔ جی لگا ہوا تھا اور بہت ہی بھلا آدمی تھا۔ لیکن وہ دورے پر ملتان گیا ہوا تھا۔

تب وقار ہی تھا۔ جو پولیس اسٹیشن پہنچا اور حنیفو کو رہائی دلوائی۔ یہ الگ بات ہے کہ پولیس والوں کو خوش کرنے کے لئے اس نے خود بھی ان کے سامنے حنیفو کے دو چار جوتے لگائے اور ان سے پکا وعدہ کیا کہ اب حنیفو ہی نہیں ——— کسی بھی ملازم کو سیکنڈ شو دیکھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

حنیفو دو تین دن تک لنگڑا لنگڑا کر چلتا رہا اور ایک روز مجھ سے کہنے لگا "بی بی آپ کو معلوم ہے۔ ان کے پاس فٹ بھر لمبا جوتا ہوتا ہے اور اس میں میخیں بھی لگی ہوتی ہیں۔ تیل میں جھگو کر مارتے ہیں۔ بہت چوٹ لگتی ہے اور جی بہت گالیاں دیتے ہیں۔"

لیکن دو تین روز کے بعد وہ اپنی رسوائی اور پٹائی بھول گیا اور اس نے اپنی گرفتاری کو خاصا رومانوی رنگ دے لیا۔ ہاں ایک غم اسے مدتوں رہا ــــــ وہ ولائیتاں کی تصویر کے چلے جانے کا ــــــ ولائیتاں حنیفو کی منگیتر تھی ــــــ اور اس کی تصویر وہ کوٹ کی اندر کی جیب میں رکھتا تھا ــــــ یہ تصویر پولیس والوں نے جب اس کی جامہ تلاشی لی۔ تو پھاڑ ڈالی تھی ــــــ

دقار جب حنیفو کو گھر لے کر آیا تو اس نے کہا تھا ــــــ

"میں نے کہا تھا ناکہ کبھی کبھار پولیس والوں کو مرغیاں کھلا دینی چاہئیں ــــــ"

ــــــ وہ بہت عملی آدمی تھا۔

ایس۔ ایچ۔ او کا لفظ سن کر میرا دھیان اس وقت اُسی طرف گیا۔

"لیجئے۔ ایس۔ ایچ۔ او کا بھلا ملتھ ڈپو سے کیا واسطہ!!"

"ایس۔ ایچ۔ او سے ان کی مراد اسٹیشن ہیلتھ آفیسر سے ہے۔ بھلا آج چھٹی کے روز میں اُسے کہاں ڈھونڈوں کل بات کروں گی ــــــ" نین تارا مستقل ہم دونوں کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔

سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا کر دقار نے میری طرف دیکھا ــــــ "وہ کھول لو اپنی کتاب ــــــ"

میں نے واقعی کتاب کھول لی۔

ــــــ ایک شام بہت زبردست طوفان آیا ــــــ بہت بادل گرجے ــــــ اور بہت بجلی چمکی۔ موسلا دھار بارش ہوئی۔ سچ مچ بہت ڈر لگا ؎

دل کا یہ دشت عرصۂ محشر لگا مجھے
میں کیا بلا ہوں رات بہت ڈر لگا مجھے

کہانی پڑھتے پڑھتے مجھے ایک شعر یاد آگیا۔

اور پھر شہر کے دروازے پہ دستک ہوئی اور بوڑھا بادشاہ باہر گیا اور اس نے فصیل کا دروازہ کھولا

"کونسی کہانی ہے؟"

نین تارا نے اپنی بچی کے فراک پر ایمبرائڈری کرتے کرتے پوچھا ——

"ہے ایک ——"

میں نے نظر اٹھائی۔ وقار نہ جانے کب کا سوچکا تھا۔

—— وہ ایک شاہزادی تھی۔ جو باہر کھڑی تھی۔ لیکن خدا کی پناہ۔ بارش اور طوفان نے اس کا حلیہ بگاڑ رکھا تھا۔ اس کے بالوں سے بارش کا پانی بہہ رہا تھا۔ اور پانی اس کے جوتوں کے پنجوں سے اندر جا رہا تھا اور ایڑیوں کی طرف سے باہر نکل رہا تھا —— لیکن اس نے کہا کہ وہ سچ مچ کی شہزادی ہے ——

"—— یار یہ لوگ فلتھ ڈپو بنوالیں گے ——" وقار سوتے سوتے اس تیزی سے اُٹھا جیسے بہترین قسم کی شمپئن کھولو۔ تو کارک اُچھل کر باہر گرے۔

وہ دروازے دھڑ دھڑاتا ہوا گولی کی طرح سے باہر چلا گیا —— نین تارا نے دریچے کا پردہ ذرا سا ہٹایا۔

"کیا کرتی ہو۔ بہت ظالم قسم کی دھوپ ہے۔ پردے برابر کردو۔"

"میں دیکھ رہی ہوں۔ یہ شخص کیا کرتا ہے —— اچھا میں باہر جاتی ہوں۔"

—— نین تارا وقار کے پیچھے چلی گئی۔

—— خیر ہمیں بہت جلد پتہ چل جائے گا کہ یہ اصلی شہزادی ہے یا نہیں۔ بوڑھی ملکہ نے خود سے کہا۔ اس نے پلنگ پر سے بستر ہٹایا اور نیچے ایک مٹر کا دانہ رکھ دیا۔ پھر اس نے اس مٹر کے دانے پر بیس گدّے بچھائے اور ان گدوں پر بیس لحاف رکھے ——

وقار ضرور فلتھ ڈپو ختم کروا دے گا۔

میں نے کہانی پڑھتے پڑھتے سوچا۔ در اصل یہ آبا کے بس کا روگ نہیں۔

مجھے ہنسی آگئی۔ زندگی میں کتنے بہت سے کام ہیں۔ جو آبا کے کرنے کے نہیں ہیں۔ بہت سے ایسے کام ہیں۔ جن پر امی سر ہلا کر کہہ دیتی ہیں "چھوڑیے آپ کے بس کا روگ نہیں، آپ تو بس

وہی پڑھا کیجئے۔ اپنی قانون کی کتابیں ـــــ اور دیوان غالب اور شیکسپیئر ـــــ"

شیکسپیئر سے امی کافی تنگ تھیں۔ کیونکہ ابا بات بے بات اسے کوٹ کرتے رہتے تھے۔

اور نین تارا نے ایک بار کہا تھا ـــــ

"ابا شریف ہیں۔ تو پارٹنرز ہمیں کیا فائدہ پہنچا ـــــ سوائے اس کے کہ لوگ واہ واہ کریں ـــــ ٹھیک ہے۔ لوگ بہت تعریف کرتے ہیں کہ واہ تمہارا باپ کتنا شریف آدمی ہے۔ لیکن ہم نے زندگی میں کتنے دکھ اٹھائے۔ اب مجھے اطمینان ہے ـــــ میری بیٹی کو زندگی میں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ سب لوگ اس کے باپ سے ڈر کر رہیں گے ـــــ"

اک عمر گزر گئی۔

خدا جانے باہر کیا ہو رہا ہے ـــــ میں نے کاہلی سے سوچا۔

بہت دیر تک میں خیال و خواب کے تانے بانے میں اُلجھی رہی۔ اور کچھ سوچا کی۔

نین تارا کے قدموں کی چاپ کمرے کے قریب آئی۔ اور وہ اندر آکر پھر قالین پر کُشن کے سہارے بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد وقار بھی آگیا۔ اس کی عقابی آنکھوں میں غصے کی جھلک تھی۔

بیٹھنے سے پہلے اس نے جیب سے ایک رومال نکال کر اپنے جوتے صاف کئے ـــــ

"باہر بہت دھول ہے ـــــ" اس نے کہا ـــــ" اور گھر سے گیٹ تک کی سڑک بھی بہت طویل ہے۔"

"درختوں اور بیلوں کا سایہ بھی تو ہے ـــــ" ـــــ یہ کہہ کر میں نے پھر کتاب اٹھالی۔

ـــــ اور اس بستر پر شہزادی کو رات گزارنا پڑی۔

صبح کو انھوں نے اس سے پوچھا کہ رات کیسی گزری ـــــ؟

بہت بُری ـــــ رات بھر میں نے پلک تک نہیں جھپکی ـــــ

خدا جانے اس بستر میں کیا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میں اینٹوں پر لیٹی ہوں۔

ـــــ مرا تمام بدن نیلا پڑ گیا ہے ـــــ

کیسی خوفناک بات تھی ــــ

"وقار نے وہ قصہ ہی ختم کر دیا ــــ"

"کونسا قصہ ــــ" ممی نے کتاب پر سے نظر اُٹھا کر پوچھا ــــ

"لیجئے یہ قصہ ہی بھول گیئں ــــ یہ قصہ تو شروع ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر وقت پر تم لوگوں نے کوئی قدم اُٹھایا ہوتا ــــ"

"وقار نے ان مزدوروں کو خوب گالیاں دیں، اور انہوں نے فٹافٹ وہ گڑھا جو وہ نلکہ ڈپو بنانے کے لئے کھود چکے تھے ــــ پُر کر دیا اور اب وہ اپنا سامان اُٹھا کر چلے گئے ہیں، کچھ اینٹیں پڑی ہیں۔ وہ کل لے جائیں گے ــــ" نین تارا نے وضاحت کی ــــ "اور میں نے تو بہت کم گالیاں سنیں۔ دراصل میں شرمندہ ہو کر اندر آگئی تھی۔ زیادہ فصیح و بلیغ گالیاں تو میرے بعد دی گئی ہوں گی۔ انتہائی غیر پارلیمانی۔"

"اور اگر وہ کل اینٹیں لے کر نہ گئے۔ تو میں آدمی بھیج کر اُٹھوا لے جاؤں گا ــــ یہ لوگ گالیوں کی زبان سمجھتے ہیں، ان سے انھیں کی زبان میں بات کرنا چاہیئے۔ آپ جناب کہنے سے کام نہیں چلتا۔ ــــ میں اُن کی کدالیں بھی اٹھوا لایا ہوں۔ وہ فی الحال گرفتار رہیں گی۔"

ــــ وقار نے فخر سے کہا ــــ اور وہ ریشمی رومال جس سے وہ ناخن پالش کر رہا تھا۔ تہہ کر کے کرتے کی جیب میں رکھ لیا ــــ

"کیا گالیاں دیں؟ ــــ اور کس کو دیں؟" ــــ میں نے ولگر قسم کے تجسس کا اظہار کیا۔

"اب تم میری زبان نہ کھلواؤ، سبھی کو دیں ــــ ہمسائے بھی لپیٹ میں آگئے۔ دراصل وقار کا موڈ تو گیٹ کے عین سامنے گڑھا دیکھ کر ہی آف ہو گیا تھا۔ لیکن وہ کچن گارڈن کی طرف گئے۔ تو وہاں سید منظور حسین کے ملازموں نے پھلوں کے چھلکے پھینک رکھے تھے ــــ بس ان کا پارہ چڑھ گیا، پہلے تو انہوں نے ان کے ملازم کو بلا کر وہ چھلکے اٹھوائے اور پھر خوب چلا کر کہا کہ میں شام کو دس پندرہ آدمی لے کر آؤں گا اور انہوں نے ان آدمیوں کا رشتہ سید منظور حسین کی ماں بہنوں کے

ساتھ جوڑا ــــ"

"تم لوگ دراصل بہت سہل پسند اور آرام طلب ہو۔ اب میں چلتا ہوں۔ شام کو چکر لگاؤں گا۔"
ــــ وقار نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

مزدور معلوم نہیں کہاں چھپ کر دیکھ رہے تھے۔ وقار کے جاتے ہی مینا ان کا پیغام لے کر آیا۔
"بی بی وہ مزدور کہتے ہیں، اب تو وہ صاحب چلا گیا، جو گالیاں دیتا ہے۔ ہماری کدالیں۔ واپس کر دیں ــــ ہم غریب آدمی ہیں ــــ"

"دے آؤ بیٹے ــــ" ــــ میں نے آہستہ سے کہا۔

"یہ لوگ وقار سے کتنے خوفزدہ ہو گئے ہیں۔ اس کی موجودگی میں آنے کی ہمت نہیں ہوئی اس نے خاں صاحب سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ بندوق تیار رکھو۔ ایک آدھ کا خون ہوتا ہے تو ہونے دو ــــ تم نے دیکھا، ٹھیکیدار بھی ڈر کے مارے نہیں آیا۔ اس کی عمارت ہی لمبی ہو گئی ــــ" نین تارا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ــــ دراصل غنڈہ گردی کا ایک اپنا مقام ہے" ــــ نین تارا نے عقل مندی سے سر ہلایا۔

وقار ٹھیک ہی تو کہتا ہے ــــ ہم لوگ بہت سہل پسند ہیں۔
ــــ میں نے افسردگی سے سوچا ــــ یہ سہل پسندی ہی تو تھی ــــ جس سے مجبور ہو کر ناشتے کے وقت میں نے صبح کے اخبار پڑھ کر جلدی سے تہہ کر کے ایک طرف رکھ دیے تھے۔ اور آہستہ آہستہ چائے پیتی رہی تھی۔

"کیا خبر ہے؟" ــــ ابا نے نیند بھری آنکھوں سے مجھے دیکھ کر کہا۔
"جی کچھ نہیں۔ سرگودھا میں ایک وکیل پکڑا گیا۔"
"کیوں؟"

"وہ قانون کا امتحان پاس کئے بغیر سات برس سے پریکٹس کر رہا تھا۔ بار ایسوسی ایشن

کے صدر کو شبہ ہوا۔ اور اس نے کراچی یونیورسٹی کو لکھا۔ تو معلوم ہوا کہ بھائی صاحب ایل ایل بی کے امتحان میں فیل ہو گئے تھے ——"

"وہ پریکٹس بھی ایسی ہی کرتا ہو گا کہ فلاں مقدمہ میں تاریخ دیدیجئے" —— ابا بہت زور سے ہنسے میں نے انہیں اخبار کی اہم ترین خبر نہیں سنائی۔ ڈاکٹر رؤف یوسف نے کہا تھا۔ فکر اور غصہ اُن کے پاس نہیں پھٹکنا چاہیئے۔

اس لئے انھیں یہ بتانے سے کیا حاصل —— کہ ایران میں کچھ اور لوگوں کو گولی ماردی گئی

اور ان بہت سے مرنے والوں میں ایک شاعر بھی تھا۔

شاعر جو امن اور محبت کے گیت گاتے ہیں۔ عشق کا مضمون لکھتے ہیں اور حسن کی مدح کرتے ہیں۔

جو چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہو جاتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر رنجیدہ —— انسان کا دل آبگینے جیسا ہوتا ہے —— اور شاعر —— شاعر کا دل آبگینے سے بھی نازک ہوتا ہے۔

اور پھر کیا ہوتا ہے کہ دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے ان کا سینہ گولیوں سے چھلنی کر دیا جاتا ہے

—— اور پھر اسے یقین ہو گیا کہ وہ سچ مچ کی شہزادی ہے۔ جس نے بیس گدوں اور بیس لحافوں کے باوجود مٹر کے دانے کی سختی محسوس کی اور رات بھر سو نہ سکی —— ایک سچ مچ کی شہزادی ہی اتنی حساس ہو سکتی ہے ——

اور شاعر کا دل جو دنیا کے غم سہہ سہہ کر پہلے ہی پارہ پارہ ہوتا ہے۔ بالآخر دھڑکنا بند کر دیتا ہے۔

اک عمر کی جدوجہد ختم ہو جاتی ہے۔

—— تب شہزادے نے اس شہزادی سے شادی کر لی۔ کیونکہ اسے یقین ہو گیا تھا کہ بالآخر اُسے سچ مچ کی شہزادی مل گئی ہے۔

عجیب الطرفین —— اور مٹر کے اس دانے کو آرٹ میوزیم میں رکھ دیا گیا۔ جہاں اسے آج

بھی دیکھا جا سکتا ہے ـــــ اگر کسی نے اٹھا نہ لیا ہو ـــــ

لیکن دل جو گولیوں سے چھلنی ہوا، اُسے کسی آرٹ میوزیم میں نہیں رکھا گیا۔

اور ہم سہل طلب ہیں ـــــ میں نے آزردگی سے سوچا ـــــ اور پریوں کی کہانیاں پڑھتے ہیں۔

وقار سچ ہی تو کہتا ہے۔ یہ واقعی افیم ہے ـــــ لیکن اس نامہربان ـــــ دکھ بھری دنیا میں پریوں کی کہانیاں پڑھے بغیر جینا کتنا دشوار ہے ـــــ شاید اسے یہ خبر نہیں ـــــ

ـــــ اور یہ ایک سچی کہانی ہے ـــــ میں نے کہانی کا آخری جملہ پڑھا ـــــ

اور کیا اس تلخ اور سنگلاخ دنیا میں پریوں کی کہانیاں پڑھنے والوں کے نقش پارہ سکیں گے۔ ؟؟؟

ـــــ میں نے افسردگی سے سوچا۔

اور ہر انسان کی موت میرے وجود کے کچھ حصے کو ختم کر دیتی ہے۔ کیونکہ میں تمام انسانیت کا ایک حصہ ہوں!

اور جب گھنٹیاں بجیں۔ تو کسی کو یہ دیکھنے کے لئے نہ بھیجو کہ وہ کس کے لیے بج رہی ہیں!!

وہ تمہارے ہی لئے بج رہی ہیں!!!

کوئی پہلو سے اُٹھا آخرِ شب

بہت نمناک صبح تھی۔ میں نے اپنی برساتی پہنی اور کارن مارکیٹ (CORN MARKET) کی طرف چل دی۔

آج رستہ میں بائیسکلیں ____ رنگ برنگے فراک ____ رنگین قمیصیں اور سیاہ گاؤن نظر نہیں آ رہے تھے۔ ٹرم ختم ہو چکی تھی ____ اور آکسفرڈ پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔

پھولوں کی دکانوں کے آگے سے گزرتے ہوئے میں نے سوچا۔ یہاں کارن مارکیٹ میں مجھے صرف دو ہی چیزیں پسند ہیں ____ پھولوں کی دکانیں ____ اور کیفے جارجز (CAFE GEORGES)

کیفے جارجز قریب قریب چوبیس گھنٹے ہی کھلا رہتا تھا۔ یہاں بس ڈرائیور اور ٹرک ڈرائیور رکتے تھے۔ اور کافی پیتے تھے۔ اور ایگز اور بیکن (EGGS AND BACON) یا ایگز اور ساسجز EGGS AND SAUSAGES کھاتے تھے۔

کیفے جارجز کے سامنے پہونچ کر میں ایک لمحہ کے لئے ٹھٹکی ____ جاؤں یا نہ جاؤں ____ زندگی کا ایک باب ختم ہو چکا تھا۔ میں ورق اُلٹ کر اُسے دیکھنا نہیں چاہتی

تھی —— یادیں جو مجھے دیمک کی طرح کھا رہی تھیں اور تیز ہو جائیں گی۔

پچھلے آٹھ مہینے سے ہم دونوں ساتھ ہی یہاں آیا کرتے تھے — کافی پینے —— اور کبھی کبھار صبح کا ناشتہ بھی ہم یہیں کر لیا کرتے تھے —— یہاں آنے کے لئے ہم دلیا ہی اہتمام کرتے تھے جیسے ہم سیوائے SAVOY جا رہے ہوں۔ بے شمار دفعہ دھلے ہوئے بدرنگ لباس اور رنگت اُڑی ہوئی سوئٹریں —— لمحے نشتر بن کر میرے دل میں اتر آئے۔ اور یادوں کے دریچے وا ہو گئے۔

—— ہاں لیکن اولڈ لیڈی فٹس جیرلڈ —— FITZGERALD نے کہا تھا۔

"اسے بھولنے کی کوشش نہ کرنا۔ یہ تم دونوں کے ساتھ زیادتی ہوگی —— پُرمسرت لمحوں کو بھلانا اپنے بس کی بات نہیں ہوتی —— اور ایسی کوشش کرنا کوئی اچھی بات بھی نہیں —— اُسے مہربانی سے یاد رکھنا۔"

—— میں نے دروازہ کھولا۔ کیفے جارجز کا مالک تھامسن مجھے دیکھ کر مسکرایا۔

"ہیلو مسٹر تھامسن —— ایک کافی پلیز۔"

"مس کے لئے کافی ——" مسٹر تھامسن نے ویٹرس سے کہا۔

کافی کا مگ لے کر میں ایک میز پر جا بیٹھی۔ اور پلاسٹک کے سرخ چیک ڈیزائن والے میز پوش کو یوں گھورا۔ جیسے اُسے پہلی دفعہ دیکھ رہی ہوں۔

"ہیلو میٹ - HELLO MATE" —— ایک ٹرک ڈرائیور جس سے ہم اکثر گپ لڑایا کرتے تھے۔ اپنا مگ لے کر اسی میز پر آن بیٹھا۔

"ہیلو" —— میں نے کہا ——

کیفے جارجز اپنی جگہ موجود ہے۔ ہر چیز ہی اپنی جگہ موجود ہے۔ صرف میری زندگی اور میری دنیا ہی ٹاپسی ٹروی TOPSY TURVY ہو گئی ہے۔

"آج مسٹر فس جیرلڈ نہیں آئے" ــــ مسٹر تھامسن بھی اپنا مگ سنبھال کر اسی میز پر آگئے۔

ــــ ہاں آج میں تنہا ہوں۔ جب کہ پچھلے چند مہینوں سے میں کبھی تنہا نہیں آئی تھی۔

"نہیں وہ نہیں آئے۔"

ــــ اب وہ کبھی نہیں آئے گا ــــ میں نے خود سے کہا ــــ اس کی قربت کی مہک اور گرمی میری زندگی سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی۔

اور کتنی ہی بکھری بکھری تصویریں میرے ذہن میں اُلجھ گئیں۔

ــــ وہ لندن کی ایک شام تھی۔ ٹونی کے ہاں پارٹی تھی۔ جو ٹونی اور لامنٹ نے مشترکہ طور پر دی تھی ــــ بہت رنگین ــــ بہت خوبصورت ــــ صرف ایک ہی خامی تھی ــــ لڑکے زیادہ تھے اور لڑکیاں کم ــــ ہم سب نے بہت شیری پی تھی اور رات کے دو بجے تک رقص کرتے رہے تھے ــــ سوائے میرے سبھی لڑکیاں ایک ایک کر کے رخصت ہو گئی تھیں ــــ اور سب سے زیادہ خوش وہ دو نیپالی لڑکے تھے جو ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے ناچ رہے تھے۔

ــــ اور ٹونی نے ایک ریکارڈ بجایا تھا۔

"تم چودھویں کا چاند ہو تم آفتاب ہو"

اور وہ آواز سے آواز ملا کر گا رہا تھا ــــ اس کی کوشش تھی۔ کہ وہ فارن سروس میں چلا جائے۔ اس لئے وہ مختلف زبانیں فلمی ریکارڈوں کے ذریعہ سیکھنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔

رقص کرتے کرتے میں نے اپنے ہم رقص سے کہا ــــ "اب میں ذرا بیٹھوں گی" ــــ خزاں کے پتّوں کے رنگ جیسے قالین پر ــــ جسے لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا گیا تھا ــــ بیٹھ کر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

——۔ اچانک ایک لڑکا سبز رنگ کا کشن ہاتھ میں لئے میرے پاس آیا اور اس نے میرے قریب بیٹھتے ہوئے مجھے اپنا نام بتا کر کہا ——

"تم آکسفرڈ میں پڑھتی ہو ؟"

"ہاں"

"مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔"

"کیا بتاؤں —— اس دنیا میں کمیونی کیشن COMMUNICATION ممکن نہیں"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یہ کلیشے ہے۔" —— اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"ٹونی تمہاری فارن سروس کا کیا بنا ؟" —— میں نے پکار کر پوچھا۔

—— ٹونی نے بغیر جواب دیے ریکارڈ تبدیل کر دیا ——

میرے قریب بیٹھے ہوئے اس شخص نے اپنا سنجیدہ چہرہ اٹھا کر مجھے دیکھا اور سر کے اشارے سے مجھے منع کیا۔

"یہ اس کا دکھتا ہوا زخم ہے" —— اُس نے آہستہ سے مجھ سے کہا ——

"اور دکھتے ہوئے زخموں کو کریدنا اچھی بات نہیں ہوتی" ——

رقص کی موسیقی پھر شروع ہو گئی تھی۔ اور لامنٹ کے ساتھ رقص کرتے ہوئے یں نے سوچا ——

کتنی خوبصورت اور پر مسرت شام ہے —— زندگی سے بھرپور ——

دونوں نیپالی طالب علم زیادہ تیزی سے گھوم رہے تھے۔ اور خوشی کے مارے باؤلے ہوئے جا رہے تھے۔

"ہلئے شیری ختم ہو رہی ہے۔ پب (PUB) بند ہونے سے پہلے میں جلدی سے اور شیری لے آؤں" —— لامنٹ مجھے چھوڑ کر شیری لینے قریب ترین پب کی طرف دوڑا۔

—— وہ سبز کشن اُٹھا کر پھر میری طرف آیا —— لیکن لیزلی میرا ہاتھ تھام کر مجھے اپنی پارٹنر کلیم کر چکا تھا۔

—— اور پھر شاید صدیاں ہی بیت گئیں۔

—— وہ ایک اور پارٹی تھی۔ ٹونی جیسی ہنگامہ والی پارٹی نہیں۔ بلکہ بہت باوقار بہت رکھ رکھاؤ والی —— سر ولیم اور لیڈی ہیٹر SIR WILLIAM AND LADY HAYTER کے گھر ——

"آؤ آؤ" —— لیڈی ہیٹر نے مجھے خوش آمدید کہا —— اور ارد گرد کھڑے ہوئے دو تین لوگوں سے میرا تعارف کروایا ——

ایک انتہائی بور —— چشمے والا طالب علم اپنی نلیٹ آواز میں مجھے بتا رہا تھا۔ کہ اس نے اب تک کتنے ڈراموں میں کام کیا ہے۔

وہ ایش ٹرے لینے کے لئے میز کی طرف بڑھا۔ اور اچانک میرے سامنے بکھرے ہوئے بالوں کو ہاتھ سے سنوارتا ہوا ایک شخص آیا ——

"کیا تم لانسٹ اور ٹونی کی دوست نہیں ہو؟" —— اس نے اس انداز سے پوچھا۔ جیسے کوئی یہ پوچھے۔ کہ آپ بیئر پئیں گے یا شیری ——

اسے پہچان کر میں ایک دم مسکرا دی —— ارے یہ تو وہی شخص ہے جس نے سبز کشن ہاتھ میں اُٹھائے اُٹھائے اس شام تین چار بار مجھ سے گفتگو کرنے کی کوشش کی تھی۔

—— ہاں ہم لندن میں ملے تھے ——

وہ بور طالب علم مجھے معروف دیکھ کر ایش ٹرے ہاتھ میں لئے دوسرے کراؤڈ کی طرف چلا گیا۔

—— اور اس نے مجھے بتایا۔ کہ اب وہ یہاں ڈی۔ فل۔ D. PHIL کرنے آیا ہے۔

"بیچ میں تم کیا کرتے رہے؟"

"میں افریقہ میں ملازمت کر رہا تھا۔"

"تمہارا مضمون کیا ہے ؟"

"زولوجی ۔"

میں نے غور سے اُسے دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی دیانت دار شربتی آنکھیں تھیں۔ اور شربتی رنگ کے بال اس کی پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ بہت دراز قد تھا۔ اور مجھ سے بات کرنے کے لئے اسے تھوڑا جھکنا پڑتا تھا۔

" لامنٹ مانچسٹر میں ریسرچ کر رہا ہے !" ——

" تم اسے خط لکھو تو لکھ دینا کہ وہ یہاں آئے —— اسے ٹھہرنے کی تکلیف نہیں ہوگی۔ وہ میرے پاس ٹھہر سکتا ہے ۔" —— اس نے مجھے کوٹ پہننے میں مدد دیتے ہوئے کہا۔

"میں تمہارا نام بھول گئی ہوں" —— میں نے ندامت سے کہا ——

—— "کرسٹوفر —— کرسٹوفر FITZGERALD یہ کہتے وقت اس کے چہرے پر سایہ سا آگیا تھا ——

"—— آج یہ بہت چُپ چُپ ہے !"

ٹرک ڈرائیور کی آواز کیفے میں گونجی۔ ویسے اپنی طرف سے وہ زیرلب بات کر رہا تھا۔

—— یادیں بھی زندگی کی طرح کچے دھاگے سے بندھی رہتی ہیں۔ ایک جھونکا —— اور دونوں چیزیں ٹوٹ جاتی ہیں ——

میں نے یادوں کا سلسلہ جہاں سے ٹوٹا تھا۔ وہیں سے پھر جوڑنے کی کوشش کی ——

—— ٹرف ٹیورن (TURF TAVERN) کی وہ شام —— جب میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ داخل ہوئی —— اور ایک میز پر وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اور پھر وہ دونوں اپنے اپنے بیئر کے مگ لے کر ہماری میز پر آگئے تھے —— اور ہم نے سب کا تعارف کروایا —— اور کتنی بہت سی باتیں کیں ——

"کل میں گھر جا رہا ہوں" —— اس نے کہا

"گھر کہاں ہے ؟"

اس نے پتہ بتایا ——

"پتہ تو ٹھیک ٹھاک ہے۔" میں ہنستے ہوئے کہا ——

—— اور میں نے لندن کی اس گزری ہوئی شام کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی ——

اور سب لوگوں کو پورا قصہ سنایا ——

"یعنی اس نے تمہیں جواب دینے کی جرأت کی —— یہی مطلب ہے نا تمہارا ——

کتنی بڑی بات —— ہے نا !" اور چلتے وقت اپنا کوٹ اٹھا کر میں نے بڑے تحکمانہ انداز سے

اس کی طرف بڑھایا ——

اس نے خاموشی سے مجھے کوٹ پہنایا —— اور ہم سب باہر نکلے —— رستہ میں سب

لوگ ایک ایک کر کے رخصت ہوتے ۔ اور صرف وہی میرے ساتھ کوئین الزبتھ ہاؤس تک پہنچا ۔

اس نے پہلے گھڑی دیکھی ۔ اور پھر میرے کمرے کا دروازہ کھولا ۔

"تم کافی پیو گے ؟" —— میں نے پوچھا ——

اس نے ایک دفعہ تکلفاً بھی انکار نہ کیا ۔

اندر جاکر وہ سنہرے رنگ کی ویلوٹ کی اس انتہائی آرام دہ کرسی پر بیٹھ گیا تھا ۔ جو میں نے

ہیس شنگ میں ایک کباڑیے کی دکان سے خریدی تھی ۔

"—— ڈلیوری مفت تھی" —— میں نے فخر سے اسے اطلاع دی ۔

وہ مسکرایا ۔ اور پھر اس نے کہا ۔

"اگر تم اپنا کوٹ میری طرف نہ بھی بڑھاتیں —— جب بھی میں تمہیں کوٹ پہننے میں مدد

دیتا ——"

میرا منہ پھول گیا ——

—— ایک لیس ڈرایور ایگز اور بیکن کی پلیٹ لے کر میز پہ آگیا ——

"میں ابھی ابھی آٹھ گھنٹے کی ڈرائیونگ کر کے آ رہا ہوں"

پھر اس نے ادھر اُدھر نظر دوڑائی ——— "آج تمہارا بوائے فرینڈ نظر نہیں آ رہا" ———

——— ہاں وہ نظر نہیں آ رہا ———

اب کبھی اس کے بازو میرے شانوں کے گرد تنگ نہیں ہونگے ——— اب کبھی وہ رف ٹوئیڈ

کا کوٹ میرے رخساروں کو نہیں چھوئے گا ———

کوئی چلا کر مجھ سے یہ نہیں کہے گا ———

"تم ایموشنل چیٹ EMOTIONAL CHEAT ہو اور تم بہت کرافٹی CRAFTY ہو"

——— لیکن پہلی بار میرے کمرے میں بیٹھے ہوئے اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ صرف

اس کی گہری آنکھیں اور گہری ہو گئی تھیں ——— اور اس نے میرے بالوں پہ پیار سے ہاتھ رکھ

کر کہا تھا۔

"تمہیں معلوم ہے۔ تم میں بڑی نسائیت ہے۔ اور تم بہت ویگ VAGUE سی لڑکی ہو"

——— مجھے یہ بات بہت انوکھی اور بہت اچھی لگی تھی ———

تم روح کے کن گوشوں میں جھانک رہے ہو؟ ——— میں نے حیرت سے سوچا تھا۔

——— اور اس نے جیسے میرے دل کی بات سمجھ لی ——— "اوہ وہ تمہاری تیزی اور

خود مختاری ——— وہ تمہارا اُوپر کا خول ہے۔ ایک طرح کا ڈیفنس میکانزم ———

DEFENGE MECHANISM ——— اور تمہیں دیکھ بھال کی بہت سخت ضرورت ہے"

اس نے مجھے غور سے دیکھا ———

——— اس تنہا ——— تاریک ——— اور سرد مہر دنیا میں اب کون میری دیکھ بھال

کرے گا ——— اس نے ایک دفعہ بھی میرے بارے میں فکر نہ کی ——— فکر کرتا تو کیا وہ

یوں چلا جاتا ——— بغیر خدا حافظ کہے ——— آخری لمحے تک ہدایات دیے بغیر ———

——— اور وہ کتنا خفا ہو گیا تھا۔ رات کے نو بجے مجھے کوئین الزبتھ ہاؤس کے

کورنیڈور میں ہاؤس کوٹ میں دیکھ کر ——

"یہ کتنی غلط بات ہے۔ تم یوں گھوم رہی ہو۔ جیسے یہ تمہاری خواب گاہ ہو۔ یہاں مرد بھی رہتے ہیں۔"

"تو پھر کیا ہوا؟" ——

"تمہیں معلوم نہیں۔ مرد بہت کمزور ہوتے ہیں۔"

"اچھا میرا خیال تھا۔ وہ بہت مضبوط شخصیت کے مالک ہوتے ہیں۔"

ربش اینڈ نان سنس RUBBISH AND NON SENSE

"یہ تمہیں کس نے بتایا —— تمہارے کسی احمق دوست نے —— یا شاید تم نے کسی ویمنز میگزین میں پڑھا ہے ——"

"شور مت مچاؤ —— لوگ سنیں گے ——"

"میں چاہتا ہوں۔ وہ سنیں ——"

"تمہیں شاید اپنی ریپوٹیشن REPUTATION کی فکر ہے۔"

"مائی ریپوٹیشن بی ڈیمنڈ MY REPUTATION BE DAMNED میں تمہاری ریپوٹیشن کے بارے میں فکر مند ہوں" ——

—— اور پھر وہ دن آیا۔ جب اس نے کہا تھا "تم مجھ سے شادی کب کرو گی؟"

"کیا تم پروپوز کر رہے ہو؟" —— میں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔ —— "تو اور کیا جھک مار رہا ہوں" ——

تب میں نے اسے سنجیدگی سے بتانا چاہا تھا۔ کہ ہمارے درمیان کتنی بڑی خلیج حائل ہے رنگ کی —— نسل کی —— مذہب کی —— اور پھر

اے پیر آف دی ریلم A PEER OF THE REALM کا بیٹا —— اور ایک پروفیشنل کلاس کے شخص کی بیٹی ——

میرا باپ صرف ایک ڈاکٹر ہے —— پروفیسر آف میڈیسن —— ہارٹ اسپیشلسٹ ——

ٹھیک ہے۔ اسے شہرت ملی ۔ اور عزت ملی —— اور روپیہ کی طرف سے فراغت —— لیکن اُس نے آغاز شباب میں کتنی جدوجہد کی۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس کلاس کا سرمایہ اس کا ذہن اور ہاتھ ہوتے ہیں۔ جب تک وہ ساتھ دیں۔ سب کچھ ہے۔ اور پھر کچھ نہیں ——

اور تمہیں معلوم ہے۔ میرے باپ نے کبھی LEISURLY زندگی نہیں گذاری ۔ انھیں کبھی اتنی فرصت ہی نہیں ملی۔ کہ وہ شام کو برج کھیل سکیں۔ یا گولف —— یا بلیرڈ کی ایک گیم —— زندگی میں ان کی سب سے بڑی عیاشی بستر میں ناشتہ کرنا ہے۔ اور کبھی کبھار تو انھیں وہ بھی نصیب نہیں ہوتا۔

کوئی مریض اچانک سیریس ہو جاتا ہے۔ اور وہ جلدی جلدی لباس تبدیل کر کے چلے جاتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو وہ شب خوابی کے لباس کے اوپر ڈریسنگ گاؤن پہن کر چلے جاتے ہیں۔

"دو یا پانچ منٹ سے کیا فرق پڑے گا ابا" —— میں نے ایک دفعہ کہا ——

"ایک لمحہ سے بھی فرق پڑ جاتا ہے بیٹا" —— انہوں نے تحمل سے کہا۔

"زندگی اور موت میں بہت مختصر سا فاصلہ ہے۔"

—— اور جب ان کا کوئی مریض چل بستا ہے۔ تو وہ بہت دن چپ چپ رہتے ہیں۔ اور ہم لوگ دبے قدموں سے گھر میں چلتے ہیں —— جیسے موت ہمارے ہی گھر میں ہوگئی ہو۔ چند دن بعد وہ خود ہی ذکر کرتے ہیں۔ اور تاسف سے اپنا سر ہلاتے رہتے ہیں۔

اور ایک روز انہوں نے اپنے ایک مریض کے چیک اپ کے بعد بہت خوش ہو کر کہا۔

"اب تم بالکل ٹھیک ہو" ——

اور وہ ہسپتال کے گیٹ سے باہر نکلا۔ اور سڑک پر گر کر مر گیا —— —— اس روز وہ گھر آن کر بہت دیر تک آنکھیں بند کر کے لیٹے رہے۔

تین روز وہ چپ رہے —— اور چوتھے روز کہنے لگے "—— یعنی میں نے خود اس کا الیکٹرو کارڈیو گرام کیا۔ وہ بالکل ٹھیک تھا۔ لیکن یہ دل کے مریض ——" انہوں نے سر ہلایا

— "اور پھر چالیس برس کی عمر سے پہلے یہ مرض زیادہ ہی خطرناک ہوتا ہے۔ شکر ہے۔ وہ غیر شادی شدہ تھا" — انہوں نے سیاہ بادلوں میں ایک ستارہ ڈھونڈھنا چاہا —

اور دل کے مریضوں کا علاج کرتے کرتے وہ خود دل کے مریض ہو گئے ہیں۔ لیکن خیر یہ OCCUPATIONAL HAZARDS ہیں۔

اور میں کبھی کبھار سوچتی ہوں۔ ان کے دل پہ کیا گزرتی ہوگی۔ جب وہ اپنے مریضوں کو مشورہ دیتے ہوں گے —

"زندگی کو ہنسی خوشی بسر کرو۔ زیادہ سنجیدگی سے مت لو۔ اور ابھی کچھ عرصہ کام نہ کرو" جب کہ ان کو اچھی طرح معلوم ہے۔ کہ دنیا میں ایسے لوگ زیادہ ہیں جن کا گزارہ بغیر کام کئے نہیں چل سکتا —

ذرا سوچو۔ ایسے شخص کی بیٹی تمہیں کیسے سمجھ سکے گی۔ تم جو سات صدیوں سے آئرلینڈ میں پچاس ساٹھ ایکڑ میں گھرے ہوئے گھر کے مالک ہو۔

— جس کا میں صرف تصور کر سکتی ہوں — طویل ڈرائیو — خوبصورت پارک — اپنا جنگل — اپنی جھیل — اور اپنا آبشار —

اور پھر آئرش ارسٹوکریسی کے درمیان ایک سیاہ فام لڑکی —

"تم سیاہ فام نہیں۔ براؤن ہو — اور یہ رنگ آج کل فیشن میں ہے — اور پھر میں چھوٹا بیٹا ہوں" —

" ALL THE MORE REASON — کہ تم کوئی اچھا سا میچ ڈھونڈو — کوئی ایسی لڑکی — جو اپنے ساتھ اگر خطاب نہیں تو کم از کم بہت سی جائیداد لے کر آئے — چھوٹے بیٹوں کا مستقبل تو زیادہ غیر محفوظ اور غیر یقینی ہوتا ہے۔ میرے پاس کیا ہے —!"

"زندگی پنیر اور بسکٹ پر نہیں گزرتی۔" — میں نے عقلمندی سے سر ہلایا —

"میرے باپ نے یہ عقلمندی کی تھی۔ اور ایک انگریز سٹیل بیرن STEEL BARON

کی اکلوتی بیٹی کو بیاہ کر لائے تھے۔ لیکن انھیں کیا خوشی ملی ـــــ ان کا بڑا حساس اور خوبصورت چہرہ ہے ـــــ وہ میری دادی پر گئے ہیں لیکن میری دادی کی آنکھوں کے گرد مسرت کی لکیریں ہیں، جیسے پوپی کا پھول ذرا مرجھا جائے لیکن پھر بھی خوبصورت لگے ـــــ جبکہ میرے باپ کے لب جب مسکراتے ہیں، تو ایک عجیب طرح سے نیچے کو خم کھا جاتے ہیں ـــــ جس سے چہرہ کی اداسی اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔

ٹھیک ہے۔ آبائی زمین جائیداد جو رہن پڑی تھی۔ سب چھٹ گئی ـــــ اور آبائی گھر ـــــ"

"تمہارا مطلب ہے ـــــ کاسل" ـــــ میں نے بات کاٹی۔

"کاسل ہی کہہ لو" ـــــ اس نے جھنجھلا کر کہا۔

"ہاں تو آبائی گھر جو بوسیدہ ہو رہا تھا۔ پھر سے جگمگا اٹھا ـــــ رینوویشنز کی گئیں۔ ایک ونگ کا اضافہ ہوا۔ سنٹرل ہیٹنگ آگئی ـــــ ہر چیز MODERNIZE کر دی گئی ـــــ قالین جو بوسیدہ ہو گئے تھے۔ بدل دیے گئے ـــــ پرانے پردے جو کبھی بہت خوبصورت تھے۔ لیکن اب جن کے چیتھڑے اُڑ گئے تھے۔ ان کی جگہ ویلوٹ VELVET کے نئے پردوں نے لے لی ـــــ لیکن انھیں اس کی کتنی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی ـــــ وہ ہنسنا بھول گئے ـــــ میں وہ کہانی دھرانا نہیں چاہتا۔

ـــــ ہاں میں اپنے دادا کی سی غلطی کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے بھی ایک ڈاکٹر کی بیٹی سے شادی کی تھی۔ تمہارا باپ تو اسپیشلسٹ ہے۔ وہ تو صرف کنٹری جی۔ پی COUNTRY G.P. کی بیٹی تھی ـــــ لیکن ان دونوں کی کتنی بھرپور زندگی تھی۔ تم اندازہ بھی نہیں کر سکتیں ـــــ میری دادی تمہیں پسند کریں گی۔ اور میرے باپ سے تمہاری خوب نبھے گی۔

ـــــ ہاں میں اپنی ماں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا ـــــ ان سے تو میری بھی کم ہی بنتی ہے ـــــ ہم ایک دوسرے کو کبھی نہیں سمجھ سکے ـــــ اور پھر وہ چاہتی ہیں۔

کہ میں ڈیوک آف ٹرینٹ DUKE OF TRENT کی بیٹی سے شادی کروں — اور میرے بڑے بھائی سٹیفن کی بیوی مارگریٹ، — اس کے بارے میں بھی مجھے شبہ ہے۔ کہ تمہاری اس سے پٹ سکے گی۔" — اس نے سر ہلایا —

"تمہارا مطلب ہے۔ آنریبل سٹیفن فِس جیرلڈ —" میں نے بھنویں چڑھائیں

"تم کیوں ہر بات مذاق میں اڑا رہی ہو۔!"

"اور ڈیوک آف ٹرینٹ کی بیٹی — کیا نام ہے اس کا ؟"

"ہیلن"

"اوہ لیڈی ہیلن — کیا وہ تمہاری ماں کی کسی دوست کی بیٹی ہے ؟"

"نہیں ڈاوجیر ڈچس آف ترینٹ DOWAGER DUCHESS OF TRENT اور میری دادی دوست ہیں۔ دونوں بڑھیاں اگر ملاقات نہ ہو سکے۔ تو خط و کتابت ہی کے ذریعہ گپ کرتی رہتی ہیں — لیکن میری دادی کو ہیلن کچھ زیادہ پسند نہیں۔"

"لیڈی ہیلن کو یقیناً گھوڑوں اور کتوں سے بہت پیار ہو گا۔"

"اوہ وہ ٹھیک ہے۔ گریٹ فن اینڈ آل ویٹ GREAT FUN AND ALL THAT — لیکن ہم اسے ڈسکس DISCUSS نہیں کریں گے۔

— تمہیں اچھی طرح معلوم ہے۔ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔

سنو۔ زندگی میں کبھی دل بھی تو دھڑکتا ہے۔ اور جب وہ دھڑکتا ہے۔ تو رنگ — نسل — مذہب — اور قومیت کو نہیں مانتا — دل نے منطق کی بات کب سنی ہے۔ جو وہ میری سنے گا —!"

"تم موٹے ہو جاؤ گے" — میں نے اُسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا —

"وہ تو میں شاید نہ ہوں — ہاں تھوڑی سی ٹُنی نکل آئے گی۔"

"ہماری بڑی کیٹ اینڈ ڈاگ ایگزسٹنس CAT AND DOG EXISTENCE

ہوگی "۔ —— میں نے سرد آہ بھری ——

" وہی اچھی رہتی ہے ۔ اور میں تمہیں ٹھوک پیٹ کر ٹھیک رکھوں گا —— تمہارے باپ نے تمہیں جی بھر کے بگاڑا ہے ۔" ——

—— اور پھر ہم ہوائی جہاز میں ڈبلن گئے ۔ اور ایر پورٹ پر لموزین کھڑی تھی ۔

" گڈ آفٹر نون ماسٹر کرسٹوفر" —— شوفر کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا ۔ " گڈ آفٹر نون مس "

" گڈ آفٹر نون ہگنز HIGGINS تم ٹھیک ہو ——"

" جی بالکل —— اور آپ ——" —— شوفر کا خوشگوار آئرش لہجہ تھا

گاڑی شہر سے نکل کر دیہات کی طرف روانہ ہوئی ۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں —— اور اپنا سر سیٹ پر ٹکا دیا —— اس نے ایک کشن میرے سر کے پیچھے رکھ دیا —— یہ انتہائی پرکشش اور جاذب نظر شخصیت کا مالک شخص —— اُسے چھوٹی چھوٹی باتوں کا کتنا خیال رہتا ہے

اچانک مجھے اپنے ایک ٹیوٹر کی بات یاد آگئی ۔

چھٹیوں میں وطن سے واپس آکر میں نے کہا تھا ——

" ایشیائی مرد بہت گرم دل ہیں ۔ لیکن ذرا نکمے ہوتے ہیں —— خواتین سے بہت کام لیتے ہیں —— انگریز بہت کام کرنے والے ہیں —— بڑے SELF SUFFICIENT لیکن اتنے گرم دل نہیں —— اگر کسی طرح ان کا مکسچر MIXTURE بن سکے ۔"

میرے ٹیوٹر نے مجھے غور سے دیکھا اور کہا ۔

" آئرش وڈ ڈو " I RISH WOULD DO

اور کیسی عجیب سی بات تھی ۔ کہ ایک آئرش ہی چپکے سے میری زندگی میں داخل ہو گیا تھا ۔ اور مجھے پتہ تک نہ چل سکا ۔

ہم خود کو بھی اس طرح نہیں سمجھ سکتے ۔ جس طرح بعض PERCEPTION والے لوگ ہمیں سمجھ لیتے ہیں ۔

کرس نے آہستہ سے میرا شانہ چھوا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا ——
ہم چوڑے بل کھاتے چمکتے دریائے شینن SHANNON پر سے گزر رہے تھے۔
اس کے گرد بید مجنوں کے درخت جھکے ہوئے تھے۔
اُف کتنا خوبصورت دریا ——
—— میں نے اس منظر کو دل میں جذب کر لینا چاہا۔ اور اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام
لیا —— اس نے آہستہ سے —— نرمی سے —— اپنا دوسرا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا ——
بہت دیر کے بعد ہم مین روڈ کو چھوڑ کر ایک چھوٹی ہری بھری لین پر مڑ گئے
جس پر درخت جھکے ہوئے تھے۔
ایک چوراہا آیا —— جس کے آس پاس چند گھر تھے۔
ذرا آگے ڈاکخانہ تھا۔ اور TOBACONIST کی دکان —— پاس ہی ایک سبزی
کی دکان تھی —— اور ذرا دور ایک پٹرول پمپ تھا۔
کافی فاصلے پر ایک گرجا تھا —— جس کا SPIRE تمکنت سے اپنے اردگرد دیکھ رہا تھا
اور پھر بہت دیر کے بعد ایک دیوار آئی۔ جو دور تک چلی گئی تھی۔ اور جس کے ساتھ
پوپلر POPLAR کے درخت تھے
شوفر نے WROUGHT IRON GATE کے سامنے گاڑی روک کر ہارن بجایا ——
لاج (LODGE) سے ایک بوڑھی عورت دوڑتی ہوئی آئی۔ اور اس نے گیٹ
کھولا۔ دونوں جانب پلرز PILLARS پر گلاب کی بیل پھیلی ہوئی تھی۔
" ماسٹر کرسٹوفر —— " اس نے خوشی سے چیختے ہوئے کہا ——
—— " اور مس " —— اس نے کرٹسی کی۔
بہت طویل ڈرائیو کے بعد گاڑی رکی۔
ایک ملازم نے مسکراتے ہوئے ہمارا سامان اٹھایا —— اور بٹلر نے کرسٹوفر کو ایسے خوش

آمدید کہا۔ کہ مجھے ڈر تھا۔ وہ ابھی اس کو چوم لے گا ــــ

یقیناً ماسٹر کرسٹوفر ملازمین کے فیورٹ FAVOURITE تھے اور یہ کہ ان کی منگنی ایک ایشیائی لڑکی سے ہو رہی ہے ــــ یہ خبر بھی انھیں ملازموں کی نظروں سے گرا نہیں سکی تھی۔

"ہر لیڈی شپ اور باقی لوگ گرین ڈرائنگ روم میں ہیں ــــ"

ــــ بٹلر نے اطلاع دی۔

"مس کا سامان بلیو بیڈ روم میں" ــــ بٹلر نے ایک خادم کو حکم دیا ــــ

وہ حیرت بھری آنکھوں سے میری ساری دیکھ رہی تھی۔

خادمہ جو ایپرن اور ٹوپی پہنے ہوئے تھی۔ میرے پیچھے پیچھے ایک وسیع ہال میں داخل ہوئی۔

"میں رستہ دکھاتی ہوں مس ــــ آپ پہلے واش کریں گی، نا ــــ؟" ــــ اس نے قدم آگے بڑھاتے ہوئے لکڑی کے زینے کی طرف اشارہ کیا۔

ہم بلیو بیڈ روم میں پہنچے ــــ

"یہ سب سے خوبصورت گیسٹ روم ہے۔ ہر لیڈی شپ آپ کو پنک بیڈ روم میں بھیجنا چاہتی تھیں" ــــ اس نے بُرا سا منہ بنایا ــــ "لیکن اولڈ لیڈی فِس جیرالڈ ــــ FITZGERALD نے حکم دیا۔ کہ آپ کے لئے بلیو بیڈ روم تیار کیا جائے۔"

ــــ ہر لیڈی شپ کو کم از کم یہ خادمہ پسند نہیں کرتی تھی ــــ

اور کرس کا کہنا تھا۔ کہ اولڈ لیڈی فِس جیرالڈ کی ملازم پرستش کرتے تھے ــــ حالانکہ وہ ان کو خوب بلی BULLY بھی کرتی تھیں ــــ

میں نے بلیو بیڈ روم کو غور سے دیکھا ــــ یہ واقعی بہت خوبصورت کمرہ تھا۔ ہر طرف WOOD PANELLING تھی، اور اس کی چھت CARVED تھی۔

میں نے کرسی پر بیٹھ کر اپنے جوتے اتارے ــــ اور پیر فٹ سٹول پہ رکھ کر آنکھیں بند کر لیں ــــ

" جب آپ چائے کے لئے نیچے جائیں گی۔ تو میں آپ کا سامان ان پیک کر دوں گی"

خادمہ کی آواز نے مجھے چونکا دیا ——

"اچھا" —— میں نے آہستہ سے سر ہلایا ——

ایک بوہیمین زندگی کا اس رکھ رکھاؤ —— سلیقہ والی زندگی میں فٹ بیٹھنا کتنا مشکل ہے۔ خدا کا شکر ہے —— کہ کرسٹوفر چھوٹا بیٹا ہے —— اور زندگی کسی یونیورسٹی میں —— یا ادھر اُدھر کہیں اور گزارے گا ——

—— بس ڈرائیور نے اپنا ناشتہ ختم کر لیا تھا۔ اب اس کو سگریٹ کی طلب تھی۔ اس نے سگریٹ کا پیکٹ جیب سے نکال کر میری طرف بڑھایا —— میں نے ایک سگریٹ لیا —— مسٹر تھامسن نے جلدی سے لائٹر نکال کر ہم دونوں کے سگریٹ سلگائے ——

"کیا تمہارا اور تمہارے بوائے فرینڈ کا کوئی جھگڑا ہو گیا ہے ؟" —— ٹرک ڈرائیور نے مسکرا کر مجھ سے پوچھا ——

میں نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ کہ مسٹر تھامسن نے اس کا پیر دبایا۔ اور اشارے سے چپ رہنے کو کہا ——

"گلیڈس" —— میں نے ویٹرس کو آواز دی ——

"ایک کافی اور پلیز"

"یہ تمہارا تیسرا مگ ہے" —— گلیڈس نے قریب آتے ہوئے خفگی سے کہا ——

"مانا کہ تم کافی مچھلی کی طرح پیتی ہو۔ لیکن کوئی حد ہوتی ہے ہر چیز کی ——"

"گلیڈس پلیز —— نیگ NAGG مت کرو ——" —— میں نے لجاجت سے کہا۔

اور میں نے سوچا —— گلیڈس سچ ہی کہتی ہے۔ میں بہت کافی پیتی ہوں دراصل میری زندگی میں نہج کا رستہ کوئی نہیں ہے۔ ——

"تم نے آخری بار کھانا کب کھایا تھا؟" ——— مسٹر تھامسن نے پوچھا۔

"شاید اترسوں دوپہر کو" ——— میں نے سوچ کر کہا ———۔

"گیلڈس دو فرائیڈ انڈے ——— اور دو رول خوب اچھی طرح مکھن لگا کر ——— دس از آن دی ہاؤس THIS IS ON THE HOUSE ———

جو لڑکیاں کھانے کا تردد نہ کرتی ہوں ۔ ان کے ارد گرد رہنے والے مردوں کا کام ہے۔ کہ ان کے کھانے کا خیال رکھیں"۔ ——— انہوں نے اپنا اکلوتا بازو ہلاتے ہوئے کہا ——— ان کا ایک بازو دوسری جنگ عظیم میں کام آچکا تھا۔

"اور ویسے بھی اگر پیٹ بھرا ہوا ہو۔ تو زندگی کے سب تو نہیں ——— لیکن بہت سے دکھ کم ہو جاتے ہیں ۔"

مسٹر تھامسن کا فلسفے میں بھی دخل تھا۔

——— اور وہاں آہستہ آہستہ سیڑھیاں اتر کر میں گرین ڈائننگ روم میں پہونچی تھی اور بہت خوبصورت چاندی کی ٹی سروس اور B ONE CHINA کی پیالیاں تھیں۔

ہر لیڈی شب نے مجھے ناقدانہ نظروں سے سر سے پیر تک دیکھا ———

اولڈ لیڈی فس جیرلڈ نے ہاتھ آگے بڑھایا ———

"نوجوان خاتون ——— میرے قریب آؤ ۔ مجھے معلوم ہے۔ تم آج کل کی لڑکیاں خود کو خواتین کہلوانا پسند کرتی ہو۔ اخبارات یہی شور مچاتے ہیں. گو میں اخبار بہت کم پڑھتی ہوں ۔ کیونکہ وہ سب جھوٹ بولتے ہیں ——— میں ذرا مشکل سے اٹھ سکتی ہوں ۔ گھٹنوں میں کم بخت ایسا درد بیٹھ گیا ہے۔"

"——— JANE (جین) ———" انہوں نے کرس کی تیرہ سالہ بہن کو آواز دی۔

"ذرا میرا چشمہ ڈھونڈ کر لاؤ۔"

چشمہ ناک پر جما کر انہوں نے مجھے غور سے دیکھا۔ "تمہارا بہت دیانت دار چہرہ ہے۔" انہوں نے بڑی فیاضی سے کہا۔

"کرس ذرا ہمارا بیگ اُٹھا دینا۔" ——

اس نے میرا بیگ اُٹھا کر میرے قریب رکھ دیا۔

"ہم تو اسے کرسٹوفر کہتے ہیں۔" ہر لیڈی شپ نے بڑی تمکنت سے کہا۔ جیسے وہ کسی بورڈ میٹنگ میں پریذائڈ PRESIDE کر رہی ہوں۔

—— مجھے یاد بھی نہ تھا۔ کہ کرسٹوفر کب میرے لئے صرف کرس بن گیا تھا۔

جین جو میرے قریب بیٹھی تھی۔ اس کے کان سرخ ہو گئے ——

"بل —— چائے کے دوران یہ تمہارا چوتھا سگرٹ ہے۔" —— انہوں نے لارڈ ولیم فس جیرلڈ کو مخاطب کیا —— لارڈ ولیم فس جیرلڈ عرف بل نے جلدی سے سگرٹ ایش ٹرے میں بجھا دیا۔

—— لیکن جب وہ جھکے۔ تو میں نے دیکھا۔ ان کی گردن بھی جین کے کانوں کی طرح سرخ ہو گئی تھی۔

اولڈ آئرش سوور کی کٹلری جگمگا رہی تھی۔

آکسفرڈ میں تو ہم وول ورتھ WOOL WORTH کے چمچے استعمال کرتے ہیں —— میں نے سوچا۔

—— اور پھر شمعوں کی روشنی میں ڈنر ہوا۔ اور اولڈ لیڈی فس جیرلڈ نے اصرار کیا کہ میں لارڈ ولیم فس جیرلڈ کے دائیں ہاتھ بیٹھوں ——

—— اور ڈنر کے بعد اولڈ لیڈی فس جیرلڈ کرسٹوفر کے بازو کا سہارا لئے ڈرائینگ روم میں آئیں —— اور کافی پیتے ہوئے انہوں نے اپنا بایاں ہاتھ آگے بڑھایا۔

"تمہیں یہ انگوٹھی کیسی لگتی ہے؟"

انگشتری کے بیچ میں بڑا سا زمرد تھا۔ اور ارد گرد ہیرے جڑے تھے۔

"یہ بہت خوبصورت ہے۔"

"پچھلے ستاون برس سے یہ انگوٹھی اسی انگلی میں ہے۔ یہ کرسٹوفر کے دادا نے مجھے منگنی پر دی تھی
—— کرسٹوفر اس انگوٹھی کو کل ہی پالش ہونے کے لئے دے دو" ——

انہوں نے انگوٹھی اتار کر کرسٹوفر کی طرف بڑھائی۔ کرسٹوفر کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔
اس کی پسند APPROVE کی جا رہی تھی ——

—— اور اس نے مجھے اپنا لڑکپن کے زمانے کا کمرہ دکھایا تھا۔ —— ٹاور روم ——
جہاں ابھی تک دیواروں پر اس کے اسکول کے زمانے کے گروپ فوٹو لگے تھے۔ ایک الماری میں
فٹ بال تھا۔ اور کرکٹ کا بلا —— اور اوپر کے شیلف میں تصویروں کے البم —— ایک طرف
ایک ٹوٹی ہوئی FISHING ROD پڑی تھی۔ اور قالین خاصا بوسیدہ تھا —— یہ کس
قدر LIVED IN کمرہ تھا۔

—— اور شینڈلیرز کی روشنی میں بہت بھاری ریسپشن RECEPTION ہوا۔
شمپین پانی کی طرح بہی ——

ملازم مہمانوں کی خاطر مدارت کرتے رہے۔ اور پھر رقص شروع ہوا۔ اور لارڈ ولیم فس
جیرلڈ نے میرے قریب جھک کر مجھ سے رقص کی درخواست کی۔

اور جب رقص پورے عروج پر تھا۔ تو ملازم غائب ہو گئے۔
اور ہم نے جھانک کر دیکھا۔ وہ سب باہر گھاس پر رقص کر رہے تھے —— ان کے لئے
سائیڈر بھجوائی گئی۔

اور کرسٹوفر نے صبح کے سات بجے جب کھانے کے کمرے میں جا کر کافی کے دو مگ بنائے۔
اور ایک میرے سامنے رکھ کر دوسرا خود اٹھایا —— تو میں نے ہنستے ہوئے اس سے پوچھا ——

"اس سے پہلے تم نے کس کس کو آدھی رات کے وقت گلاب کے پھول دیے ——
اور کس کس کے ساتھ صبح کے چھ بجے تک شمپین پی؟ ——"

"شمپین بے شمار کے ساتھ پی —— پھول اس سے پہلے کسی کو نہیں دیے۔"——

۔ گلیڈس انڈے اور رول لے کر آئی ۔ میں نے ایک رول کو دو حصوں میں توڑا ۔

—— اور اس نے جاتے وقت کہا تھا ۔

" نہیں تم لندن تک مت آؤ ۔ تمہارا امتحان ہونے کو ہے ۔ بس اب میں تمہیں ڈبلن ایئرپورٹ پر ملوں گا۔

اور ہاں تمہاری سیٹ میں نے بک کروادی ہے ۔ بیل ٹریول سروس (BELL TRAVEL SERVICE) والے تمہیں کل ٹکٹ پہونچادیں گے ۔ وقت اچھی طرح سے دیکھ لینا ۔ اور فلائٹ نمبر بھی —— یہ نہ ہو کہ ایئرپورٹ پہنچ کر تمہیں پتہ چلے ۔ کہ فلائٹ تو چلی بھی گئی ——

اور امتحان کے لیے بیسٹ آف لک (BEST OF LUCK) —— اور ہاں دیکھو —— جب امتحان دینے جاؤ ۔ تو قلم لے جانا مت بھولنا —— تم سے کچھ بعید نہیں "

—— اور ڈبلن ایئرپورٹ پر لموزین موجود تھی —— لیکن وہ نہیں تھا ۔ لارڈ ولیم فنس جیرلڈ مجھے دیکھ کر آگے بڑھے —— اور شیفن نے میرے ہاتھ سے سوٹ کیس لے لیا ۔

" پیپرز ٹھیک ہو گئے ؟ " —— انہوں نے مجھ سے پوچھا ——

" جی ہاں "

" کرس نہیں آیا ۔" اِدھر اُدھر دیکھ کر میں نے پوچھا ۔

" تم گھر چلو " —— وہ کچھ گھبرا سے گئے ——

شوفر نے گاڑی کا دروازہ کھولا ۔

گاڑی گھر پہنچ کر رکی ۔ آج بھی جولی ہی نے گیٹ کھولا ۔

لیکن آج اس نے مجھ سے آنکھ نہیں ملائی ۔ بٹلر نے مجھے دیکھ کر خوشی سے ہاتھ نہیں ہلایا ۔

خادمہ نے خاموشی سے سوٹ کیس اُٹھایا ۔ اور صدر دروازے کی طرف بڑھ گئی ۔

میں نے باغ کی طرف دیکھا ۔

سبزے کے بیسیوں رنگ تھے —— خوش رنگ پھول کھلے تھے۔ فضا میں گلاب و یاسمن کی مہک ہر طرف بکھری ہوئی تھی۔

ایک مالی گلاب کی بیل جو پورچ پر پھیلی ہوئی تھی۔ ٹھیک کر رہا تھا۔ ہیڈ مالی کھرپی لئے مصروف نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ہیلو ولیمز" —— میں نے ہاتھ ہلایا۔ اور چلا کر کہا ——

وہ ذرا اونچا سنتا تھا ——

"گڈ آفٹر نون مس" —— اس نے سنجیدگی سے کہا —— ریسپشن سے پہلے اس نے مجھے بہت بڑا سرخ گلاب کے پھولوں کا انتہائی سلیقہ سے بنا ہوا گلدستہ دیا تھا۔

ہر چیز ویسی ہی تھی۔

لیکن ماحول میں کوئی چیز تھی۔ جو نامانوس تھی ——

میری سمجھ میں نہ آیا۔ یہ سب لوگوں کو کیا ہو گیا ہے ——

گرین ڈرائینگ روم میں ہر لیڈی شپ اپنی مخصوص کرسی پر اسی طرح گلیشیر کی مانند بیٹھی تھیں —— صرف ان کی رنگت ذرا زرد تھی۔

میں نے ادھر اُدھر نظر دوڑائی۔ جین غائب تھی۔

اولڈ لیڈی فنس جیرلڈ اپنی چھڑی کا سہارا لے کر اٹھیں —— اور آہستہ آہستہ میری طرف بڑھیں۔

"اس کو چائے پی لینے دیں۔" —— ہر لیڈی شپ نے کہا۔

"جب مجھے تمہاری رائے کی ضرورت ہوگی۔ تو میں تم سے مشورہ مانگ لوں گی کلیرا" ——

"مدر پلیز —— یہ تھکی ہوئی ہے۔ اسے ذرا آرام کر لینے دیں" ——

لارڈ ولیم فنس جیرلڈ نے عاجزی سے کہا۔

وہ سب کو نظر انداز کرتی ہوئی میرے قریب پہونچیں —— ان کی کمر پہلے کی نسبت

جھک گئی تھی۔ انہوں نے میری پیشانی پر بوسہ دیا ــــــ دو آنسو ان کی پلکوں پر چمک رہے تھے۔

"میرا خیال تھا۔ کہ میں اب عمر کی اس منزل کو پہنچ گئی ہوں ۔ جہاں اب کوئی دکھ نہیں پہنچ سکتا ــــــ اور تم ابھی اس منزل میں ہو۔ جہاں کوئی دکھ پہونچنا نہیں چاہیئے۔ یہ دونوں ہی مفروضے غلط تھے ــــــ"

"جین کہاں ہے ؟" ــــــ میں نے پوچھا ــــــ

"جین چرچ یارڈ میں ہوگی ۔"

"چرچ یارڈ میں ــــــ کیا کوئی برتھ نہ ہار ہے ۔ ؟"

"نہیں ــــــ وہ کرسٹوفر کی قبر پر گئی ہوگی ۔" ــــــ

"کرسٹوفر کی قبر ــــــ ؟" ــــــ میں نے احمقوں کی طرح سوال کیا ــــــ کہیں ان سب کا دماغ تو نہیں چل گیا ــــــ

لیکن جب کسی نے نظر بھر کر میری طرف نہ دیکھا ۔ تو میرا وجود جیسے سن ہو گیا ــــــ مجھے کسی غم کا احساس نہیں ہوا ۔ صرف ایسا معلوم ہوا کہ ایک لمحہ کے لئے زندگی رُک گئی ۔

میں نے کرسی کو مضبوطی سے تھاما ــــــ

"تمہارے امتحان کی وجہ سے ہم نے تمہیں اطلاع نہیں دی ۔ اسے تمہارے امتحان کی بہت فکر تھی ۔ اگر سٹیفن کی الیکشن کمپین ELECTION CAMPAIGN کا سوال نہ ہوتا تو وہ تمہیں کبھی چھوڑ کر نہ آتا ــــــ"

ــــــ کسی نے وضاحت کی ۔

لیکن کسی نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر ملائمت سے نہیں رکھا ــــــ کسی نے مجھے نہیں سمجھا ــــــ وہ شخص کہاں ہے ۔ جو میرے وجود کی شدت کو محسوس کرتا تھا ــــــ جس کے نرم ہاتھ کے پر سکون لمس سے میں مانوس تھی ــــــ جس کی بڑی بڑی سنجیدہ شربتی آنکھیں دل تک اتر کر ہر تاجان جاتی تھیں ــــــ

— اس کی قبر — یعنی وہ مر گیا — لیکن ابھی ایک ہفتہ پہلے وہ زندہ تھا

"وہسکی؟" — سٹیفن نے پوچھا —

"نہیں برانڈی" — لارڈ ولیم فِس جیرلڈ نے مشورہ دیا —

— نہیں میں نے کبھی وہسکی یا برانڈی نہیں پی ——

"ایک گلاس شیری پلیز —"

اس کی آنکھوں کا رنگ شیری کی طرح تھا۔

— وہ یہاں پہونچا۔ اور اگلی صبح رائیڈنگ کے لئے گیا۔ اور گھوڑے سے گر پڑا

جب اس کا کتا بھونکتا ہوا آیا۔ تو سٹیفن گیا — اس وقت ابھی زندگی کی رمق اس کی

آنکھوں میں تھی — لیکن پھر وہ مر گیا — وہ جسے زندگی سے اتنا پیار تھا —

جس میں صرف اپنے ہی نہیں — دوسروں کے دکھ سکھ کو محسوس کرنے کی بھی بہت

صلاحیت تھی —

لیکن وہ خدا حافظ کہے بغیر کیسے مر سکتا تھا — کیا مرنے سے پہلے اس نے مجھے یاد

کیا — میں نے انتہائی خود غرضی سے سوچا۔

سٹیفن کے ساتھ چلتی ہوئی میں آہستہ آہستہ باہر نکلی۔

مالی اس طرح پودوں کی دیکھ بھال میں لگے ہوئے تھے —

ہاں پھول کھل رہے ہیں۔ انھیں کھلنا ہی چاہیئے۔ اس پر مجھے کوئی حیرت نہیں۔

لیکن یہ کہ ان کی کتر بیونت ہو رہی ہے۔ باغ کو سنوارا جا رہا ہے۔ گلشن کا کاروبار چل

رہا ہے۔ زندگی رواں دواں ہے جب کہ وہ زیرِ خاک سو چکا ہے — یہ کیسی عجیب بات

ہے۔

سٹیفن نے اپنی سپورٹس کار نکالی۔

نہیں ہم پیدل چلیں گے —

ایک جیتے جاگتے انسان سے خاک کے ڈھیر تک پہنچنے کے لئے زماں و مکاں کا کچھ وقفہ تو چاہیئے۔

جب ہم وہاں پہنچے۔ تو شام کا سورج ڈوب رہا تھا۔ جین ایک تازہ قبر پر سنوار سنوار کر پودے لگا رہی تھی۔ اس کے قریب صرف چند پودے رہ گئے تھے۔ اس کے ہاتھ مٹی سے بھرے ہوتے تھے —— اس نے ایک پودا قبر پر لگایا۔ اور اس کی جڑیں انگلیوں سے دبائیں ——

—— یہ سب کچھ تو ہم اپنی تسلی کے لئے کرتے ہیں۔ ورنہ مرنے والے تو مر جاتے ہیں ان کے لئے کیا فرق پڑتا ہے۔

قدموں کی چاپ سن کر اس نے سر اٹھایا۔ اور متانت سے کہا ——

"بس یہ آخری پودا تھا۔"

اس نے اپنے ہاتھ رومال سے صاف کئے۔ اور میری طرف آئی۔

کرسٹوفر کی کڈ سسٹر KID SISTER —— وہ کس پیار سے اس کا ذکر کیا کرتا تھا۔ "جب تک وہ بورڈنگ سکول نہیں گئی۔ میں جب بھی گھر ہوتا۔ ہمیشہ شام کی چائے اس کے ساتھ سکول روم میں پیتا۔ اور اب وہ اتنی بڑی ہوگئی ہے۔" —— اس نے مجھے ایک تصویر دکھلاتے ہوئے کہا —— جس میں ایک ٹین ایجر بیدنگ کاسٹیوم پہنے سمندر کے کنارے بیٹھی تھی —— "لڑکیاں ایک دم بڑی ہو جاتی ہیں" ——

اس کے چہرے پر تاسف تھا۔

"میرا ارادہ ایئرپورٹ آنے کا تھا۔ لیکن پھر یہ کام رہ جاتا —— اسے یہ پھول بہت پسند ہیں۔" —— اس نے تیرہ برس کی عمر کے وقار سے کہا —— "آؤ گھر چلیں۔"

ہاں گھر —— لیکن اب وہ گھر کہاں ——

اس ہنستی بستی بھری دنیا میں اب کوئی جگہ ایسی نہ ہوگی۔ جسے میں گھر کہہ سکوں۔

رات کو بلیو بیڈ روم میں سے میرا سوٹ کیس اٹھا کر دوسرے ونگ کی طرف جاتے ہوئے جین نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے تم سوؤ گی تو نہیں —— اگر جاگنا ہی ہے، تو تم کرسٹوفر کے کمرے میں جاگو۔"

—— اس نے دروازہ کھولا۔ اور میرا سوٹ کیس ایک طرف رکھتے ہوئے کہا ——

"ہم لوگوں کے سیاہ لباس دیکھ کر تم سیاہ ساری نہ پہننا —— یہ بہت فضول رسم ہے۔ اور کرسٹوفر کو رنگ بہت پسند تھے ——

—— وہ تمہیں خوش رنگ لباس میں دیکھنا پسند کرتا تھا۔

اچھا اب میں چلتی ہوں۔ کوشش کروں۔ شاید اس کا کتا تھوڑا سا دودھ پی لے۔ جس دن سے ہم نے اسے دفن کیا ہے۔ اس نے کچھ نہیں کھایا —— وہ اس کی کمی کو بہت محسوس کرتا ہے۔ کتے انسانوں سے زیادہ وفادار ہوتے ہیں۔" ——

ہاں انسان اس طرح بھوکے نہیں رہ سکتے۔

جہاں ویڈنگ بریکفسٹ WEDDING BREAKFAST ہونے کو تھا۔ وہاں فیونرل بریکفسٹ FUNERAL BREAKFAST ہوا ہوگا۔

میں نے دریچے کے پٹ کھول دیے۔ تازہ ہوا کا مہکتا ہوا جھونکا آیا اور پردے ہلے۔ میں ونڈو سیٹ پر بیٹھ گئی۔

—— یہ خالص مردانہ کمرہ تھا —— آرام دہ —— لیکن اس میں کوئی بے ترتیبی نہیں تھی ہر چیز اپنی جگہ ٹھکانے سے تھی ——

وہ میرے کمرے میں بھی آتا۔ تو چیزیں ٹھیک کرتا رہتا ——۔

ڈیسک پر اس کا پائپ رکھا تھا —— میں نے وارڈ روب کھولا —— اور بھورے رنگ کے ٹویڈ کے کوٹ کو چھوا —— اس میں ہلکی ہلکی تمباکو کی خوشبو رچی تھی۔

پلنگ کے نیچے اس کے سلیپر تھے —— کرسی کی پشت پر اس کا دھانی رنگ کا ڈریسنگ
گاؤن رکھا ہوا تھا —— اس کی خالص ذاتی چیزیں ——
کمرہ اس کی خوشبو سے مہک رہا تھا —— میں تنہا کب تھی۔
—— اب زندگی میں کون ایسا شخص ہوگا۔ جو شام کو نو بجے کے بعد میرے کمرے میں نہ آئے
اور اگر میں اس کے کمرے میں آنا چاہوں تو وہ مجھ سے کہے —— "اپنی شیپرون کو لے کر آنا۔"
اور کون چلا کر کہے گا۔ "TO HELL WITH MY REPUTATION
I AM WORRIED ABOUT YOURS"
درد کی ایک لہر اٹھی۔ اور اس نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔
—— اس غم سے دل اب تک ناآشنا تھا —— یہ زندگی کا پہلا دھکا تھا۔
باہر مخملیں اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا ——
اب زندگی میں اندھیرے کے سوا کچھ نہ ہوگا —— اور خاک کے اس ڈھیر
میں اور مجھ میں صدیوں کا فاصلہ ہوگا —— وہ یہاں اکیلا تہہ خاک سویا رہے گا ——
اور شاید کبھی زندگی میں ادھر سے گزرتے ہوئے میں وقت نکال کر یہاں آؤں گی۔ اور اس کی
قبر پر چند پھول رکھ دوں گی ——
اور ایک پل دو پل کے لئے وہ شربتی آنکھیں جاگ اٹھیں گی۔ اور ان میں وہ چمک
آجائے گی۔ جس سے وہ ہمیشہ میرا خیر مقدم کرتا تھا۔
—— دکھ سے میرا گلا رندھ گیا —— ایک پھانس تھی۔ جو کہیں اٹکی ہوئی تھی۔
اندھیرا اور گہرا ہو گیا تھا۔
میں نے انگوٹھی اتاری اور اسے گہرے نیلے رنگ کی مخمل کی ڈبیہ میں رکھ دیا۔
"آپ کا ناشتہ مس" ——
تو کیا صبح ہو گئی۔

یہ آئرس تھی۔ وہی خادمہ جو پہلی دفعہ مجھے بلیو بیڈ روم تک لے کر آئی تھی۔

" شکریہ آئرس " ـــــ

" آپ کونسی ساڑی پہنیں گی ؟ میں نکال دوں مس۔"

" نہیں آئرس میں خود ہی نکال لوں گی۔"

پہلی بار جب میں یہاں آئی تھی۔ تو آئرس نے میری تمام ساریاں چھو کر دیکھی تھیں ــــ " ــــ مائی۔ مائی ــــ کیا سلک اور کیا رنگ ! ــــ "

" ساڑی کا ڈریس بھی تو بن سکتا ہے مس" ــــ اس نے شرماتے ہوئے کہا تھا۔

" ہاں " ــــ

ــــ میں نے جواب دیا تھا ــــ " تمہیں جو پسند آئے لے لو ــــ "

اور پھر ہم نے مل کر ایک فیشن میگزین میں سے ڈریس ڈیزائن منتخب کیا تھا۔ اور میں نے سوچا تھا۔ میں اس بار اس سے کہوں گی۔ مجھے دکھائے۔ وہ ڈریس کیسا بنا۔

لیکن اب ــــ یہ ماتم والا گھر تھا۔ اور کرسٹوفر نے ٹھیک کہا تھا ــــ یہاں کے ملازم اولڈ لیڈی مس جیرالڈ کی پرستش کرتے تھے ــــ لیکن شاید اسے یہ معلوم نہیں تھا۔ کہ ماسٹر کرسٹوفر کے لئے وہ جان دے سکتے تھے ــــ

سیڑھیاں اُتر کر میں بریکفسٹ روم میں پہونچی ــــ

سٹیفن سائیڈ بورڈ کے قریب کھڑا اپنی پلیٹ میں گردے نکال رہا تھا۔

" سٹیفن بلیز ــــ کیا تم کسی سے کہہ سکتے ہو۔ کہ میری واپسی کا انتظام کر دے ؟ "

" تم نے گرینڈ مدر سے بات کی ؟ "

نہیں اب کسی سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ جلنے والا سب رشتے توڑ گیا ــــ اب صرف اندوہناک یادیں رہ گئی ہیں۔

"پہلی فلائٹ ——— سٹیفن پلیز ——— اور میں بالکل تیار ہوں ———"

اس نے خاموشی سے سر ہلایا ———

پھر مخمل کی ڈبیہ ہاتھ میں تھامے میں اولڈ لیڈی فس جیرلڈ کے کمرے کی طرف گئی۔

اور دستک دی۔ ان کی خادمہ نے دروازہ کھولا ——— وہ تکیوں کے سہارے لیٹی ہوئی تھیں

مجھے معلوم تھا۔ وہ بارہ بجے سے پہلے نیچے نہیں آتیں ———

میں نے ڈبیہ ان کے قریب رکھ دی۔

اس انگوٹھی پر اب میرا کوئی حق نہیں رہا تھا۔

"میں آج پہلی فلائٹ سے جا رہی ہوں" ———

"یہ انگوٹھی میں نے تمہیں اس لئے تو نہیں دی تھی۔ کہ لوٹانے کی نوبت آئے۔ جب سٹیفن کی منگنی ہوئی تھی۔ تو کلیرا نے چاہا تھا۔ کہ میں یہ انگوٹھی مارگریٹ کے لئے دوں ——— لیکن میں نے صاف انکار کر دیا تھا ———"

"تمہیں میں نے یہ بڑے چاؤ سے دی تھی۔ اور اس کے ساتھ میری دعائیں لپٹی ہوئی تھیں ——— لیکن خدا شاید ہم بوڑھے لوگوں کی دعا نہیں سنتا۔ کہیں تمہیں مذہب نہ ہو جائے۔"

"نہیں ایسا تو کوئی خطرہ نہیں" ——— میں نے نفی میں سر ہلایا ———

"ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ زندگی کا آغاز کرنا کوئی آسان بات نہیں ——— اور تمہیں کوئی بہت انڈرسٹینڈنگ UNDERSTANDING والا آدمی ہی سمجھ سکے گا"

"اب میں چلوں ۔ آپ آرام کیجئے ۔ خدا حافظ" ———

"گوڈ بلیس یو مائی چائلڈ GOD BLESS YOU, MY CHILD" ———

انہوں نے میرا ہاتھ تھپتھپایا۔

——— میں نیچے اتری ——— سامان گاڑی میں رکھا جا چکا تھا۔

سٹیفن اپنی سپورٹس کار میں سٹیرنگ سنبھالے بیٹھا تھا۔

"میں نے سوچا میں خود ہی تمہیں پہونچا آؤں۔"

لیڈی فنس جیرلڈ نے ہاتھ ہلایا۔

جین نے اپنی باہیں میرے گلے میں ڈال دیں ——

"تم پھر کب آؤگی؟" —— اس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن اس مسکراہٹ میں بہت سے آنسو تھے۔

اور جب میں آؤں گی۔ تو تم مجھے اس کی قبر پہ لے جاکر بہار کے رنگ کے پھول دکھاؤ گی —— میں نے تلخی کی تلچھٹ کو جھٹکنا چاہا ——

"دیکھو زندگی کب مہلت دیتی ہے۔"

لارڈ ولیم فنس جیرلڈ نے آگے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ کھولا ——

"خدا حافظ لارڈ فنس جیرلڈ ——" میں نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"میں نے اُمید کی تھی۔ کہ کسی دن تم مجھے فادر کہو گی۔ میرے دوسرے بچوں کی طرح۔"

انہوں گھبرا کر اپنی جیب میں پڑی ہوئی ریزگاری کو کھنکھناتے ہوئے کہا ——

ان کا چہرہ سمتا رہا تھا۔ اور کنپٹی کے قریب ایک رگ ابھر آئی تھی ——

"اس گھر کے دروازے تمہارے لئے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔"

اچانک ولیمز کہیں سے نمودار ہوا۔ اور اس نے زرد گلاب کے پھولوں کا ایک ڈھیر میرے ہاتھوں میں تھما دیا ——

ہاں ایک روز خوشی کے موقع پہ تم نے مجھے سرخ گلاب دیئے تھے۔

"شکریہ ولیمز"

"خدا حافظ مس ——" اس نے اپنی ٹوپی چھوئی۔

میں نے ایک آخری نظر ہر طرف دوڑائی۔

وہ شناسا چہرہ —— جو سب سے عزیز —— سب سے محبوب تھا۔

کہیں نہیں تھا۔

گلے میں کوئی چیز اٹک رہی تھی ــــ اس شخص کو میں نے کس طرح ٹوٹ کر چاہا تھا۔ یہ مجھے آج پتہ چلا ــــ اتنی دکھ بھری محبت ــــ ابھی غم نیا ہے ــــ رفتہ رفتہ دل اس غم سے آشنا ہوجائے گا ــــ گلیڈس آئی۔ اور اس نے انڈوں اور رولز کی خالی پلیٹیں اٹھائیں ــــ

"کیا تم بہتر محسوس کر رہی ہو ؟"

"ہاں" ــــ میں نے سر ہلایا۔

"اب تم کافی کا ایک مگ اور پیو۔ ون فار دی روڈ ONE FOR THO ROAD

مسٹر تھامسن نے میرے لئے کافی لاتے ہوئے کہا۔

اب مجھے بتاؤ۔ کیا قصہ ہے" ــــ انہوں نے آرام سے سگریٹ سلگایا۔

"آپ کو کیسے معلوم کہ کوئی قصہ ہے ؟"

"تم جب بھی یہاں آتیں۔ اپنی مسکراہٹ ساتھ لے کر آیا کرتی تھیں ــــ وجود کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی مسکراہٹ ــــ اور آج تم اتنی دیر سے یہاں بیٹھی ہو۔ اور ایک بار بھی نہیں مسکرائیں ــــ"

"وہ مر گیا اور انہوں نے اسے تہہ خاک دبا دیا ــــ"

ــــ اور میں نے انھیں بتایا کہ تمثال دار آئینے کیوں کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ دیکھتے دیکھتے پل بھر میں ــــ

اور جب شام کو سورج ڈوبنے کو ہوتا ہے۔ تو ان تمثال دار آئینوں کی یاد کیوں کر لہو کے آنسو رلواتی ہے۔

مسٹر تھامسن نے کوئی تفصیلات نہیں پوچھیں ــــ صرف اُٹھ کر کافی کا ایک مگ اپنے لئے بھی لے آئے۔

"زندگی ایسی زیادتیاں بھی کر جاتی ہے" ــــ انہوں نے سگریٹ کا لمبا کش لیا۔ اور

مسکرانے کی کوشش کی۔ لیکن اس مسکراہٹ میں جنم جنم کے آنسو تھے۔

"لیکن زندگی ختم نہیں ہوتی۔" سنا تم نے ــــ زندگی ختم نہیں ہو جاتی ــــ میں تمہیں کوئی رحم آلود ہمدردی نہیں دے سکتا ــــ یہ جتنے لوگ یہاں بیٹھے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایسا نہیں ــــ جس کا دل کبھی نہ کبھی ٹوٹا نہ ہو ــــ

یہ زندگی کے حادثات ہیں۔ جن سے ہم گزرتے ہیں۔ لیکن کسی کے لئے یہ تجربات کے مٹیالے دھبے ہیں۔ اور کسی کیلئے تجربات کے خوبصورت رنگ ــــ یہ نظر کے حسن پر ہے۔

اور وہ بہت اچھا آدمی تھا۔ اور تمہیں خوب سمجھتا تھا ــــ اتنے اچھے لوگ دنیا میں کم ہوتے ہیں ــــ اور تمہارا دل پہلی بار دھڑکا تھا ــــ اور تمہیں یقین ہے۔ کہ اب یہ کبھی کسی کے لئے اس طور نہیں دھڑکے گا ــــ

اس عمر میں ہم سب یہی سمجھتے ہیں۔

ــــ لیکن یہ دل عجیب چیز ہے ــــ یہ دھڑکنا بند نہیں کرتا ــــ

سنا تم نے ــــ یہ دل کبھی دھڑکنا بند نہیں کرتا ــــ

اور پچھتانا کبھی مت ــــ زندگی بہت مختصر سی چیز ہے۔ اس میں پچھتاووں کے لئے کوئی جگہ نہیں ــــ

سوچو ــــ اگر وہ نہ ملتا۔ تو تم کتنی خوشی سے محروم رہ جاتیں ــــ۔

اس نے تمہیں کتنی خوشیاں دیں۔ ان خوشیوں کا نہ ملنا کتنی بڑی محرومی ہوتی۔ دکھ اور درد ان مسرتوں کی بائی پروڈکٹس BY - PRODUCTS ہیں ــــ

یہ مسرتیں تمہاری زندگی میں ہمیشہ ستاروں کی طرح جگمگاتی رہیں گی تم اس کو ہمیشہ محبت سے یاد رکھو گی ــــ وہ تھا ہی ایسی چیز ــــ۔

اور یہ کتنی بڑی بات ہے۔ کہ زندگی میں ایک بار ہی سہی ــــ ہمیں کوئی ایسا شخص مل جائے ــــ دو وجود ایک دوسرے کو اتنی شدت سے چاہ سکیں ــــ یہ بذات خود

کتنی بڑی مسرت ہے ——
جو جذبوں کی شدت سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ وہ حیوانوں کی سطح پر زندہ رہتے ہیں۔ اس بات پر میرا ایمان ہے ——
جب تم عمر رسیدہ ہو جاؤ گی۔ تو اس بات کو سمجھ سکو گی —— ابھی نہیں ——"
میں نے برساتی اٹھائی —— "اب میں چلوں" ——!
"چلو —— میں بھی چند قدم تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"
پھولوں کی ایک دکان کے آگے رک کر انہوں نے کہا ——
"ذرا ایک منٹ ٹھہرو —— میں ابھی آیا ——"
وہ آئے تو گلاب کا ایک پھول ان کے ہاتھ میں تھا۔
"میں امیر آدمی نہیں ہوں —— اگر میں امیر ہوتا۔ اور میری عمر بیس برس کم ہوتی۔ تو میں تمہیں ڈھیروں گلاب کے پھول دیتا ——
مجھے معلوم ہے۔ تمہیں گلاب کے پھول بہت پسند ہیں ——
—— جب تم آئیں تو بارش ہو رہی تھی۔ اور اب دیکھو —— وہ سورج نکل آیا —— صبح دمک اٹھی۔"
ہاں۔ سورج نکل آیا تھا۔
"—— لیکن ہم اپنے خوابوں کو ساتھ لئے زمین پر گر پڑتے ہیں اور آئینے دھندلا جاتے ہیں۔
اور پھر ہم دکھتے ہوئے ہاتھوں سے ان آئینوں کو شفاف بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔
اور ہم آہیں بھرتے ہیں۔"
میں نے برساتی کے بٹن بند کئے۔
"صبح پھوٹی تو وہ پہلو سے اٹھا آخر شب"

میں نے زیر لب کہا۔
اور اس نے عکس کو ودع کرنے کی کوشش کی ——

لاہور کی ایک شام

ایک دن حضرت شیخ علی پاؤں پھیلائے بیٹھے تھے۔ اور اپنا خرقہ سینے میں معروف تھے۔
خرقے کا ایک پلہ آپ نے اپنی ٹانگ پہ پھیلا رکھا تھا۔ اسی دوران لوگوں نے اُن سے کہا۔ کہ
خلیفہ ملاقات کے لئے آرہا ہے۔

وہ اسی طرح اپنے کام میں مشغول رہے۔ خلیفہ آیا۔ اور سلام کر کے بیٹھ گیا۔ آپ نے اپنی
نشست کا انداز نہ بدلا۔ یہ دیکھ کر حاجب نے کہا۔
"یا شیخ اپنے پاؤں سمیٹ لیجئے۔" ـــــ لیکن آپ نے اس کی بات پہ دھیان نہ دیا۔
اس نے اپنی بات دہرائی۔ آپ پھر بھی اسی طرح بیٹھے رہے ـــــ
کچھ دیر آپ کے پاس بیٹھ کر خلیفہ جانے لگا۔ تو حضرت نے اپنے ایک ہاتھ میں
حاجب اور دوسرے میں خلیفہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا۔
ـــــ "میں نے اپنے ہاتھ سمیٹ لئے ہیں، اس لئے مجھے روا ہے۔ کہ اپنے پاؤں
نہ سمیٹوں۔" ـــــ

ـــــ خاصی سردی ہے۔ میں کوٹ کا کالر اونچا کر کے اپنی گردن کے گرد لپیٹے

ہوئے صدر دروازے سے اندر داخل ہوئی۔ گیلری میں کوئی ماتمی صورت بنائے فون کے پاس کھڑا تھا۔

"ہیلو ابا" ——

"تمہیں دیر ہوگئی" —— ابا نے کہا۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔

"کوئی ایسی دیر بھی نہیں ہوئی۔" —— میں نے کہا۔

—— جب میں جا رہی تھی۔ تو وہ گھنٹہ بھر پکو والے مبین اختر سے الجھنے کے بعد کمبل اوڑھے آنکھیں بند کئے لیٹے ہوئے تھے۔

"آپ مبین اختر کو بہت ڈانٹتے ہیں۔" —— امی نے کہا تھا۔

"وہ باتیں ہی فضول کرتا ہے۔ اور پھر کاغذات پورے نہیں لاتا" ——

"دراصل آپ تھک جاتے ہیں۔ اس سے تو بہتر تھا۔ آپ ہائیکورٹ کے جج ہی ہوجاتے۔ جب آفر ہوئی تھی۔" —— امی نے کہا۔

کہاں تو ابا آنکھیں بند کر کے لیٹے ہوتے تھے۔ اور کہاں اُٹھ کر بیٹھ گئے۔

"بیگم صاحبہ۔ ہائیکورٹ کے جج کی تنخواہ چار ہزار روپے ماہوار ہے۔ اس میں سے مکان کا کرایہ اور انکم ٹیکس کٹ کر ستائیس سو بچتا ہے۔ اس کو جہاں چاہو لپیٹ لو۔"

"اور آپ سے یہ کس نے کہہ دیا۔ کہ ہائی کورٹ کے جج کو کام کم کرنا پڑتا ہے؟" ——

ابا عدلیہ کے ڈیکورم DECORUM کے بہت قائل تھے۔

ابا کی بات سن کر مجھے مسز شفیق یاد آگئیں۔ جب وہ اپنے میاں کے ساتھ ہمارے ہاں آئی تھیں۔ تو بہت تفصیل سے انہوں نے بتایا۔ کہ کس مشکل سے مہینہ گزرتا ہے۔

"میں شفیق سے کہتی ہوں۔ کہ آپ مجھے روزانہ سودا منگوا دیا کریں" ——

"یہ بات وہ نہیں مانتے۔ کہتے ہیں۔ عدالت کا کام کروں یا سودے سلف کا حساب رکھوں۔"

"اب پچھلے مہینے دس پندرہ آدمیوں کی دعوت کی، سات سو روپیہ خرچ ہوا۔ اور پھر بھی شفیق نے مرغی خود نہیں کھائی۔"

"کل صاحبزادے کے دوست آگئے۔ گیارہ بوتلیں آر۔سی کی کھل گئیں۔ میں نے کہا بیٹا میں نے ہر قسم کے شربت بنا رکھے ہیں تم آنے جانے والوں کو شربت پلا دیا کرو۔ کہنے لگا۔ امی لوگ بعد میں باتیں کرتے ہیں تو ان کے جانے کے بعد بہت دیر تک ہم لوگ ہنستے رہے۔ کس قدر سادہ طبیعت تھیں۔

لیکن ملیحہ کو جسٹس شفیق کی مرغی نہ کھانے والی بات بہت بھائی۔ کہنے لگی۔

"اگر وہ خرچ زیادہ نہیں دیتے۔ تو مرغی بھی خود نہیں کھاتے ——

—— ان لوگوں کی طرح نہیں ہیں۔ جو بیویوں کو خرچ بھی نہیں دیتے۔

اور مرغی بھی کھانا چاہتے ہیں۔" —— ملیحہ بہت انصاف پسند تھی۔

"ابا! بہت ٹریجڈی ہوئی" —— میں نے امی کی بات ٹالنے کے لئے کہا۔ "وہ جو میرا نیا سوٹ تھا نا —— گڈو نے استری کرتے میں اس کی قمیص جلا دی۔ ابھی میں نے دیکھا"

"وہ تمہاری اکثر ٹریجڈیاں اسی قسم کی ہوتی ہیں۔ کوئی اور پہن لو۔" —— ابا پھر کمبل اوڑھ کر لیٹ گئے۔

—— اور اس وقت وہ ٹہل رہے تھے۔ بارہ قدم اس طرف —— بارہ قدم اس طرف —— یوں وہ اکثر ٹہلتے تھے، لیکن اس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے زندگی کا دارومدار اسی پہ ہو۔

ٹیلیفون کی گھنٹی بجی "—— ہاں —— ہاں جی —— ہاں جی ——

میں لاہور سے بول رہا ہوں۔ اسلم لاہوری کو بلا دیں۔ وہ ریڑھی لگاتا ہے جی۔"

—— اب میں نے غور سے دیکھا۔ ارے یہ تو اماں کا بیٹا ہے —— سلیمان

تب امی سے پتہ چلا۔ کہ اماں کا انتقال ہو گیا ——

اوہو۔ جبھی ابا پریشان ہیں۔ بیماری اور موت کا ذکر سن کر ان کی طبیعت ویسے ہی ناساز ہو جاتی ہے ـــــ

ـــــ خیر مرنا برحق ہے۔ اور اماں تو کب سے اپنے مرنے کی دعائیں مانگ رہی تھی۔

ـــــ اور یہ شاید سب سے خوفناک بات ہے، اس کا مطلب ہے۔

کہ اب آپ کسی چیز سے خوفزدہ نہیں ـــــ اب کسی پہ اعتماد نہیں رہا ـــــ کسی بات پر۔

یقین نہیں رہا ـــــ زندگی بے معنی ہو گئی ہے۔ اور موت اس سے بھی بے معنی ـــــ جیسے ہر چھوٹی بڑی خوشی اور ہر چھوٹے بڑے دکھ سے منہ موڑ لیا جائے۔

وجود کی ہر گرمی ـــــ ہر رعنائی کا احساس ختم ہو جائے۔

ـــــ انسان تھک جائے۔ آنسوؤں سے ہی نہیں ـــــ مسکراہٹوں سے بھی ـــــ

ـــــ موت کا انتظار کیا جائے تاکہ زندگی کا جہنم پیچھے رہ جائے۔

ـــــ اور نفرتوں کا ـــــ اور تنہائی کا ـــــ اور بے بسی کا سفر ختم ہو جائے ـــــ

"بیگم صاحب میرا وخت کب آئے گا۔" ـــــ اماں کوئی سال بھر سے اٹھتے بیٹھتے یہی پوچھتی تھی۔

اور امی ایک ہی جواب دیتیں ـــــ

"اماں موت نہیں مانگتے۔ موت مانگنے سے زحمت آتی ہے۔"

ـــــ لیکن زحمتیں تو جو اماں کی زندگی میں آنا تھیں۔ آچکی تھیں ـــــ

ـــــ اور اب اماں کا وخت آگیا تھا۔ اس یخ بستہ شام ـــــ

اور اماں کا بیٹا اپنے بھائی کو ڈیرہ نواب صاحب اطلاع دے رہا تھا۔

اسٹیشن ماسٹر کے ذریعہ ـــــ لیکن اسٹیشن ماسٹر کو بھلا اسلم لاہوری کا کیا پتہ ـــــ

جلدی سے ریسیور اس کے ہاتھ سے لے کر امی نے اسٹیشن ماسٹر کو اسلم لاہوری کے گھر کا پتہ بتایا ——

—— اور آج کی شام ان سب نے اپنے اپنے گلاس اٹھائے تھے —— حامد سعید جو میزبان تھا ۔ بار بار وہسکی کی بوتل سید صاحب کی طرف بڑھا رہا تھا ۔ وہ آج کی شام کی پریما ڈونا تھے ۔ اور بہت خوش تھے —— ایک پھول کی طرح کھلے ہوئے تھے ۔

—— دراصل بہت کم ایسا ہوتا ۔ کہ وہ کسی نہ کسی کے سائے میں نہ ہوں —— جن کے سائے میں وہ زندگی بھر رہے تھے ۔ ان میں سے ایک تہہ خاک آسودۂ خواب تھے ۔ اور دوسرے جلا وطن ۔

کسی نے ہاتھ بڑھا کر ٹیلیویژن لگا دیا ، فریدہ خانم غالب کی غزل گا رہی تھی ۔

"یہ کون ہے ؟" —— سید صاحب نے سوال کیا ۔

"ارے فریدہ خانم ہے ۔ آپ نہیں پہچانتے —— بہت خوبصورت لگ رہی ہے ۔ ہے نا ——!!"

" مجھے تو فریدہ خانم ہمیشہ ہی اچھی لگتی ہے ۔ حساس چہرہ ہے اور ایسے چہرے ہمیشہ بھلے لگتے ہیں ۔ سمگ چہروں سے میں گھبراتی ہوں —— زندگی سے بہت زیادہ مطمئن چہرے عام طور پر ان لوگوں کے ہوتے ہیں ۔ جن میں احساس کی کمی ہوتی ہے ——"

عطیہ ہمیشہ سویپنگ سٹیٹمنٹس دیا کرتی تھی ۔ وہ خود بہت حساس اور ہائیلی سٹرنگ تھی

"جب میری پچاسویں سالگرہ منائی گئی ——" عوامی شاعر نے کہنا شروع کیا ——

"تو میں فاتحانہ انداز سے بیوی کی طرف دیکھتا رہا ۔ کہ دیکھو ہماری قدر و منزلت —— دراصل جب ہماری شادی ہوئی —— تو نہ باجا تھا —— نہ گھوڑا —— نہ موٹر —— نہ کچھ ——

لیکن ہوا یہ کہ تقریب کے آخر میں فریدہ خانم آن کر بغلگیر ہو گئی ۔

نتیجہ یہ ہوا ۔ کہ بیوی کا منہ پھول گیا ۔ گھر پہنچ کر بھی پھولی رہی —— بہت میں نے کہا ۔ ارے نیک بخت دیکھ تو سہی ۔ وہ کس عمر میں گلے ملی ۔ آخر میری پچاسویں سالگرہ تھی —— لیکن

سب بے سود ــــــ"

"خوبانِ شہر کہاں ہیں ۔" ــــــ میں نے آتے ہی سعید اختر سے پوچھا تھا ۔

"خوبانِ شہر بوڑھی ہو گئی ہیں ۔ ان کے چاہنے والے بھی بوڑھے ہو گئے ہیں ۔"
ــــــ اس نے جواب دیا ۔

"ہاں اگر اب بھی آپ لوگ اسی رفتار سے عشق کریں ۔ تو ہارٹ اٹیک ہی ہو جائے۔"

"تم نے فیض کی وہ نظم دیکھی تھی ۔ 'ہارٹ اٹیک' " ــــــ

"درد اتنا تھا کہ اس سے بھی گزرنا چاہا ــــــ"

عطیہ ہارٹ اٹیک کو اس طرف لے گئی ۔

ــــــ "ہاں لیکن وہ شاعرانہ ہارٹ اٹیک ہو گا ۔ کسی دل کے مریض کو آج تک میں نے یہ تسلیم کرتے نہیں سنا ۔ کہ وہ واقعی دل کا مریض ہے ۔

ہمیشہ اس کے پاس کوئی نہ کوئی اور وضاحت ہوتی ہے ۔"

مجھے رفیق احمد یاد آیا ۔ جو سات برس پیشتر گنگا رام ٹرسٹ ہسپتال میں ابا کے ساتھ والے کمرے میں تھا ــــــ اور جس روز اس کی چھٹی ہوئی ۔ اور وہ گھر جا رہا تھا ۔ ابا سے ملنے کے لئے آیا تھا ۔

"چودھری صاحب دل تو میرا بالکل ٹھیک ہے ۔ صرف دورانِ خون میں کچھ گڑبڑ ہے ۔"

"دل تو میرا بھی بالکل ٹھیک ہے ۔ صرف ذرا گیس کی شکایت ہو جاتی ہے ۔" ابا نے اپنی تکلیف بیان کی ۔

دل کے مرض کو دونوں میں سے کسی نے بھی تسلیم نہ کیا ۔

تین مہینے بعد رفیق احمد کا انتقال ہو گیا تھا ــــــ ہائیکورٹ بار ایسوسی ایشن نے تعزیت کا ریزولیوشن پاس کیا ــــــ اور اس کی تصویر بار روم میں آویزاں کر دی گئی ــــــ

ــــــ لفظ تعزیت میرے خیال کو کہیں سے کہیں لے گیا ــــــ

مجھے میاں نعیم انور یاد آگئے ۔ جب ہم کالج میں تھے۔ تو وہ ایک قسم کے اسٹوڈنٹ لیڈر تھے —— (گو پڑھنا وہ کب کا چھوڑ چکے تھے) —— ہر موقعہ پر آگے آنے کو تیار —— بیان دینے کے بہت شوقین ——

کسی نے ایک بار مجھے بتایا تھا۔ کہ جب منٹو کا انتقال ہوا۔ تو میاں نعیم انور نے اپنے حواریوں کو جمع کیا —— اور ایک ریزولیوشن پاس کیا۔ کہ "یہ اجلاس منٹو کے انتقال پر غم و غصہ کا اظہار کرتا ہے۔"

"—— ہاں لیکن مجھے یقین ہے۔ کہ فیض کو کبھی ہارٹ اٹیک نہیں ہوا! اگر ہوتا تو یہ نظم لکھنے کی نوبت نہ آتی۔ بلکہ وہ واقعی درد سے گزر جاتے ——"

میں نے ہنستے ہوئے عطیہ سے کہا، اور اورنج جوس کا گلاس اٹھا لیا۔

—— اماں یونہی گھومتی پھرتی ہمارے ہاں آن پہونچی تھی۔ اور امی چونکہ کسی کو انکار کرنے کی عادی نہیں۔ انہوں نے اسے ساٹھ روپیہ مہینے پر رکھ لیا۔

اس کا کام بس اتنا تھا۔ کہ ہمارے خانساماں محمد دین کو سبزی بنا دے۔ یا چاول چن دے —— دین کو ایک اسسٹنٹ کی ہمیشہ ضرورت رہتی تھی۔——

لیکن چاول چننے سے اماں کی بہت جلد چھٹی ہو گئی۔ اُسے نظر کم آتا تھا۔

ابا نے اس کی آنکھیں بھی ٹیسٹ کروا کے دیں —— نمبر بھی لے کر دیا —— لیکن اماں چشمہ لگانے کو تیار نہ ہوئی۔

اماں نے بھلے وقت دیکھے تھے۔ جب مسلمان گریجویٹ پچھتر روپیہ مہینہ پر کلرکی کر رہے تھے۔ اماں کا میاں ریلوے میں ہیڈ مستری تھا اور ڈھائی سو روپے لیتا تھا۔ چار آنے کی برفی کے بغیر اماں نے کبھی کھانا نہیں کھایا تھا ——

جب میاں مرا۔ تو گھر میں ڈھائی سو تانبے کے برتن اور اماں کے پاس چالیس تولے سونا تھا۔

"اے بیٹا بہت سیدھے تھے۔" ـــــ اماں نے اپنی پیڑھی دھوپ کے رخ کھسکائی میں قسمت کی ماری کتاب لے کر پیچھے کے برآمدے میں آ بیٹھی تھی۔

"روپے کے آنے گننے نہ آتے تھے۔ میں تو ہر وخت دعا مانگتی تھی۔ کہ میرے ہاتھوں میں اٹھ جاویں ـــــ ایسے سیدھے آدمی کا گزارا کہاں ہو سکتا تھا۔ بھلا ـــــ"

گزارا تو اماں کا بھی نہیں ہو رہا تھا۔ اور یہ کچھ منطق بھی الٹی تھی۔ عورتوں کو تو بوڑھ سہاگن ہونے کی دعا دی جاتی ہے۔ اور وہ بھی زمانہ تھا۔ کہ عورتیں ستی ہو جاتی تھیں ـــــ

ـــــ میں آنکھیں بند کر کے اماں کے میاں کے سیدھے پن کی باتیں سنتی رہی۔

ـــــ اور پھر کتاب اٹھا کر اندر چلی گئی۔ امی والا تحمل مجھ میں نہیں تھا۔ کہ گھنٹوں اماں کی باتیں سنتی چلی جاؤں ـــــ

ایک بار اماں نے کام چھوڑ چھاڑ ساتھ والے گھر میں ملازمت کر لی۔ وہاں دس روپے زیادہ مل رہے تھے۔ لیکن وہاں وہ ایک دن سے زیادہ نہ ٹک سکی۔

گھر کی بیگم نے پہلے تو سارے گھر میں جھاڑو دلوایا ـــــ پھر کھانا پکوایا اور اس کے بعد کپڑوں کا ڈھیر اماں کے سامنے لگا دیا ـــــ کہ دھوؤ کپڑے ـــــ اماں کی بوڑھی ہڈیوں میں بھلا اتنا دم کہاں ـــــ وہ اگلے ہی روز پھر ہمارے ہاں آ گئی۔ اور چپ چاپ باورچی خانہ کے سامنے بیٹھ کر سبزی بنانے لگی۔

ـــــ نہ کسی نے کوئی سوال کیا۔ اور نہ اماں نے ایک روز نہ آنے کا کوئی عذر تراشا۔

تین چار روز بعد اس نے خود ہی امی کو سارا قصہ سنایا ـــــ

ـــــ جب میں نے اورنج جوس کا گلاس اٹھایا۔ تو عوامی شاعر نے بور ہو کر کہا تھا

"عصمت آپا تو ہمارے ساتھ بیٹھ کر ذرا سی وہسکی پی بھی لیتی تھیں ـــــ تم ہاتھ ہی میں لے لو۔"

ان کو زیادہ ہی چڑھ گئی تھی۔

حامد سعید نے وائٹ ہارس کی بوتل بڑھاتے ہوئے کہا ـــــ

"دوں ذرا سی ؟" ـــــ

"نہیں بھئی" ـــــ میں نے نفی میں سر ہلایا ـــــ

اور سعید اختر نے میری ہاں میں ہاں ملائی ـــــ

"رہنے دو حامد سعید ـــــ اس کے ہاں بیچ کا کوئی راستہ نہیں" ـــــ

مینٹل پر رکھا ہوا الیکٹرک کلاک ہر گزرتے ہوئے سیکنڈ کا احساس دلا رہا تھا۔ وقت تیز رفتاری سے گزرتا ہے ـــــ انسان بھلا دینا چاہتا ہے۔ لیکن بھلا نہیں پاتا۔

"اخبار میں میں نے پڑھا تھا کہ اسلامی تعزیرات کے تحت آپ پکڑے گئے ـــــ کیا ہوا اس قصے کا" ـــــ میں نے عوامی شاعر سے پوچھا ـــــ

"ہونا کیا تھا ـــــ قصہ ختم ہوا۔ ڈاکٹر نے میری بجائے اپنے کمپاؤنڈر کے ٹیسٹ کئے ـــــ اور صاف ستھری رپورٹ بھیج دی۔ ڈاکٹر دراصل میرا دوست تھا۔ دو دن پہلے اس نے خود میرے ساتھ پی تھی ـــــ

"اب تو بھئی میں جہاں پیتا ہوں۔ وہیں سو جاتا ہوں۔ جو بلاتے ہیں۔ ان سے پہلے ہی کہہ دیتا ہوں۔ دراصل ایک روز غضب ہو چلا تھا ـــــ میں گھر پہنچا۔ کسی نے دروازہ نہ کھولا۔ رات کے دو بج رہے تھے ـــــ اتنی دیر میں ایک سپاہی آگیا۔ اس نے زور زور سے کنڈی کھٹکھٹائی ـــــ تب کہیں جا کر دروازہ کھلا۔ میں دم بخود ایک طرف دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا رہا۔ سارا نشہ ہرن ہو گیا ـــــ اگر سپاہی کو ذرا سا بھی شبہ ہو جاتا۔ تو ایک رات حوالات میں ضرور گزرتی۔"

ـــــ یہ جہاں پیتا ہوں۔ وہیں سو رہتا ہوں ـــــ والی بات میں نے پاک ٹی ہاؤس میں سن رکھی تھی۔ لیکن مجھے یقین نہیں آیا تھا۔ آج تصدیق ہو گئی۔

"ان تمام فکروں کے باوجود بھی آپ لوگ پی لیتے ہیں ؟" میں نے سادگی سے سوال کیا۔

" تو اور کیا کریں" —— اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔

—— "کچھ عادت بھی ہو گئی ہے نا" —— وہ میرا یار تھا فرید جاوید —— اس کا یہ حال تھا کہ اس کی شادی کی بات میں نے تین چار بار چلائی —— اور اس کے آگے ہاتھ جوڑے۔ کہ بھائی پی کر مت آنا —— لیکن وہ جب بھی پہونچتا۔ لہرا کر اپنے ہونے والے خسر سے گلے ملتا۔

—— لڑکی کے والد لاحول ولا قوۃ کہہ کر ایک طرف ہو جاتے اور بعد میں گالیاں میرے حصے آتیں اور فرید جاوید ہمیشہ ایک ہی جواب ہوتا —— "یار وہ ایک دوست مل گیا تھا۔ زبردستی لے گیا۔" —— دوستوں کا تو بہانہ تھا۔ دراصل اس کے قدم خود بخود میخانوں کی طرف اُٹھ جاتے تھے۔

سنو ایک بار کیا ہوا۔ فرید جاوید میرے ہاں ہی رہتا تھا۔ جاڑے تھے۔ اور اس کے پاس صرف ایک کمبل تھا۔ رضائی ایک ہی تھی —— میں اور میرے والد صاحب وہ رضائی اوڑھ کر ایک بستر پر سو جاتے تھے۔ والد صاحب رات کو ذرا کی ذرا اُٹھ کر گئے۔ فرید جاوید نے وہ رضائی اٹھائی اور کمبل کے ساتھ جوڑ کر سو گیا۔ والد صاحب آئے اور رضائی کو غائب دیکھ کر پوچھا ——

" رضائی کیا ہوئی ؟" ——

میں نے کہا: "جی۔ فرید جاوید لے گیا"

والد صاحب گئے۔ تو وہ رضائی کمبل کے ساتھ جوڑے اطمینان سے سو رہا تھا۔

والد صاحب نے اس کے آٹھ دس جوتے لگائے۔ دس پندرہ گالیاں دیں —— اور رضائی اُٹھا لائے ——

—— بس پھر میں نے کراچی چھوڑ دی۔ میں نے کہا۔ جس شہر میں یار کو رضائی نہیں مل سکتی۔ وہاں کیا رہنا ——

میں لاہور آ گیا۔ قسطوں میں پہونچا۔ مشاعرے پڑھتا پڑھاتا —— حیدرآباد گیا۔ وہاں مشاعرے کے منتظمین نے بہاولپور تک کا ٹکٹ دے دیا —— ظہور نظر کے ہاں ٹھہرا —— وہاں سے ملتان کا ٹکٹ مل گیا —— وہاں ایک اور مشاعرہ پڑھا۔ اور لاہور کا ٹکٹ لے لیا —— بس

کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی گیا ـــــ

ابھی میں کراچی گیا۔ تو بہت سی خوبصورت خواتین سے ملاقات ہوئی۔ چند ایک نے بلایا بھی

لیکن میں نہیں گیا ـــــ بس انتقاماً ـــــ کہ اب تم میرے پاس آئی ہو تو کیا آئی ہو ـــــ"

ـــــ وہ ہنسا۔

میں نے محفل میں موجود خوبصورت کپڑوں کی خوبصورت کریزوں کی طرف دیکھا۔ اور پھر عوامی شاعر کے

عوامی کپڑوں کی طرف ـــــ

اس منافق ـــــ دوہرے معیاروں والی دنیا میں اس سچے شخص کا گزارہ کیوں کر ہو رہا ہے۔

یہ بات میں نے خود سے کہی تھی ـــــ دل کی خبر دل کے سوا کسی کو نہ ہونا چاہیئے ـــــ

لیکن عطیہ نے اپنی شربتی ویلوٹی آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور ہنسی ـــــ جیسے

وہ میرے دل کی بات جان گئی ہو۔

"لوگ ٹیلرز کی ڈمیز کی طرح ہیں ـــــ ہے نا؟" ـــــ اس نے تھکی ہوئی مسکراہٹ کے

ساتھ کہا۔

"مہذب دکھ ـــــ سب سے تکلیف دہ دکھ ہے ـــــ سرد اور گہرے ـــــ" عطیہ

نے نمکین مونگ پھلی کھاتے ہوئے مزید روشنی ڈالی۔

ـــــ اماں نے کوئی دس برس ہمارے ہاں کام کیا، پھر وہ بالکل رہ گئی ـــــ امی نے فیصلہ

کیا۔ کہ اماں کھانا بدستور کھاتی رہے ـــــ (کھانا وہ ایک ہی وقت کھاتی تھی۔) ـــــ اور اس

کی پنشن لگا دی جائے۔

ـــــ لفظ پنشن تکلفاً استعمال کیا جاتا تھا۔ امی جس اولڈ فیملی ریٹیئرز کی پنشن کا ذکر کرتیں۔

وہ اصل میں تنخواہ ہی ہوتی ـــــ اگر ان سے کہا جاتا۔ کہ سرکاری پنشن تو آدھی ہوتی ہے۔ تو ان کا جواب

یہی ہوتا کہ "مہنگائی تو دیکھو ـــــ کہاں سے کہاں پہونچی"

ـــــ ایسے موقع پر وہ اعداد و شمار کا سہارا لیتیں۔ جس اخبار کے جس کالم میں انفلیشن کا ذکر

ہوتا۔ اس کا تماشہ امی رکھ لیتیں ــــ تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے ــــ

ایک دفعہ انہوں نے ۱۹۱۰ء سے لے کر اس وقت تک کے اعداد و شمار کا حوالہ دیا ــــ

ان دنوں اسی سلسلہ میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی کا کالم چھپ رہا تھا۔ اخبار میں ــــ جسے امی بہت غور سے پڑھتیں ــــ

ادھر اماں کی بہو نے اور زیادہ ستانا شروع کیا۔ امی نے پنشن لگائی تھی۔ پان چھالیہ کیلئے ــــ اماں تیس روپیہ پان چھالیہ کے لئے رکھتی اور تیس سلیمان کی شادی کے لئے ــــ سلیمان منجھلا بیٹا تھا۔ اور ابھی لنڈورا گھوم رہا تھا۔ اس نے زندگی بھر کوئی کام ٹھیک سے کر کے نہ دیا تھا۔ سینیٹری فٹنگ کا کام سیکھا۔ تو اوزار لینے کے لئے پیسے نہ تھے۔ خیر اوزار امی نے خریدے۔ کہ جب سلیمان کو ضرورت ہو لے جایا کرے۔ ورنہ ہمیں بھی ضرورت رہتی ہے ــــ اس قسم کی ضرورتیں پیدا کر لینے میں امی کو کمال حاصل تھا۔

جب خاں صاحب اوزار لے کر آئے۔ تو امی نے باری باری ایک ایک کو اٹھا کر دیکھا ــــ

"دیکھو یہ رینچ کتنا اچھا ہے نا ــــ" امی نے اس فخر سے کہا۔ جیسے وہ رینچ انہوں نے خود گھڑا ہو۔ لیکن یہ کام سلیمان سے چلا نہیں ــــ امی کے غسل خانہ کا شاور ٹھیک کرنے آیا۔ الٹا اسے توڑ گیا۔

منیاری کی دکان کی۔ اس میں گھاٹا بیٹھا ــــ وہ بند کی ــــ بچا کھچا سامان اماں نے پھیری لگا کر بیچا۔ لیکن اس میں یہ قباحت تھی۔ کہ اماں کی بکری کم ہوتی۔ چیزیں چوری زیادہ ہوتیں ــــ کبھی کوئی نیل پالش کی شیشی چوری ہو جاتی۔ اور کبھی بندوں کی جوڑی ــــ

اماں شام کو ہمارے ہاں بیٹھ کر حساب لگاتی۔ روزانہ کوئی نہ کوئی چیز کم نکلتی۔ اور اماں سر ہلا کر کہتی۔

"بیگم صاحب لوگ اللہ سے نہیں ڈرتے" ــــ

میں نے اماں کو سمجھانے کی کوشش کی۔

" اماں چھوڑو یہ کام ـــــ آرام سے گھر بیٹھو۔"

اس پر ہمیشہ اس کا ایک ہی جواب ہوتا ـــــ " اے بیٹا یہ پیٹ کی آگ تم کیا جانو ـــــ"

ـــــ بالآخر سلیمان کو عامر نے سکریٹریٹ میں اٹکا دیا - وہ تو کیا اٹکاتا۔ اماں نے اُسے بلیک میل کر لیا۔

بہت دن وہ عامر سے کہتی رہی ـــــ " اے بیٹا سلیمان کو نوکر کروا دو۔ چاہے ساہیوال ہی لے جاؤ۔" ـــــ وہ ٹالتا رہا ـــــ

ایک بار وہ کسی میٹنگ کے سلسلے میں لاہور آیا ـــــ تو اماں پھسکڑا مار کر کمرے کی دہلیز میں بیٹھ گئی۔ عامر اپنے کاغذات بریف کیس میں رکھ رہا تھا۔

" اے بیٹا تمہارے ڈی سی ہونے کا بوڑھی اماں کو کیا فائدہ - عامر میاں مجھ مری کا منھ دیکھو۔ اگر سلیمان کو نوکری نہ دلواؤ" ـــــ

عامر اس قدر ڈر اکر جلدی سے بولا۔" اماں اسے آنا اسے کل ـــــ"

" اے بیٹا وہ دکھیا تو اس وقت بھی میرے ساتھ ہے۔"

" اچھا تو اماں بٹھا دو اسے موٹر میں۔"

اس روز سے سلیمان سکریٹریٹ میں موٹریں صاف کرنے پر ملازم ہو گیا۔

ـــــ ادھر اماں کی بہو کے ظلم بڑھتے گئے - کھانا تو وہ پہلے ہی نہیں دیتی تھی۔ اب اس نے ناشتہ بھی بند کر دیا۔ خیر امی نے کہا ـــــ

ـــــ " اماں تم ناشتہ بھی یہیں کر لیا کرو۔" ـــــ

اماں ہانپتی کانپتی ساڑھے آٹھ نو بجے تک پہنچ جاتی۔

اس کا گھر مشکل سے پندرہ منٹ کے فاصلے پر تھا۔ لیکن اماں بیچاری گھنٹہ بھر پہلے چلتی۔ تب کہیں رستے میں رکتے - بیٹھتے ـــــ سانس لیتے ـــــ ناشتے کے وقت تک پہونچتی۔

ـــــ لیکن اماں کی عادتیں بگڑی ہوئی تھیں۔ صبح کو جب تک اُسے بستر میں ایک پیالی

چائے نہ مل جائے۔ وہ اٹھ نہیں سکتی تھی۔

بہو نے وہ بھی بند کر دی۔

"اماں کیا کرتی ہو صبح کو" —— امی نے پوچھا۔

"اے بیگم صاحب۔ ایک پیالی صبح کو شمسہ بھیج دیتی ہے۔ چھوٹی بیٹی کے ہاتھ —— بیٹوں سے چوری ——"

شمسہ اماں کی پڑوسن تھی۔ ابھی حال ہی میں بیوہ ہوئی تھی —— ! اور بہت جلد بیوگی کی مصیبتیں سمجھ گئی تھی۔

امی نے بہت دفعہ اماں سے کہا۔

"اماں چھوڑو یہ جھگڑا —— یہاں کوارٹر میں پڑ جاؤ آن کر ——"

لیکن اماں کا ایک ہی جواب ہوتا۔

"اے بیگم صاحب لڑکوں کی ناک کٹ جائے گی۔"

"اب کونسی سلامت ہے۔" —— ایک بار میں نے جل کر کہا تھا۔

بہو کا سودا بازار سے لانا اور باہر کے سب کام مثلاً بجلی کا بل وغیرہ جمع کروانا سب اماں ہی کرتی تھی۔ ایک پیالی چائے کے عوض یہ سودا مہنگا نہیں تھا۔ لیکن وہاں جھگڑا ساٹھ روپے کا تھا —— بہو چاہتی تھی۔ اماں پان بھی چھوڑ دے۔ اور سلیمان کے بیاہ کے لئے تیس روپیہ مہینے کی بچت بھی ——

اماں اکثر پان کی بری لت کا ذکر کرتی۔

"اے بیگم صاحب داڑھ میں درد ہوا۔ اللہ بخشے ہماری ساس کہنے لگیں —— " بہو تم تمباکو والا پان کھاؤ" بس میں نے پان تمباکو شروع کر دیا۔ درد تو جاتا رہا۔ لیکن یہ لت پڑ گئی ——"

باوجود پان کھانے کے اماں کے دانت اس عمر میں بھی موتیوں کی طرح چمکتے تھے۔

" بیگم صاحب میں پنڈ کی ہوں ۔ بریلی کے پاس ایک پنڈ تھا ۔
سولہ برس کی بیاہی آئی تھی لاہور میں ـــــ پھوپھی گھر بھتیجی ہوں ۔"
اماں کا خالص کھنکتا ہوا یوپی والوں کا لہجہ تھا ۔ لیکن کہیں کہیں پنجابی کے لفظ بول جاتی
تھی ۔ سلیمان جو پاکستان بننے کے بعد پیدا ہوا تھا ۔
فر فر پنجابی بولتا تھا ۔
اماں نے کچھ پیسے جوڑے ۔ اور کچھ قرض اٹھایا ، اور سلیمان کی شادی کی ۔ یہ الگ بات
ہے ۔ کہ مہینہ بھر بعد ہی دلہن نے ذلیل قسم کا الزام لگا کر طلاق لے لی ـــــ تب اماں نے خوب
آنسو بہائے ـــــ اس موقع پر اسے سب غم یاد آئے ۔ کیسے ڈھائی سو برتن بکا ـــــ اور
چالیس تولہ سونا ـــــ بلڈ پریشر کتنا بڑھ گیا ہے ـــــ (جب بھی چیک کیا جاتا ۔ اماں کا
بلڈ پریشر ٹو ٹوئنٹی بائی ون ٹوئنٹی نکلتا) ـــــ کمر میں کیسا درد رہتا ہے ـــــ ہاتھ پیر
کیسے سوج گئے ہیں ـــــ ٹانگ پر کیسا بدذات پھوڑا نکلا ہے ـــــ مہنگائی کتنی ہوگئی ہے
ـــــ پھر اماں کو میاں یاد آگئے ـــــ " مرنے سے پہلے کہنے لگے ۔ تین پیڑ لگائے
ہیں ۔ کسی کے سائے میں تو بیٹھو گی ۔" لیکن اماں کے لئے زندگی بھر
تپتی ہوئی دھوپ ہی رہی ۔ ـــــ
اماں کے تین بیٹے تھے ۔ لیکن ایک سے ایک بدتر ـــــ بیٹیاں ہی کونسی بہتر
تھیں ـــــ دو تو غریب تھیں ـــــ ایک تو ایسی غریب کہ اسی غربت کے چکر میں چار
بیٹیاں برس بھر کی ہونے سے پہلے اُوپر تلے مر گئیں ـــــ چوبیس گھنٹے کے لئے پاؤ
بھر دودھ لیتے ـــــ اور پانی ملا ملا کر دیتے رہتے ـــــ اب پانچویں دنیا میں آئی تھی ۔
اس کے بچنے کے آثار بھی ذرا کم ہی تھے ـــــ ایک بقول اماں کے کھاتی پیتی تھی ۔ اپنا
گھر تھا ۔ گھر میں بھینس تھی ۔ لیکن وہ سب سے زیادہ طعنے دیتی ـــــ
اماں اپنی پنشن میں سے بیٹیوں کو بھی لیتی دیتی ۔ اور پوتا پوتی کی اکنی دوانی کی فرمائش

بھی پوری کرتی۔

ایک روز اماں آئی۔ اور دیر تک امی کے پاس بیٹھی رویا کرتی ——

"بیگم صاحب کل محمد امین —— (محمد امین اماں کا بڑا بیٹا تھا) کی سالی اور اس کے بچے آئے۔ آٹھ بوتلیں کوکا کولا کی کھلیں —— (کوئی بھی ڈرنک ہو۔ کوکا کولا —— آرسی، سیون اپ، مرنڈا —— اماں کو کا کولا ہی کہتی) —— ماں جائی بہن سسرال سے آئی ہوئی تھی۔ ایک اس کے لئے بھی لے آنا —— !!"

ابا کسی کام سے ادھر آئے۔ اماں نے فوراً دوپٹے کی آڑ کر لی۔ وہ سب کے سامنے آتی تھی۔ لیکن ابا سے ہمیشہ سے اس کا پردہ تھا —— کبھی کبھار۔ وہ ان سے قانونی مشورہ لینے بھی پہنچ جاتی۔ ایسے میں وہ گھونگھٹ کاڑھ کے دیوار کی طرف آڑی ہو کر بات کرتی۔ جوابا کچھ سمجھتے۔ اور کچھ نہ سمجھتے۔

جب سے اماں کی پنشن ہوئی تھی۔ کسی کی مجال نہیں تھی۔ کہ اماں سے کوئی کام کہتا۔ امی کھا ہی جاتیں —— لیکن وہ کوئی نہ کوئی کام خود ہی کر دیتی —— بیٹھی بیٹھی لہسن پیاز ہی چھیل دیتی —— اب البتہ ڈیڑھ دو برس سے وہ بالکل رہ گئی تھی ——

"دس ناخنوں کی کمائی اچھی ہوتی ہے بیٹا —— " وہ سر ہلا کر کہتی۔

—— میں نے اماں کو غور سے دیکھا۔ وہ میرا پرانا گلابی سوٹ پہنے تھی۔ جس پر سبز اور گلابی کڑھائی تھی۔ کرتا تو ناپ آگیا تھا۔ البتہ شلوار چھوٹی تھی۔ لیکن بقول اماں کے شمشہ نے خدا اس کا بھلا کرے۔ اس پر نیفہ ڈال دیا تھا۔ گلے میں مومی موتیوں کی مالا —— جو سلیمان کی منیاری کی دکان کی یادگار تھی۔

اماں کسی زمانے میں اچھی رہی ہو گی۔ لیکن اب تو وہ میری کوئین آف سکاٹ لینڈ کی کیریکیچر لگ رہی تھی۔ کیا اماں کو علم ہے —— میں نے سوچا۔ کہ اس شہر لاہور میں ایک جگہ ہلٹن ہوٹل بھی ہے۔ جہاں سیزن شروع ہونے سے پہلے فیشن شو ہوتا ہے۔ اور نئے سے نئے پرنٹس اور جدید ترین تراش خراش کے لباسوں کی نمائش ہوتی ہے۔ اور جس کا ٹکٹ فقط سو روپیہ میں ملتا ہے ——

کیا کبھی زندگی میں ایسا ہوا۔ کہ اماں کے سامنے کاؤنٹر پہ رنگ برنگے کپڑوں کا ڈھیر لگا ہو۔ اور اماں خود سے کہہ سکے۔" یہ پرنٹ خوبصورت ہے"۔۔۔

"یہ رنگ میرا رنگ ہے۔"

کیا کسی نے کبھی اماں سے کہا۔ تمہاری رنگت پہ یہ لباس کس قدر سج رہا ہے۔۔۔!

یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں جو عورتوں کو جوان اور خوبصورت رکھتی ہیں۔ اماں ان سے بھی محروم رہی۔

ملیحہ نے ایک بار کہا تھا۔ ایک یہ اماں ہے۔ جسے دس ناخنوں کی کمائی نہ کھانے کا غم ہے۔ ایک اماں میرے پاس آئی تھی سیالکوٹ۔۔۔ جو میرے ناخن بھی کھا جانا چاہتی تھی۔

مجھے یاد آیا۔ ایک بار میں نے سیالکوٹ ٹیلیفون کیا۔ تو ملیحہ نے کہا تھا: ذرا ٹھہر کر ٹیلیفون کرنا۔۔۔ اس وقت میں کوارٹر کی طرف جا رہی ہوں۔"۔۔۔

"خیر باشد"!۔۔۔

"کیا خیر باشد۔۔۔ میرے پاس وزیر آباد سے ایک ملازمہ آئی ہے۔ اس کو دودھ اور بسکٹ دینے جا رہی ہوں۔ اردلی اس وقت نہیں ہے۔۔۔"

معلوم ہوا۔ کہ وزیر آباد والی اماں نے آتے ہی پہلے تو ان چیزوں کی فہرست گنوائی تھی۔ جو اُسے منع تھیں۔۔۔ ان میں ہر قسم کی دال۔۔۔ بڑا گوشت۔۔۔ اور چاول شامل تھے۔ اور جس چیز کی بہت سختی سے تاکید کی گئی تھی۔ وہ رات کو سوتے وقت ایک گلاس دودھ اور دو رسک بسکٹ۔۔۔

اور مزے کی بات یہ ہے۔ کہ اگلے ہی روز جب زردہ پک رہا تھا۔ تو وزیر آباد والی اماں پہونچی ارشاد کے پاس۔۔۔

اور جب ارشاد نے کہا۔ کہ بیگم صاحب تو کہہ رہی تھیں۔ کہ تمہیں چاول منع ہیں۔۔۔"

تو کہنے لگی: "چکھ لیتی ہوں۔"

اور پلیٹ بھر کر چکھنے کے بعد کہا ۔" ہاں نیم میٹھا ہے ۔"

ایک روز اس نے صبح ہی صبح غل مچایا ۔ کہ ساری رسد دیدو ۔ کھانا آج میں پکاؤں گی ۔ جب ملیحہ دفتر سے آئی ۔ تو کھانا پک ہی نہیں چکا تھا ۔ بلکہ کھایا بھی جا چکا تھا ۔ برتن دھلے دھلائے اپنی جگہ پر تھے ـــــ صرف ایک پرچ میں ایک ٹیبل سپون سالن ملیحہ کے لئے میز پہ رکھا تھا ۔

ہفتہ بھر بعد جب اس اماں نے وزیر آباد سے اپنا باقی سامان لانے کے لئے جانا چاہا ۔ تو ملیحہ نے فوراً اجازت دیدی ۔ بلکہ کہہ دیا ۔ کہ خود مت آنا ۔ ہم گاڑی بھیج کر بلا لیں گے ـــــ اور سکھ کا سانس لیا ۔

"بھلا ہم تنخواہ دار لوگ ایسے نخروں والے ملازم کس طرح رکھ سکتے ہیں ۔ پھر سسرال والوں کی بھیجی ہوئی ملازمہ ـــــ جب کہ میں تو یہاں تک سوچ رہی ہوں کہ موٹر بیچ کر سکوٹر لے لوں ۔ پٹرول پہ ہلکا رہتا ہے ۔ پٹرول بہت مہنگا ہو گیا ہے ۔" ـــــ ملیحہ نے ٹھنڈا سانس بھرا ۔

وہ ہر وقت تنخواہ دار طبقے کی بدحالی اور پروفیشنل طبقے کی خوشحالی کا موازنہ کیا کرتی تھی ۔ فینس کی دوسری طرف کا سبزہ ہمیشہ زیادہ سبز نظر آتا ہے ۔

ـــــ اور سید صاحب نے اپنا پائپ سلگانے کے لئے ماچس کی تیسری تیلی جلائی ۔

"جوش صاحب نہیت معصوم آدمی ہیں ۔ جب میں بمبئی میں تھا ۔ تو ہم لوگوں نے انھیں دعوت دی ۔ وہ تو آگئے ۔ لیکن ہم وقت پہ نہ پہنچ سکے ۔ وہ خفا ہو کر چلے گئے ۔ پھر ہم انھیں ڈھونڈنے نکلے ـــــ بھلا بمبئی شہر ـــــ سب ہوٹل چھان مارے ـــــ بہت مشکل سے ملے ـــــ

افنس از دی بیسٹ ڈیفنس OFFENCE IS THE BEST DEFENCE والا نسخہ ہم نے آزمایا ـــــ ملتے ہی لڑنا شروع کر دیا ۔" جوش صاحب شاعر انقلاب ' تو آپ کہلاتے ہیں ۔ کچھ آپ کو اندازہ ہے ۔ ہماری کتنی ذمہ داریاں ہیں ۔ ہمیں سیل چلانا ہوتا ہے ۔ دن بھر ہم کام کرتے ہیں ۔ تنور پہ کھانا کھاتے ہیں ، شام کو تھکے ہارے لوٹتے ہیں ۔ آپ ہمارا پندرہ منٹ انتظار نہ کر سکے ـــــ !"

جوش صاحب بہت شرمندہ ہوئے۔ اور فوراً ہمارے ساتھ چل پڑے ــــــ

" میں بھی اس زمانے میں بمبئی میں ہی تھا۔" ــــــ سید اختر نے اپنا چپو چلایا۔

" آپ وہاں کیا کرتے تھے ؟ ــــــ " حالانکہ میں سمجھ گئی تھی کہ وہ وہاں کیا کرتے رہے ہونگے۔

" بمبئی میں فلموں کے لئے ڈائیلاگ لکھتا تھا۔ دو چار فلموں میں میں نے ایکٹنگ بھی کی۔"

" اچھا جبھی آپ کی بیٹی ٹیلیویژن کی اتنی اچھی اداکارہ ہے ــــــ جینز (GENES) کی خرابی ہے۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا ــــــ

" ہاں ابھی چند دن ہوئے۔ اسے فلاں ڈرامہ میں کام کرنے پر فلاں وزیر کا تعریفی خط ملا تھا۔" ــــــ

سید اختر نے فادرلی پرائڈ FATHERLY PRIDE کے ساتھ ڈرامے اور وزیر دونوں کا نام لیا۔

" وہ خط تو آپ ریکارڈ کے طور پر مت رکھئے۔ یہ کوئی فخر کی بات نہیں ہے۔" ــــــ اشفاق بھی کافی صاف گو آدمی تھا۔

" جب جوش صاحب کی بیگم کا انتقال ہوا۔ تو میں اور فیض صاحب تعزیت کے لئے گئے۔" ــــــ

سید صاحب نے اپنی بات جاری رکھی۔

" خیر افسوس کیا ــــــ جوش صاحب نے فیض کی طرف دیکھا۔ اور بولے بیوی ہے ؟"

فیض صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔

" بیوی ہی پر گزارا ہے۔ یا کوئی اور بھی ــــــ ؟ ــــــ جوش صاحب گویا ہوئے ــــــ

اب فیض صاحب پانی پانی ــــــ جوش صاحب کے پوتے پوتیاں بھی سب موجود ــــــ اب فیض صاحب کیا بولیں۔

جوش صاحب فطرتاً معصوم آدمی ہیں۔" ــــــ سید صاحب نے لفظ معصوم پر زور دیا۔

ملیحہ صوفے پر سے اٹھ کر قالین پر ہیٹر کے قریب بیٹھ گئی۔ اور اپنی ساری سے اپنے پیر ڈھک لئے ــــــ

ــــــ اور اماں بہت بے سری تھی۔ اکثر وہ صحن میں بیٹھی ایک بہو کے بارے میں گیت

گنگنایا کرتی۔ گیت میں باری باری سب سسرال والوں کا ذکر کرکے پوچھا جاتا ہے۔ فلاں آیا کیا پکایا

——— اور بہو کا ایک ہی جواب ہے۔

"پکائی آنگ پالک مرغی میری کھو گئی رے! ———"

کبھی کبھی اماں ایک اور گیت الاپتی۔

"لٹھے کا پاجامہ۔ ریشمی کمربند۔ سیاں کہاں گئے تھے ؟"

۷۷ء میں ہنگامے ہوئے۔ پیپلز پارٹی کی حکومت تہہ و بالا ہوئی کرفیو اور مارشل لا لگا۔ تو ہمارا خیال تھا۔ کہ اماں بھوکی مرجائے گی۔ لیکن اماں باوجود کرفیو کے پہونچی ——— ہاں کوئی گھنٹہ بھر لیٹ تھی۔

"اے بیگم صاحب ایک فوجی نے روک لیا تھا۔ میں نے کہا۔ بیٹا میں تو جاؤں گی۔ کھانا کھانے جاتی ہوں! اس نے کہا ——— اچھا اماں پچھواڑے سے کھیتوں کھیتوں چلی جاؤ۔ کوئی بھلا بچہ تھا۔ لیکن بیگم صاحب کوئی جوڑا دیدیجئے میری شلوار خراب ہو گئی۔ نہا کر جلدی کروں گی ———"

——— فوج تو فوج ہی ہے۔ اماں کو تو پولیس کے کانسٹیبل سے بھی ڈر لگتا تھا۔

وقت گزرتا گیا۔

اچانک اماں نے اعلان کیا۔ کہ وہ ہندوستان جارہی ہے۔ "بیگم صاحب مہینہ بھر کی دوا منگوا دیجئے" ——— اماں مستقل ایلڈ و مٹ پر تھی۔

امی نے بہت سمجھایا۔ میں نے بھی اپنی سی کوشش کی۔ کہ اماں نہ جائے۔

"یہ تمہاری عمر سفر کی ہے۔ ؟" ——— امی نے کہا ———

لیکن اماں نہ مانی۔

"اے بیگم صاحب بہو نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ کہتی ہے بھائیوں سے جاکر اپنا حصہ لو۔ اور اس رقم سے لڑکی کے لئے چاندی کی چیزیں لے کر آؤ۔ جوان ہو رہی ہے۔ کل کو اس کا بیاہ ہوگا۔ تو کیا دوں گی اپنا سر؟ چلو بیگم صاحب اس بہانے بھائیوں سے بھی مل آؤں گی"

—— سب سمجھ گئے کہ اماں اپنے دل کو تسلی دے رہی ہے۔

جاتے وقت اماں بہت اہتمام سے امی سے پتہ لکھوا کر لے گئی۔

" بیگم صاحب کہا سنا معاف کرنا —— تمہارا نمک کھایا ہے "——

ملیحہ کا خیال تھا۔ کہ اب اماں کی لاش ہی آئے گی۔ اتنا ہائی بلڈ پریشر اور اتنا لمبا سفر۔

اور وہی ہوا۔ ایک روز اماں کا پوتا آیا۔" بیگم صاحب دادی کے لئے دوائی چاہیئے۔"

معلوم ہوا۔ اماں پر فالج گر پڑا۔ وہیں ہندوستان میں —— جن کے ساتھ گئی تھی۔

انہوں نے ڈنڈا ڈولی کر کے واپس پہونچایا —— حصہ مانگا تو بھائیوں سے الگ بگڑ گئی ——

امی نے اسی روز دوا اور کچھ پیسے دے کر مجھے اماں کے گھر بھیجا ——

" گھر خاں صاحب کو معلوم ہے۔ وہ بتا دیں گے۔ اور پیسے تم اماں کے ہاتھ میں دینا۔

اس کی بہو کو مت دینا۔ اماں کو پان چھالیہ کی تکلیف ہو گی۔ اور میری طرف سے اماں کو بہت بہت

پوچھنا ——"

—— امی نے کوئی دسویں بار مجھے ہدایات دیں۔

کچی گلیوں میں سے گزر کر میں اماں کے بیٹے کے گھر پہونچی —— صحن میں چھوٹی اینٹ

کا فرش تھا۔ ایک طرف ہینڈ پمپ لگا تھا۔ اور ایک کمرہ تھا۔ وہی کچن تھا —— اور وہی ٹی۔وی

لاؤنج —— اور وہی بیڈ روم ——

اماں ایک طرف پڑی تھی۔ پوتی سامنے کھڑی تیل کے چولہے پہ روٹیاں پکا رہی تھی ——

اور ٹیلیویژن بھی دیکھ رہی تھی —— اماں کا بستر انتہائی غلیظ تھا۔ اور چارپائی کیا تھی جھلنگا

تھی —— اس کی ادوائن بیچ میں سے کاٹ کر جگہ بنائی گئی تھی۔ چارپائی کے نیچے ایک مٹی کا

کونڈا پڑا تھا۔

—— جب اماں کو ضرورت ہوتی۔ اسے نیچے کو کھسکا دیتے —— کمرے میں ایسا تعفن

تھا۔ کہ مجھے ابکائی آنے لگی —— اماں اُلٹے سیدھے سانس لے رہی تھی۔

بہو غائب تھی۔ کچھ دیر بعد وہ آن پہنچی ۔ میں نے پہلی دفعہ اسے دیکھا تھا۔ اب مجھے پتہ چلا۔ کہ اماں کی پوتی اس کی پوتی کیوں نہیں معلوم ہوتی۔ خیر سے اس کی ماں الٹا توا تھی ۔
اس نے مجھے اماں کی بیماری کی تفصیلات بتائیں — اور کہا — "اٹھ کر غسل خانے تک نہیں جاسکتیں — اسی لئے تو میں روٹی بھی کم دیتی ہوں۔"

—" تاکہ اماں بھوکی مرجائے" — میرا موڈ لڑائی کا تھا۔

" نہیں دودھ وغیرہ دے دیتی ہوں" — اس نے فوراً لیپا پوتی کی۔

وہاں سے نکلتے ہی میں نے کھلی ہوا میں لمبے لمبے سانس لئے اور گھر پہنچ کر امی سے کہہ دیا۔ کہ اب میں کبھی وہاں نہیں جاؤں گی۔ اور پیسے بھی اب آپ کبھی نہ بھیجیں — وہ نوٹ اماں کی مٹھی میں سے گرگر جا رہا تھا — بالآخر بہو نے میرے سامنے ہی اس کے ہاتھ سے اچک لیا۔

— اماں نے زندگی میں جتنے پان کھانے تھے کھا لئے — اب تو وہ کوئی دم کی مہمان ہے۔ بس آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں۔" —

" خدا اس کی مشکل آسان کرے۔ بے اولاد ہوتی۔ تو لوگ اس پر ترس کھاتے۔ اب تو ہر شخص منہ بھر کے کہہ دیتا ہے۔ کہ تین بیٹوں کی ماں ہے —" امی نے آہ بھری۔

— اور ہر سمت روشنیاں تھیں — اور موسیقی کے رنگ تھے۔ سب لوگ ہنستے مسکراتے جام اٹھائے کھانے کے کمرے کی طرف چلے — اور آج کی شام میں نے بہت سے رنگ دیکھے۔

بہت آہستہ۔ بہت ہلکا — خنک رنگ شراب —

میرے شیشہ میں ڈھلا آہستہ۔

عوامی شاعر اپنے بچپن کے قصے سنا رہا تھا۔

—"میں اپنی نانی کے پاس رہتا تھا۔ وہ اکثر ایک مصرع گایا کرتیں۔

— اس نے گا کر سنایا —

ہم نے دل صنم کو دیا پھر کسی کو کیا ____

"ساتھ ہی کہتیں ۔" دتا دتا ۔ آپے دتا ____ کسی نوں کی ____

____ بہت دن بعد جب میں نے نظیر اکبر آبادی کا دیوان پڑھا ۔ تو معلوم ہوا ،

یہ اس کا مصرع تھا ۔ اور اگلا مصرع تھا ۔

ع اسلام چھوڑ کفر دیا پھر کسی کو کیا

____ میری نانی اندھی تھیں ۔ اور جرابیں اور کمر بند بُنا کرتی تھیں ____ ہم وہ بیچنے کے لئے گاؤں بھر میں گھومتے تھے ۔ کبھی دونی چونی مل جاتی تھی ۔ اور کبھی ہم صرف ایک وقت کے کھانے کے عوض چیزیں بیچ دیتے تھے ۔"

"____ بھئی جس قدر آپ اپنے بارے میں بتا رہے ہیں ، ہمارے دل میں آپ کی عزت بڑھتی جا رہی ہے ۔" ____ اور سید صاحب نے نزاکت سے اپنے لب نیپکن سے چھوئے ۔

"یہ بالکل غلط کہہ رہے ہیں ۔" ____ احمد نصیر نے چپکے سے مجھ سے کہا ۔ "یہ سب کارڈ شارپ ہیں ۔ سوائے اشفاق کے ____"

____ وہ پھکڑ پن کی حد تک صاف گو تھا ۔ میں اس سے زیادہ بات کرتے ہوئے ڈرتی تھی ۔ کیونکہ بقول کسے اس کی زبان کے آگے خندق تھی ۔

" لفٹ ونگرز سے زیادہ کلاس کانشس میں نے کسی کو نہیں دیکھا ، سید صاحب ایک بار مجھے چھوڑنے گئے ۔ تو گھر پہونچ کر پہلا جملہ ان کے منہ سے یہی نکلا ۔

" اوہ یہاں تو پانچ چھ گاڑیاں ہیں ۔"

____ حسب نسب اور دولت و ثروت سے ان لوگوں کی نگاہیں بہت جلد خیرہ ہو جاتی ہیں ۔" عطیہ نے مزید تشریح کی " لفٹ ونگرز عام لوگوں سے الگ مخلوق تو نہیں جو سب کی کمزوریاں ہیں ۔ وہ ان کی بھی ہیں ۔ دراصل زندگی میں جزیرے نہیں ہوتے " حامد سید نے صفائی پیش کی ۔

" لیکن پھر ڈی ۔ کلاس ہونے کا دعویٰ کیوں " ____ عطیہ نے حجت کی ۔ اور میز سے اٹھ

کھڑی ہوئی۔

—— سب لوگ چیری برانڈی کے بیلون گلاس ہاتھ میں لیتے پھر نشست کے کمرے میں آن بیٹھے تھے۔

میں بھی عطیہ کے قریب قالین پر بیٹھ گئی، بہت ملائم آرام دہ قالین تھا۔

شہر لاہور تری رونقیں دائم آباد۔

مجھے ناصر کاظمی سے اپنی آخری ملاقات یاد آگئی۔

پاک ٹی ہاؤس کے باہر ملاقات ہوئی تھی۔ وہ آرہے تھے۔ اور میں جا رہی تھی ——

"کیا وقت ہوا ہے؟" —— کمبخت میری گھڑی پھر کھو گئی تھی۔

—— "میں تو بے وقت جیتا ہوں۔" —— وہ ہنسے۔

—— ہاں زندگی میں جزیرے نہیں ہوتے —— میں نے آویزے دے نٹی باکس میں رکھتے ہوئے سوچا۔ اوپر ہی پرونش کی MINIATURE شیشی پڑی تھی۔ یوڈی کلون کی یہ بالکل ننھی منی سی شیشی اماں نے مجھے دی تھی۔ قیمت نقد پانچ روپیہ ——

"بی بی یہ میرا تحفہ ہے" ——

تب سے یہ شیشی ویسے ہی رکھی رہی۔ میرا دل ہی نہ مانا کہ اسے کبھی استعمال کروں۔

اماں کی نشانی ——

سستی جذباتیت ——

اور ابھی کچھ دیر پہلے اماں سعیدہ بیگم عرف سعیدن تھی —— مجھے معلوم تھا۔ کیونکہ اس کے شناختی کارڈ کے فارم اور بعد میں پاسپورٹ کے فارم میں نے ہی بھرے تھے۔ اور کل وہ سعیدہ بیگم عرف سعیدن کی جگہ فقط ایک مٹی کا ڈھیر ہو گی۔

اس قسم کی موت کا ذکر کسی ڈیتھ اینڈ گلوری اکیڈمی میں نہیں ہوتا۔ اور یوں ہے کہ مجھے دُرد تہہ جام بہت ہے۔

—— اور گہرا سرمئی رنگ —— شب تار کا رنگ ۔

—— اور حضرت شیخ علی نے شاہ وقت سے کہا تھا ۔

" میں نے اپنے ہاتھ سمیٹ لئے ہیں ۔ اس لئے مجھے روا ہے ۔ کہ اپنے پاؤں نہ سمیٹوں۔"

شاید انہوں نے درست کہا ہو ۔

اماں نے بھی اپنے ہاتھ کب کے سمیٹ رکھے تھے ۔ لیکن اپنے پاؤں وہ پھر بھی نہ پھیلا سکی ۔ اس کے پاؤں تو سمٹے ہی رہے ۔